اردو مرثیہ اور مرثیہ نگار

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

اظہار سنز

19 اردو بازار، لاہور

اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار

(تحقیق و تنقید)

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

حقوق اشاعت محفوظ

۲۰۰۴ء

اُردو مرثیہ اور مرثیہ نگار

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن

ناشر: سیّد محمد علی معظم رضوی

طابع: سید اظہار الحسن رضوی

مطبع: اظہار سنز پرنٹرز، ریٹی گن روڈ، لاہور

کمپوزنگ: تصور کمپوزنگ سنٹر، ۱۰۸۔لٹن روڈ لاہور

قیمت ۳۰۰ روپے

یکے از مطبوعات

اظہار سنز ۱۹۔اُردو بازار لاہور۔فون: ۷۲۳۰۱۵۰

انتساب

اپنے دو مرحوم اساتذہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی

اور

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی

کے نام

⌘

مصنف کی دیگر کتب

- مفاہیم (تحقیقی وتنقیدی مقالات)
- ترجیحات (انعام یافتہ) (تحقیقی وتنقیدی مقالات)
- آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی (تحقیق وتنقید)
- جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی (شخصیت وفن)
- شام وسحر کی باتیں (ماہنامہ ''شام وسحر'' لاہور کے اداریے)
- آغا صاحب (ڈاکٹر آغا سہیل کی شخصیت وفن)
- کلیاتِ حبیب (حبیب جونپوری کے کلام کی تدوین)
- العطش (جلد اول، دوم، سوم) (سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کی تدوین)
- باقیاتِ آلِ رضا (سید آلِ رضا کے غیر مطبوعہ کلام کی تدوین)
- منتخب مرثیے (قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین)
- معتبر مرثیے (قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین)

(زیرِ طبع)

- لکھنؤ کی اُردو شاعری (بیسویں صدی میں)
- تصریحات (مقالات)

مندرجات

اصنافِ نظم ونثر کو متاثر کرنا — مرثیہ، سلام اور نوحہ واقعۂ کربلا کی دین — مرثیہ کا خمیر برصغیر میں تیار ہونا — ان اصناف میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پیش کش — سید وحیدالحسن ہاشمی کا ان اصناف کو نصف صدی سے فروغ دینا اور ان کی آبیاری کرنا — وحیدالحسن ہاشمی کے سوانحی حالات — علمی وادبی خانوادے سے تعلق — اسلاف میں شعرا کی کثرت — شاعری کا آغاز اور آرزو لکھنوی سے اصلاح — متنوع اصناف میں طبع آزمائی — عزائی ادب کے فروغ کے لیے نصف صدی کو محیط جدوجہد — جدید اور مختصر مرثیے کی تحریک کے موجد — عصر حاضر میں رثائی ادب کے میر کارواں — وحیدالحسن ہاشمی کی صنف مرثیہ سے دلچسپی — مرثیوں کی اشاعت پر خصوصی توجہ — اڑتیس مرثیوں کے اجمالی کوائف — اڑتیس مرثیوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ — وحیدالحسن ہاشمی کی مرثیہ نگاری کا جائزہ — بیسویں صدی میں برصغیر شکست وریخت کا شکار — انگریزی حاکمیت کے اثرات ونتائج — ترقی پسند تحریک کے اثرات اور اردو مرثیہ — مرثیہ ایک انقلابی جدوجہد کا نعرہ — مرثیے کے مقصدی اور افادی پہلوؤں کی طرف توجہ — سید وحیدالحسن ہاشمی کی صنف مرثیہ سے والہانہ دلچسپی — جدید مرثیے کے پیشرو — جوش اور آل رضا کے مرثیوں کے اثرات — وحیدالحسن ہاشمی کے مرثیوں میں اعلیٰ اخلاقی اقدار، فلسفیانہ افکار، اجتماعی مفادات، سائنسی افکار، قابل تقلید افراد کی تصویر کشی اور حق وصداقت کی علمبرداری کا رجحان — مرثیت کی جانب خصوصی توجہ — دلچسپ، سادہ اور پرلطف اسلوب بیان — زبان وبیان پر مکمل گرفت — فنکارانہ صناعی — فکر واسلوب کا امتزاج — عصر حاضر میں سید وحیدالحسن ہاشمی اردو مرثیے کے معتبر ترین شاعر —

سیف زلفی — مرثیے کی ایک توانا آواز ۲۴۵

مہذب معاشرے میں ادیب، ادب اور قاری کی مثلث کی قدر افزائی — عصر حاضر میں اس مثلث کے تینوں کناروں کی شکست وریخت — معاشرتی ابتری کے آثار — تخلیق کاروں کی عزت افزائی کی ضرورت — مرحوم ادیبوں اور شاعروں کے فکری چراغ سے نئے چراغ جلانے کی ضرورت — سیف زلفی ایک معتبر تخلیق کار — سیف زلفی کے سوانحی حالات اور ان کی گراں قدر علمی وادبی خدمات کا جائزہ — سیف زلفی کی نمائندہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ تخلیقات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ — سیف زلفی کی صنف مرثیہ سے دلچسپی کے محرکات واسباب — ناقدین ومحققین کی سیف زلفی کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے عدم دلچسپی کا تجزیہ — چند ناقدین کی توجہ — سیف زلفی کے مرثیوں کی تعداد کے بارے میں تسامحات اور ان کا تحقیقی وتنقیدی محاکمہ — سیف زلفی کے تمام مرثیوں کا علیحدہ علیحدہ فکری وفنی تجزیہ — اردو مرثیے کی تاریخ میں سیف زلفی کے مقام ومرتبے کا تعین — سیف زلفی کے مرثیوں کی فوری اشاعت ایک اہم اور توجہ طلب مسئلہ — سیف زلفی اردو مرثیے کی ایک توانا آواز —

چند باتیں

اگر آپ کے ذہن میں اس کتاب کے بارے میں یہ تصور موجود ہے کہ اس میں اُردو مرثیے کے محاسن' تاریخ' ارتقائی سفر کی روداد اور تمام معروف و غیر معروف مرثیہ نگاروں کے کوائف یکجا کیے گئے ہوں گے تو میں آغاز ہی میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ اس کتاب میں صنف مرثیہ اور مرثیہ نگاروں کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ اُردو مرثیے کی تاریخ اور مرثیہ نگاروں کے سطحی کوائف جمع کرنے کا عمل کافی ہو چکا ہے۔ اب ہمیں صنف مرثیہ اور مرثیہ گو شعراء کو ایک مختلف سطح پر جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے اور یہی اس کتاب کی اشاعت کا جواز ہے۔

میں ایک ایسے علمی قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جہاں مرثیہ سننا محض ثواب اخروی ہی نہیں بلکہ اس کے حسن و قبح پر روشنی ڈالنا بھی مرثیے کے فروغ کا ایک ذریعہ قرار دیا جاتا ہے۔ میں نے نجم آفندی' جوش ملیح آبادی' نسیم امروہوی' آلِ رضا' شاہد نقوی' قیصر بارہوی' سیف زلفی اور وحید الحسن ہاشمی جیسے منفرد مرثیہ نگاروں کے مرثیے سنے ہیں اور مرثیے کی فکری و فنی حیثیت کے حوالے سے پروفیسر کرار حسین' ڈاکٹر سجاد باقر رضوی' ڈاکٹر عبادت بریلوی' سید سجاد رضوی' ڈاکٹر وحید قریشی' ڈاکٹر آغا سہیل' ڈاکٹر سہیل احمد خان اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا جیسے بلند پایہ ناقدین و مفکرین کی گفتگو سنی ہے۔ اس کتاب میں آپ کو ان باکمال شعراء اور ہنرمند اساتذہ کے ارشادات کی مہک محسوس ہوگی۔

اس کتاب کی اشاعت ایک خواب تھی مگر اس کی تعبیر اظہار سنز کے مہتمم انجم رضوی کے

مسلسل اصرار کے ذریعہ ممکن ہوئی۔ عبدالکریم خالد، نواز زیدی اور عباس رضا نے ہمیشہ کی طرح میری دستگیری فرمائی۔ اس مرتبہ فرقان قریشی نے پروف پڑھنے میں میری بہت مدد کی۔ اس کتاب کی کمپوزنگ میں تصور حسین کی مہارت آپ کے سامنے ہے۔ چلتے چلتے ایک بات اور۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین ناممکن تھی اگر مجھے گھریلو یکسوئی اور اہل و عیال کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ میری والدۂ محترمہ، والد گرامی، زوجۂ محترمہ، یاسر، ایما، اشا، وجیہ، کائنات اور منتو نے اپنے اپنے طور پر میری مشکلات کو سہل کیا۔ میں صدقِ دل سے تمام بزرگوں اور بچوں کا ممنون ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ میرے کمزور کاندھوں پر دوستوں اور قارئین کی محبت کا بار بڑھتا جا رہا ہے۔ دیکھیے یہ محبت کا قرض کب ادا ہو اور میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کروں۔ اب آپ کتاب پڑھیے اور میری ''چند باتیں'' ختم ہوئیں۔

(ڈاکٹر) سید شبیہ الحسن

۲۵۳۔ ایف، رحمان پورہ، لاہور

۸؍ جنوری ۲۰۰۴ء

مرثیے اور ڈرامے کی مماثلتیں

اردو شعر و ادب کے بعض اصناف کی ترقی و ترویج لکھنوی فضا سے مشروط رہی ہے۔ یہ اصناف شاید لکھنؤ سے باہر بھی مقبول و معروف رہے ہوں، مگر ان اصناف میں جو ندرت اور نکھار پیدا ہوا وہ اسی لکھنوی ادبی و تہذیبی فضا کی دین ہے۔(۱) ان معروف اصناف میں مرثیہ، ریختی، ڈراما اور نظم نگاری بطور خاص شامل ہیں۔ مرثیہ اور ریختی نے لکھنؤ میں جو عروج حاصل کیا، اُسے وہاں کی تہذیبی ضرورت بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔(۲) اس لحاظ سے ہم اودھ کی تہذیب میں پختگی حاصل کرنے والی صنف ''مرثیہ'' کو اسی لکھنوی فضا کی تہذیبی علامت اور اخلاقی ضرورت قرار دے سکتے ہیں۔(۳)

---

(۱) محمد اسلم قریشی، ڈاکٹر، ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء، ص: ۳۵۵۔

(۲) سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، طنز و مزاح کے نظریاتی مباحث اور کلاسیکی اردو شاعری، کراچی، مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی (غیر مطبوعہ)، ص: ۳۷۲۔

(۳) احراز نقوی، ڈاکٹر، جدید مرثیہ نگاری، مرتب وحید الحسن ہاشمی، لاہور، مکتبۂ تعمیر ادب، ۱۹۶۳ء، ص ۲۰۳۔

"مرثیہ" خالصتاً ایک ہندوستانی صنفِ سخن ہے۔(۴) جنوبی ہند کے مرثیے جذباتی سرمائے سے مالا مال ہیں اور اس صورت میں ان میں فن کی تلاش عبث ہے۔(۵) مرثیے کی ترقی یافتہ شکل شمالی ہندوستان میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہاں کے مرثیوں میں جذبے کے ساتھ ساتھ فن کی بعض نادر صورتیں بھی منعکس دکھائی دیتی ہیں اور میر و سودا کے مراثی اس پر دال ہیں۔ اودھ اور اس سے ملحقہ علاقوں، خصوصاً لکھنؤ وغیرہ میں معاشی استحکام کی وجہ سے طربیاتی عناصر کی خوب پذیرائی ہو رہی تھی اور سوز کو اصنافِ سخن میں ساز بنایا جا رہا تھا۔(۶) ایسی صورت میں المیاتی عناصر کی نمائندگی کرنے والی خاص صنف "مرثیہ" کا عروج پانا اپنے اندر کچھ معنی ضرور رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی نے عمرانی نقطہ نظر سے مرثیے کی سمت خاص توجہ دی ہے۔ وہ اپنے مقالے میں رقم طراز ہیں:(۷)

"لکھنوی دبستان کے متعلق تو ایک عام تنقیدی رجحان یہ ہے کہ چونکہ لکھنوی تہذیب میں نسائیت، حسن پرستی، عورت پرستی، لہو و لعب، بداخلاقی وغیرہ عام تھیں، اس لیے وہاں کی شاعری میں بالعموم اور ریختی میں بالخصوص یہی عناصر در آئے اور اگر یہ پوچھا جائے کہ جس عہد میں ریختی پیدا ہوئی، اس عہد میں مرثیہ کیوں کر فنی کمال کے درجے پر پہنچ گیا، تو جواب ہوگا کہ وہاں شیعہ حکومت تھی۔ مگر اس بات کا جواب نہیں ملتا کہ ایسا معاشرہ، جو بدترین اخلاقی گراوٹوں کا شکار ہو، ایسی صنفِ سخن کو کیسے عروجِ کمال تک پہنچا سکتا ہے، جو اعلیٰ ترین اخلاقی رویوں کا اظہار کرتی ہو؟"

یہ ایک اہم ترین نکتہ ہے اور ناقدین کو اس سلسلے میں ضرور غور کرنا چاہیے......

---

(۴) احسن فاروقی، ڈاکٹر، مرثیہ نگاری اور میر انیس، لاہور، اردو اکیڈمی، ۱۹۵۱ء، ص:۱۳۔

(۵) وقار عظیم، "اردو میں مرثیے کا ارتقاء" (مضمون)، رسالہ نگار پاکستان، ۱۹۶۷ء، ص:۳۶۔

(۶) فراق گورکھپوری، اردو کی عشقیہ شاعری، الہ آباد، سنگم پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۴۵ء۔

(۷) سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، طنز و مزاح کے نظریاتی مباحث اور کلاسیکی اردو شاعری، کراچی، مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی (غیر مطبوعہ)، ص:۳۰۔۳۱۔

بہرحال مرثیے کو عروج لکھنؤ میں ملا۔ میر اور سودا کے مراثی ان کی شاعری کے جزوی حصے ہیں، جب کہ ضمیر اور خلیق کی تقریباً تمام شاعری مرثیے کے گرد گھومتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان دونوں حضرات نے صنفِ مرثیہ کے خارجی اور داخلی محاسن کو پختگی کے ساتھ متعین کر کے ''بگڑا شاعر مرثیہ گو'' کا طوق اس کے گلے سے اتار پھینکا اور انیس و دبیر نے اس صنف کو باعتبار صنفِ سخن بنا دیا۔ (۸) یہی وجہ ہے کہ آج کا مرثیہ نگار اپنی مرثیہ نگاری پر فخر کرتا ہے۔ جنوبی ہند سے شروع ہونے والی مذہبی جذبات سے مملو اس صنف سخن کی فنی اور فکری توسیع لکھنؤ میں ہوئی اور بلاشبہ لکھنؤ اور مرثیہ آج ہمارے ذہنوں میں لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔ بقول رام بابو سکسینہ: (۹)

> ''.....قدیم طرزِ لکھنؤ کی مصنوعی اور مخربِ اخلاق فضائے شاعری میں مرثیے کی نمود اور اس کی سلاست و فصاحت اور ادب آموزی نے وہی کام کیا، جو ریگستان میں ایک خوشنما سبزہ زار کرتا ہے۔ مرثیے میں اس حقیقی شاعری کا پرتو ہے، جو اعلیٰ جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ اس کی ادب آموزی ایسے وقت میں، جب دنیائے شاعری عیش پسند درباریوں کی خوشامد اور تتبع میں نہایت ادنیٰ اور رکیک جذبات کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی، قابلِ صد ہزار آفریں ہے۔ ہر چند کوئی مرثیہ بلحاظ فن گرا ہوا ہو، مگر پھر بھی وہ ایک اخلاقی نظم ضرور ہے اور اس معنی میں اس کے مفید ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اس کا مضمون ضرور عالی اور مقدس ہو گا، لہٰذا شاعر گو غزل میں کیسا ہی پست اور لاابالی خیال ظاہر کرے، مگر مرثیہ میں مناسبت کے خیال سے وہ ضرور سنجیدہ اور اخلاق آموز شعر کہنے پر مجبور ہو گا''۔

اردو کے اصناف شاعری میں ''مرثیہ'' معیار و مقدار ہر لحاظ سے دوسری اصناف کے ہم پلہ ہے، مگر تحسین ناشناس اور سکوت سخن شناس کی وجہ سے اس صنفِ سخن کی حقیقی قدر و منزلت کا

(۹،۸) رام بابو سکسینہ ''تاریخ ادب اردو (مرتب تبسم کاشمیری)'' لاہور، علمی کتاب خانہ (س۔ن)، ص: ۱۹۹، ۲۰۷۔

تعین نہیں کیا جاسکا ہے۔ مرثیہ دراصل ایک مرکب صنف سخن ہے اور اسی سبب سے اس میں دوسرے اصناف کی خوبیاں جلوہ گر ہیں۔ (۱۰) ناقدین ادب نے بعض وجوہات کی بنا پر مرثیہ کا موازنہ ومقابلہ مغربی ومشرقی اصناف سخن سے کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس طرزِ عمل کا منفی پہلو مرثیے کی ذاتی حیثیت کو ختم کرنے کا موجب ہے اور مثبت پہلو مرثیے کی وسعت اور ہمہ گیری کو تسلیم کرنا ہے۔

ناقدینِ ادب نے مرثیہ کا موازنہ جن مشرقی ومغربی اصناف سے کیا ہے' ان میں قصیدہ' مثنوی' ایپک' ایلیجی اور ڈراما سرفہرست ہیں۔ (۱۱) ذیل میں اس وقت صرف ''ڈراما اور مرثیہ'' سے متعلق چند گزارشات' ناقدین کے پیش کردہ نکات کی روشنی میں' پیش کی جائیں گی۔ ان گزارشات کا بھی عمومی طور پر مرثیے کے مطالعے ہی سے تعلق ہے۔

اردو کے بعض ناقدین نے ڈرامے اور مرثیے میں بعض جزوی مماثلتیں تلاش کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''مرثیہ'' دراصل ''المیاتی ڈراما'' ہے۔ اس طرزِ فکر میں لاکھ برائیاں سہی' مگر ایک خوبی بہر حال موجود ہے کہ ان ناقدین نے مرثیہ کا ایک خاص اندازِ فکر سے مطالعہ کیا ہے اور مرثیے کو ایک نئی جہت دینے کی سعی ہے۔ مرثیے اور ڈرامے کے تاریخی اور سماجی ارتقائی ربط کی طرف معروف ناقد عشرت رحمانی اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: (۱۲)

> ''اسلام میں مذہبی طور پر تمثیل اور نقالی ممنوع قرار دی گئی ہے۔ اس لیے رام لیلا اور کرشن لیلا کی طرح اسلامی نظموں وغیرہ کی پیشکش کے سلسلے میں اداکاری کو کبھی گوارا نہیں کیا گیا۔ البتہ ہندوستان کے علاوہ بعض اسلامی ممالک ایران وغیرہ میں کربلا کے واقعات اسٹیج پر ڈرامائی انداز میں پیش کرنا معیوب نہیں سمجھا گیا۔ ہندوستان میں کربلا کے واقعات وحادثات کا ڈرامائی

---

(۱۰) خواجہ محمد زکریا' ڈاکٹر' قدیم نظمیں' لاہور' بک ورلڈ' ۱۹۶۴ء' ص: ۱۸۳۔

(۱۱) احراز نقوی' ڈاکٹر (مرتب)' انیس ایک مطالعہ' لاہور' مکتبہ میری لائبریری' ۱۹۸۲ء' ص: ۴۴۔

(۱۲) عشرت رحمانی' اردو ڈراما کا ارتقا' لاہور' شیخ غلام علی' ۱۹۸۶ء' ص ۶۵۔

ذکر تو ضرور کیا گیا' لیکن وہ صرف محرم کی مجالس عزا میں مرثیہ خوانی' سوز خوانی اور نوحہ خوانی تک محدود رہا' جس میں واقعات کربلا کو ڈرامائی انداز میں محض نظم خوانی کی طرح پیش کیا جاتا۔ مرثیے میں عام طور پر ممدوح کے مناقب' حریفوں کے معائب' قدرتی و جنگی مناظر' رجز خوانی' گھوڑے' تلوار اور حرب و ضرب کے سامان وغیرہ کی صفت اور رزم و بزم کی فصیح و بلیغ نقشہ کشی شامل ہیں''۔

مندرجہ بالا معروضات پیش کرنے کے باوجود مرثیے اور ڈرامے کا باہمی جزوی مطالعہ بھی ہمارے سامنے چند خاص نکات پیش کر دیتا ہے۔ ذیل میں ان مماثلتوں کا مختصر سا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

یونان کے معروف فلسفی ارسطو نے ڈرامے کے لیے چند چیزیں ضروری قرار دی ہیں ان میں ''اسٹیج'' بھی شامل ہے۔ اسٹیج کے بغیر ڈرامے کی حیثیت بے بوگل کی سی ہے۔ اسی سے مشابہہ صورت حال مرثیے کے لیے بھی ہے۔ مرثیے کے فنی لوازمات کی صحیح تقسیم کے لیے تین چیزوں یعنی سامعین' اسٹیج اور مرثیہ نگار کا ہونا ضروری ہے۔ یہ مثلث مرثیے کی حیثیت کا تعین کرنے کے لیے ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر ان تینوں چیزوں کو مرثیے سے علیحدہ کر لیں تو مرثیے کی حیثیت نماز بے وضو کی سی ہو جائے گی۔ سامعین' اسٹیج اور اداکار (مرثیہ نگار) کی یہ مثلث مرثیے اور ڈرامے دونوں کے لیے ضروری ہے۔ پروفیسر سجاد رضوی اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

> ''...... ڈراما نگار اور مرثیہ گو اس لحاظ سے متماثل ہیں کہ دونوں کے سامنے بعض ایسی پابندیاں ہوتی ہیں' جن کا تعلق ادب سے نہیں۔ ڈراما نگار بے چارہ مجبور ہے کہ اسٹیج کی ضروریات اور روایات کو سامنے رکھے اور اسی طرح مرثیہ گو پابند ہوتا ہے کہ مرثیہ لکھتے وقت مروجہ ادبی اقدار کے علاوہ بعض دوسری باتیں پیش نظر رکھے۔'' (۱۳)

---

(۱۳) سجاد رضوی ''اردو مرثیہ'' (مضمون) لاہور رسالہ صحیفہ ۱۹۵۸ء۔

انہی چند مشترک باتوں کے پیش نظر ناقدین نے مرثیے کو ڈراما قرار دے دیا ہے ذیل میں مختلف مرثیوں کے چند بند ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ مرثیہ میں مرثیہ نگار اسٹیج اور سامعین سے کیا کام لیتا ہے اور ان میں معنوی ربط کس طرح قائم ہوتا ہے؟

پیٹو سروں کو ہوتا ہے اب مرثیہ تمام
لپٹو ضریح پاک سے کہہ کہہ کے "یا امام"
رخصت طلب ہے باپ سے اکبرؑ سا لالہ فام
خاموش ہیں حسینؑ نہیں کرتے کچھ کلام
مقتول ظلم و جور ہے اب جان فاطمہؑ
ہوتا ہے پنجتن کا کوئی دم میں خاتمہ

(اقتباس مراثی انیس)

اے ماتمیو! شاہ کا ماتم ہوا آخر
روئے نہ دبیرؔ آہ محرم ہوا آخر
لو چہلم سلطان دو عالم ہوا آخر
غم رہ گیا پر غم کا وہ موسم ہوا آخر
سر کھول دو اور پھاڑو گریبانوں کو اپنے
اے مومنو! رخصت کرو مہمانوں کو اپنے

(اقتباس مراثی دبیر)

ہاں اے نفس باد سحر شعلہ فشاں ہو
اے دجلۂ خوں چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لب عیسیٰؑ پہ فغاں ہو
اے ماتمیان شہہ مظلوم کہاں ہو؟

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

(اقتباس مرثیہ غالب)

اے قوم وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ
اسلام ہے پھر تیر حوادث کا نشانہ
کیوں چپ ہے اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ
تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ

مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جَلی ہو
لازم ہے ہر اک شخص حسینؑ ابن علیؑ ہو

(اقتباس مراثی جوش)

مرثیے اور ڈرامے میں ایک مماثلت "کرداروں کی موجودگی" ہے۔ ناقدین کے خیال میں ڈرامے کے کردار ڈرامے کی حیثیت کے داخلی اور خارجی تاثرات کو نکھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بقول عشرت رحمانی:

"...... پلاٹ کی حقیقت کو واضح کرنے اور واقعات کو فطری رنگ دینے کے لیے کردار نگاری میں پختگی لازمی ہے۔ یہ کلیہ کہ ڈراما حرکت و عمل کی سچی تصویروں سے مکمل ہوتا ہے، اسی حال میں صادق آتا ہے کہ کردار اپنے افعال اور حرکات و سکنات میں زندگی کی صحیح عکاسی کر سکیں۔" (۱۴)

مرثیے کے کردار بھی ڈرامے کی طرح مرثیے میں بعض اوقات ندرت پیدا کرتے ہیں۔ یہ ندرت ایسی خوبی بن جاتی ہے، جو مرثیے کو ڈرامے سے بھی ممیز کر دیتی ہے۔ مرثیہ نگار اپنے مرثیے میں جس مہارت اور چابکدستی سے کرداروں کی تشکیل اور پیش کش کرتا ہے، وہ کسی دوسری صنف شاعری میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ مرثیے میں اگرچہ کرداروں کا تعلق

---

(۱۴) عشرت رحمانی "اردو ڈراما کا ارتقا" لاہور شیخ غلام علی، ۱۹۸۰ء، ص: ۳۶۔

براہِ راست تاریخ سے ہوتا ہے۔ تاہم مرثیہ نگار بھی ڈرامہ نگار کی طرح ابتدائی اور ثانوی دونوں طرح کے کرداروں کو پیش کرتا ہے۔ ابتدائی یعنی اہم کرداروں میں حضرت حسینؑ، اکبرؑ، قاسمؑ، عونؑ، محمدؑ، سجادؑ، اصغرؑ، زینبؑ، ربابؑ، سکینہؑ، رقیہؑ، فضہؓ وغیرہ شامل ہیں اور ثانوی کرداروں میں اصحاب حسینی اور محبانِ حسینؑ شامل ہیں۔ مرثیے کے ثانوی کردار بھی ڈرامے کے کرداروں کی طرح اپنے عمل سے بنیادی کرداروں کی شخصیت اور حیثیت کو اُجاگر کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ ذیل میں مرثیے کے چند بندوں کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ کس طرح کرداروں کی پیش کش میں مرثیہ نگار مہارت اور ندرت کا ثبوت دیتے ہیں اور بنیادی اور ثانوی کرداروں سے کس طرح کام لیتے ہیں:

فضہؓ سے دخترِ اسداللہؑ نے کہا
قاسمؑ کو اور بیٹوں کو میرے بلا تو لا
باہر نکل کے اس نے شہزادوں کو دی صدا
برجِ شرف سے تین ستارے ہوئے جدا
اکبرؑ تو شاہِ دیں کی طرف دیکھنے لگے
عباسؑ مڑ کے سوئے نجف دیکھنے لگے

(اقتباس مراثی دبیر)

....

حرؑ و بریرؓ و وہبؓ و عمیرؓ فلک مقام
وہ مسلمؓ ابن عوسجہؓ عرش احتشام
سعدؓ و زہیرؓ قین و حبیبؓ خجستہ کام
وہ شیر جس کا بو عمر نہشلیؓ تھا نام

جس غول پہ جھپٹ کے یہ آئے وہ ہٹ گیا
اک ایک مرتے مرتے پروں کو اُلٹ گیا

(اقتباس مراثی انیس)

ڈرامے میں ایک ضروری چیز ''پلاٹ'' ہے اور اس میں آغاز وسط عروج اور انجام کی قید رکھی گئی ہے' کیونکہ بقول عشرت رحمانی:

''......ڈراما نگار کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ زندگی کے کسی پہلو کو سامنے رکھ کر جس واقعے کو بھی منتخب کرے' اس کے جزئیات پر پوری نظر رکھتا ہو' اور حسن و قبح پر حاوی ہوتا کہ فطرت انسانی کی کامل نقاشی کر سکے۔'' (۱۵)

مرثیہ نگار واقعہ کربلا کو پیش کرتا ہے اور بقول خواجہ ڈاکٹر محمد زکریا:

''......واقعہ نگاری کو بھی مرثیہ میں شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ مرثیہ گو شاعروں نے شہادت امام حسینؑ پر منتج ہونے والے ایک ایک واقعے کو تفصیل کے ساتھ مرثیوں میں پیش کیا ہے' اور اس سلسلے میں امام مظلوم کے ساتھ پیش آنے والے تمام مصائب' ان کی اور ان کے عزیزوں کی ساری مشکلات' دشمنوں سے پامردی کے ساتھ مقابلہ' غرض ہر طرح کے واقعات کو پیش کیا ہے۔'' (۱۶)

مرثیے کے واقعات میں بہر حال آغاز تا انجام تمام مراحل تمہید سے لے کر دعا تک پیش کیے جاتے ہیں۔ اس لیے مرثیے اور ڈرامے میں یہ بات قدرِ مشترک قرار دی جاتی ہے۔ ڈرامے میں قصہ کے اندر کشمکش کے آثار بھی پائے جاتے ہیں اور یہ کشمکش تصادم پر منتج ہوتی ہے۔ مرثیے میں بھی کشمکش کی صورت دکھائی دیتی ہے اور دو مخالف قوتوں کا برسرِ پیکار ہونا تصادم ظاہر کرتا ہے اور مرثیے میں موجود ''جنگ'' اس کا عملی مظاہرہ ہے۔ ناقدین نے بعض

---

(۱۵) عشرت رحمانی ''اردو ڈراما کا ارتقا'' لاہور' شیخ غلام علی' ۱۹۸۶ء' ص: ۲۸۔

(۱۶) خواجہ محمد زکریا' ''قدیم نظمیں'' لاہور' بک ورلڈ' ۱۹۶۴ء' ص: ۱۸۳

مرثیوں میں موجود نفسیاتی کشمکش کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ بعض اوقات مرثیہ نگاروں نے واقعات میں جزوی تبدیلی کر کے ڈرامائیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرات عون و محمد کا علم کے حصول کی خاطر اصرار والا واقعہ بطور مثال کافی ہے۔ اس نفسیاتی کشمکش کو ابھارنے کے لیے مرثیہ نگار کو سخت محنت کرنا پڑتی ہے اور کیونکہ واقعہ نگاری کے لیے صرف قدرت زبان ہی کافی نہیں بلکہ بقول شبلی نعمانی 'فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا بھی ضروری ہے۔ (۱۷)

حضرت حرؓ کے متعلق لکھے گئے مرثیوں میں انسان کی اندرونی کشمکش کا اظہار دیکھنے کے قابل ہے اور بلاشبہ مرثیہ نگاروں نے اس موقع پر ڈراما نگاروں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ حضرت حرؓ کی شان میں لکھے گئے مرثیوں میں سے صرف دو بند ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ مرثیہ نگاروں نے کس طرح نفسیاتی کشمکش پیدا کردی ہے:

آنکھوں سے پردہ اُٹھ گیا' دیکھا یہ اس گھڑی
فوج حسینؑ عرش کے پہلو میں ہے کھڑی
قوم یزید قعر سقر میں نظر پڑی
آتش کے طوق پہنے اور آتش کی ہتھکڑی
یوں تھرتھرا کے خاک پہ حرؓ یک بیک گرا
گویا زمیں پہ اپنی جگہ سے فلک گرا

(اقتباس مراثی دبیر)

عمل خیر سے بہکا نہ مجھے او ابلیس
یہی کونین کا مالک ہے' یہی راس و رئیس
کیا مجھے دے گا ترا حاکم ملعون و خسیس
کچھ تردد نہیں کہہ دے کہ لکھیں پرچہ نویس

---

(۱۷) شبلی نعمانی "موازنہ انیس و دبیر" کراچی اردو اکیڈمی سندھ۔

ہاں سوئے ابن شہنشاہ عرب ؑ جاتا ہوں
لے ستم گر! جو نہ جاتا تھا، تو اب جاتا ہوں

(اقتباس مراثی انیس)

مرثیے اور ڈرامے کے انجام میں بعض ناقدین نے ایک خاص طرح کے پیدا ہونے والے ''تاثر'' کی مماثلت بھی تلاش کی ہے۔ ان کے خیال میں یہ تاثر کسی حد تک کوئی پیغام یا خاص سوچ کی تشکیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ مرثیے میں مرثیہ نگار بعض اوقات تو بالکل صاف لفظوں میں اپنے سامع کو پیغام دیتا ہے کہ:

کچھ خبر بھی ہے، محبان حسین ؑ دور بیں
موت ہے شبیریت ؑ کے دائرے میں انگبیں
اتباع مرشدِ حق پرور و عہد آفریں
کاروبار مرگ ہے، بازیچۂ طفلاں نہیں

زہر سے لبریز ہے جام حسین ابن علی ؑ
جان دینا ہو تو لو نام حسین ابن علی ؑ

رعب سلطانی کو ٹھکراؤ تو لو نام حسین ؑ
بولتے رن میں نہ گھبراؤ تو لو نام حسین ؑ
دشمنوں کی پیاس بجھواؤ تو لو نام حسین ؑ
موت کی چھاتی پہ چڑھ جاؤ تو لو نام حسین ؑ

حلق سے تیغوں کا منہ موڑو تو لو نام حسین ؑ
برگ سے فولاد کو توڑو تو لو نام حسین ؑ

(اقتباسات مراثی ' جوش)

ناقدین کے خیال میں مرثیے اور ڈرامے کی ایک انتہائی اور اہم مماثلت ''مکالمہ نگاری'' ہے۔ ڈراما نگار اور مرثیہ گو دونوں مکالمہ نگاری سے کردار میں جاذبیت اور ماحول میں

رنگارنگی پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں کیونکہ بقول عشرت رحمانی:

''مکالمہ عملی صداقت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ہر کردار کی کامیابی کی ذمہ داری مکالمت پر ہے۔ مکالمے کے ذریعہ ہی تمام خیالات و جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے مکالمہ میں الفاظ اور زبان و بیان کی موزونیت بے حد ضروری ہے۔ موقع و محل کی مناسبت کے ساتھ مکالموں کو پرکشش اور موثر بنانا اور ان میں عمل کی قوت پیدا کرنا ڈراما نگار کا اولین فرض ہے۔ کسی اہم ترین موقع کو بے اثر اور بے جان بنانے کے لیے ان کے ناموزوں مکالمات ذمہ دار ہو سکتے ہیں اور کسی معمولی واقعہ کو پر اثر اور جان دار بنانا مناسب اور پر زور مکالمت کے ذریعے آسان ہوتا ہے۔'' (۱۸)

مرثیے اور ڈرامے میں ''مکالمات'' سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ مرثیے میں خصوصیت کے ساتھ بعض مقامات ایسے آ جاتے ہیں' جہاں صورت واقعہ کے مطابق معمولی سا مکالمہ بھی وہ اثر پیدا کر دیتا ہے' جو ایک بھرپور مرثیہ بھی بعض اوقات پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ انیس کا فقط یہ مصرعہ بعض مرثیوں پر بھی بھاری ہے:

مولا نے سر جھکا کے کہا ''میں حسین ہوں''

بعض اوقات اس طرح کے مکالمات مرثیے کے داخلی حسن میں اضافے کا موجب بن جاتے ہیں۔ ذیل کے چار بندوں میں مکالمات ملاحظہ فرمایئے اور غور کیجیے کہ ان مکالمات نے کس طرح واقعہ میں شدت اور ماحول میں تبدیلی پیدا کی ہے:

''اب تم جسے کہو اسے دیں فوج کا علم''
کی عرض ''جو صلاح شہ آسماں حشم''
فرمایا ''جب سے اُٹھ گئیں زہرائے'' باکرم''
''اس دن سے تم کو ماں کی جگہ جانتے ہیں ہم''

---

(۱۸) عشرت رحمانی' اردو ڈراما کا ارتقاء' لاہور' شیخ غلام علی' ۱۹۸۶ء' ص: ۳۴۔

"مالک ہو تم، بزرگ کوئی ہو کہ خرد ہو
جس کو کہو، اسی کو یہ عہدہ سپرد ہو"

بولیں بہن کہ "آپ بھی تو لیں کسی کا نام
ہے کس طرف توجہ سردارِ خاص و عام"
"قرآں کے بعد ہے تو بس ہے آپ کا کلام
گر مجھ سے پوچھتے ہیں شہ آسماں مقام"

"شوکت میں، قد میں، شان میں ہمسر کوئی نہیں
عباسؑ نامدار سے بہتر کوئی نہیں"

(اقتباسات مراثی انیس)

زینبؑ پکاری "میں تو ہوئی سب میں سرنگوں"
"ہے ہے، ہر ایک رنج سے یہ رنج ہے فزوں"
"اک تیغ سے بہائے گا یہ پنجتن کا خوں
سر کھولوں شیرِ حق کا پکاروں؟ دہائی دوں؟"

"اُلفت جو تھی حسینؑ علیہ الصلوٰت کی
کیوں تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی؟؟"

(اقتباس مراثی دبیر)

مرثیے اور ڈرامے میں ان مماثلتوں کے علاوہ بھی بعض باتیں مشترک ہیں مثلاً ڈرامے میں موسیقی کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا ہے اور ارسطو نے ڈرامے کے بنیادی عناصر میں موسیقی کو بھی جگہ دی ہے۔(۱۹) مرثیے میں ترنم اور بعض اوقات لفظوں کا زیر و بم اس کمی کو پورا کر دیتا ہے۔ اس سمت اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم قریشی رقمطراز ہیں:

"......مجالس عزا میں مرثیہ خوانی، سوز خوانی اور نوحہ خوانی کا رواج بھی عرصہ

---

(۱۹) عشرت رحمانی، اردو ڈراما کا ارتقاء، لاہور، شیخ غلام علی، ۱۹۸۶ء، ص: ۲۷۔

دراز سے چلا آتا ہے۔ اس میں نثر کے بجائے نظم میں سرفروشانِ کربلا کے
واقعات پیش ہوتے ہیں۔ مرثیہ کو ڈرامائی انداز میں تحت اللفظ پڑھا جاتا ہے
اور سوز و نوحہ ترنم سے ادا ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ کوئی ساز شامل نہیں
کیا جاتا۔ ان کے سننے سے سامعین پر غم و اندوہ کی ایسی حالت وارد ہوتی ہے کہ
کوئی آنکھ ایسی نہیں ہوتی ہے' جو ان اندوہگیں حالات کو سن کر پرنم نہ ہو۔" (۲۰)

"مرثیے اور ڈرامے" میں موجود مندرجہ بالا چند مماثلتوں کے علاوہ بھی بعض مشترک اقدار ہیں' جو ان دونوں اصناف میں باہمی ربط کی ایک فضا قائم کر دیتے ہیں۔ ان مشترک اقدار اور مماثلتوں کا بغور مطالعہ کریں' تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مرثیے ڈرامے میں نمایاں فرق ہے۔ یہ فرق بعض اوقات داخلی حوالوں سے ہمارے سامنے آتا ہے اور بعض اوقات اس کی نوعیت خارجی ہو جاتی ہے۔

مرثیے اور ڈرامے میں "کرداروں کی مماثلت" پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اگر اردو اور انگریزی کے معروف ڈراموں اور مشہور مرثیوں کے کرداروں کا تقابلی جائزہ لیں تو انکشاف ہوتا ہے کہ دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ ڈرامے کے کرداروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ مثالی نہ ہوں۔ اس عمل سے ڈرامے میں تحیر و استعجاب پیدا ہوتا ہے' جو ڈرامے کی جان ہے۔ اس کے برعکس مرثیے کے کردار فقط مثالی ہی نہیں' بلکہ قابل تکریم بھی ہوتے ہیں۔ بقول سید عابد علی عابد:

"......مرثیے میں بھی مختلف کردار ہیں اکثر ٹائپ ہیں' یعنی رفتار زماں کا ان
پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ ایک شان دار الیے کے افراد ہیں۔ خیر کے نمائندے
ہیں اور شر سے برسرِ پیکار ہیں۔" (۲۱)

مرثیے کے کرداروں کی یہی تکریم و عزت ان کی ارتقائی تبدیلی میں حائل ہے۔ مگر

---

(۲۰) اسلم قریشی' ڈرامے کا تاریخی اور تنقیدی پس منظر' لاہور' مجلس ترقی ادب' ۱۹۷۱ء' ص: ۳۹۴

(۲۱) عابد علی عابد' اصول انتقاد ادبیات' لاہور' مجلس ترقی ادب' ۱۹۶۲ء' ص: ۶۵۱۔

حضرت حر کا کردار مرثیے میں سب سے زیادہ ارتقا پذیر اور حیران کن ہے۔ ڈرامے میں کردار خود بخود نمودار ہوتے ہیں اور اسٹیج پر اپنا ''رول'' ادا کر کے چلے جاتے ہیں' جب کہ مرثیہ نگار اپنے طور پر تمام کرداروں کو خود پیش کرتا ہے اور ان کی زبان سے بھی خود کلام کرتا ہے۔ کرداروں کی اس طرح سے پیش کش کے نتیجے میں مرثیہ نگار کی حیثیت اولین ہو جاتی ہے اور کردار ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور مرثیہ نگار کا کام ڈراما نگار کی نسبت سخت اور کٹھن ہو جاتا ہے۔

ارسطو کا خیال ہے کہ المیاتی ڈرامے کے ہیرو میں کچھ نہ کچھ خامیاں بھی ہونی چاہئیں' تا کہ وہ عام انسانوں سے مماثل دکھائی دے اور اس کے مسائل انسانی مسائل معلوم ہوں۔ اس کے برعکس مرثیہ نگار مرثیے میں مثالی کردار پیش کرتے ہیں۔ اب مرثیہ نگار کو دو جہتوں پر کام کرنا ہوتا ہے۔ ایک طرف تو ان مثالی کرداروں کی مثالیت کو واضح کرنا اور دوسرا ان کی عام انسانی زندگی کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ سامعین کے ترحم کے جذبات بیدار کر سکیں۔ اس طرح اب ہم فرق کی وضاحت کے نتیجے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناقدین کا مرثیے اور ڈرامے میں مماثلت کا شدید اصرار بے معنی ہے۔

ڈرامے اور مرثیے میں ''قصہ کی ضرورت'' کے تحت ان اصناف کو ملانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ڈرامے میں قصہ عموماً ''فرضی'' ہوتا ہے اور مصنف کو اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ جہاں مناسب سمجھے اس میں رنگ آمیزی کر لے۔ مرثیہ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مرثیے کے واقعہ کا تعلق تاریخ سے ہے اور مرثیہ نگار اپنی رضا سے اس میں بنیادی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے جزوی مماثلت کے باوجود ڈراما نویس اور مرثیہ نگار کے دائرہ کار میں نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔

ڈرامے اور مرثیے کے اختتام کے بعد ناظرین و حاضرین پر مختلف انداز کے اثرات مرتسم ہوتے ہیں۔ ڈرامے طربیہ بھی ہوتے ہیں اور المیہ بھی مگر مرثیے بہر حال حزنیہ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسلم قریشی معروف نقاد بڈسن کے کلاسیکی ڈرامے میں موجود المیہ اور طربیہ

عناصر کے بارے میں پیش کردہ ایک رخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"......کلاسیکی ڈرامے میں موضوع اور لہجے (یا تاثیر) کی وحدت کی شدت سے پابندی کی جاتی ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر المیہ اور طربیہ بالکل جداگانہ حیثیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔ المیہ ڈرامے کے لیے اول تا آخر المناک ہونا لازم ہے۔ اس کے لیے ایک مناسب اور معیاری سطح پر رہنا ناگزیر ہے۔ اس میں کسی نوع کے طرب انگیز عناصر کی طرف رغبت یا تفریحی پہلوؤں کی آمیزش ناممکن ہے اس طرح طربیہ کے لیے آغاز سے اختتام تک طرب ناک ہونا ضروری ہے"۔ (۲۲)

یہ بات بھی محل نظر ہے کہ مرثیہ نگار بھی بعض اوقات مرثیے میں مسرت کے بعض پہلوؤں کو اُجاگر کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل مرثیے میں ساقی نامہ کو "فرحیہ اضافہ" قرار دیتے ہیں۔ (۲۳) مگر حقیقت یہی ہے کہ مرثیہ میں طربیہ انجام کسی صورت میں ممکن نہیں۔ خواجہ محمد زکریا کے بقول:

"...... یہ جان لینے کے بعد بھی کہ اردو مرثیہ ایک مرکب صنف ہے۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ مرثیے کا مجموعی تاثر ایک المیہ کا سا ہونا چاہئے اور ڈرامائی عناصر، واقعہ نگاری اور رزمیہ تفصیلات اس قدر طویل نہیں ہونی چاہئیں کہ مرثیہ کا اصل مقصد ہی ختم ہو کر رہ جائے اور اصل مقصد یہی ہے کہ سامعین شہادت کو ایک بہت بڑا ذاتی اور مذہبی سانحہ تصور کریں اور یوں محسوس کریں، جیسے ان کا کوئی بہت بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ اگر مجموعی طور پر یہ اثر مرتب نہ ہو سکے اور کوئی شخص اس اثر کی موجودگی کو ضروری نہ سمجھے تو اس صنف کا نام مرثیے کی بجائے کچھ اور قرار دینا چاہئے، کیونکہ مرثیے کے لیے لازمی ہے کہ

---

(۲۲) محمد اسلم قریشی 'ڈرامے کا تاریخی اور تنقیدی پس منظر' لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۱ء، ص: ۸۰۔

(۲۳) آغا سہیل ڈاکٹر "جدید مرثیہ نگاری" (مرتبہ' وحید الحسن ہاشمی) 'لاہور' مکتبہ تعمیر ادب' ۱۹۶۷ء' ص: ۲۲۱۔

اس کا اثر قارئین یا سامعین پر اس طرح ہو کہ موضوع مرثیہ کی موت ایک
بہت بڑی مصیبت ہے۔"(۲۴)

حقیقت بھی یہی ہے کہ بین یا بکا مرثیہ کا جزو لاینفک ہے اور اس کے بغیر مرثیہ مرثیہ ہی نہیں رہتا۔ دانتے اپنے خطوط میں ہوریس کے حوالے سے المیہ اور طربیہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ المیہ ارفع اور عظیم چیز ہوتی ہے اور طربیہ ہلکی پھلکی ادنیٰ چیز (۲۵)، اس لحاظ سے مرثیے کی اہمیت اور افادیت ڈرامے کے مقابلے میں مزید مستحکم ہو جاتی ہے۔ مرثیے اور ڈرامے کے مقاصد میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ڈرامے میں تفریحی عنصر کا غلبہ ہوتا ہے اور مرثیے میں تفریحی عناصر شدت کے ساتھ جلوہ گر نہیں ہوتے، چونکہ مذہبی تعلق کی وجہ سے مرثیے کا ارفع ترین مقصد ثواب کا حصول ہوتا ہے۔ (۲۶)

ان پیش کردہ آرا، اور نکات کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ مرثیہ اور ڈرامے میں بعض داخلی اور خارجی خصوصیات مشترک تو ضرور ہیں، مگر ان مشترک مماثلتوں کے پیش نظر بھی ان دونوں اصناف کو ہم ایک صنف قرار نہیں دے سکتے بقول ڈاکٹر احراز نقوی:

"......اب ظاہر ہے کہ ایپک اور ٹریجڈی، ڈراما اور ایلیجی کے بعض مقامات مرثیے سے مشابہ ہونا بدیہی امر ہے اور اسی طرح سے ان میں بعد، تضاد اور اختلاف کا ہونا بھی فطری اور منطقی ہے۔ مرثیے کا مزاج، ماحول، ماہیت اور ہیئت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس لیے مرثیے کا مغربی اصناف سے موازنہ کرنا اصولی طور پر بے سود ہے یا ان اصناف کے معیار پر مرثیے کا پرکھنا بھی دانشمندانہ تنقید کے منافی ہے یا اسی طرح مرثیے کا مغربی اصناف سے تقابل میں یکسانیت اور عدم یکسانیت سے حسن و معائب کا استنباط تنقیدی

---

(۲۴) خواجہ محمد زکریا، قدیم نظمیں، لاہور، بک ورلڈ، ۱۹۶۴ء، ص: ۱۸۳۔
(۲۵) محمد اسلم قریشی، ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر، لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۷۱ء۔
(۲۶) احسن فاروقی، مرثیہ نگاری اور میر انیس، لاہور، اردو اکیڈمی ۱۹۵۱ء۔

دیانت نہیں۔" (۲۷)

پروفیسر سجاد رضوی بھی مرثیے اور ڈرامے کی بعض مشترک خصوصیات کا جائزہ لینے کے بعد مرثیے کو ڈرامے سے ایک قطعی علیحدہ صنف تسلیم کرتے ہیں:

"اردو مرثیے کو مغربی اصناف سخن کے معیار پر پرکھا جاتا ہے۔ کبھی تو یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اُردو میں مرثیہ گو تاریخی ناول نگار کے فرائض سرانجام دے رہا ہے اور کبھی ڈراما نگار یا رزمیہ نویس کے۔ حالانکہ یہ بات بھی قطعی طور پر غلط ہے۔ یہ درست ہے کہ مرثیے میں ان اصناف کے جراثیم ملتے ہیں' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کو ان اصناف کے معیاروں پر پرکھنا شروع کر دیں۔" (۲۸)

حقیقت یہ ہے کہ مرثیے کا مزاج اور اس کی باطنی کیفیات ڈرامے سے قطعی مختلف ہیں اور ڈرامے کی مقتضیات مرثیے کی ضروریات سے بالکل مختلف ہیں۔

ہماری اس طویل بحث کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ مرثیے اور ڈرامے میں موجود فرق اصل میں دو تہذیبوں کا فرق ہے۔ ادبی تخلیقات بلاشبہ پورے تہذیبی عمل کا حصہ ہوتی ہیں۔ (۲۹) یونان اور انگلستان کی تہذیبوں نے ڈرامے جیسی صنف کو جنم دیا اور اس صنف کے پس منظر میں دونوں ممالک کی تہذیبیں منعکس دکھائی دیتی ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب نے مرثیہ کی صنف کو جنم دیا اور اسی لیے مرثیوں میں لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرت کے عناصر جلوہ گر ہیں۔ دو مختلف تہذیبوں میں جس طرح بعض مماثلتوں کے باوجود فرق ہوتا ہے اسی طرح مختلف تہذیبوں میں پیدا ہونے والے اصناف بعض فروعی مماثلتوں کے باوجود اپنی اصل میں مختلف ہوتی ہیں۔ اس

---

(۲۷) احراز نقوی' "جدید مرثیہ نگاری" (مرتب' سید وحید الحسن)' لاہور' مکتبہ تعمیر ادب' ۱۹۶۷ء' ص: ۲۰۰۔

(۲۸) سجاد رضوی "اردو مرثیہ" (مضمون) لاہور رسالہ صحیفہ' چھٹا شمارہ' ۱۹۵۸ء' ص: ۶۰۔

(۲۹) سجاد باقر رضوی' ڈاکٹر' مغرب کے تنقیدی اصول' لاہور' اظہار سنز' (طبع دوم)' ص: ۲۵۰۔

طرح اب ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مرثیے اور ڈرامے میں وہی فرق ہے' جو یونان اور لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرت میں ہے۔ اس تہذیبی بعد کے باوجود اگر ہم نے زبردستی دونوں اصناف کو جوڑنے کی کوشش کی تو مرثیے اور ڈرامے میں تو کوئی یگانگت پیدا نہیں ہو سکے گی' البتہ دونوں اصناف اپنی اہمیت اور افادیت کھو دیں گی۔

⌘⌘⌘
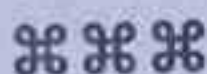
مرثیے کے حوالے سے

ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن کی اہم تصانیف وتالیفات

- آیاتِ آمنہ

(قیصر بارہوی کا مرثیہ مع تنقید)

- العطش (جلد اوّل)

(سیّد وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کی تدوین)

- العطش (جلد دوم)

(سیّد وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کی تدوین)

- العطش (جلد سوم)

(سیّد وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کی تدوین)

- منتخب مرثیے

(قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین)

- منتخب مرثیے

(قیصر بارہوی کے مرثیوں کی تدوین)

زیرِ طبع

- اردو مرثیہ اور دیگر اصناف
- لاہور کا دبستان مرثیہ
- سیف زلفی کے مراثی

مرثیے اور قصیدے کی مشترک جہتوں کا جائزہ

انسانی حیات متنوع جذبات واحساسات سے مملو ہے۔ ان جذبات میں سے دو جذبے یعنی جذبہ الم وجذبہ طرب، ایسے ہیں جن پر انسانی زندگی گردش کر رہی ہے۔ یہ دونوں جذبے کبھی معاشرتی وتہذیبی صورت حالات کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور کبھی ان کی نمود ذاتی شخصیت کے حوالے سے ہوتی ہے تاہم یہ دونوں جذبات واحساسات اپنے اظہار کے لئے خود ہی پیرایہ اظہار تلاش کر لیتے ہیں۔ اس حوالے سے جذبۂ غم کے شاعرانہ اظہار کی صورت صنف مرثیہ ہے اور احساس طرب کے اظہار کی شکل صنف قصیدہ قرار دی جا سکتی ہے۔(۱) یہ دونوں جذبے اگرچہ اپنے طور پر نہایت اہم اور گراں قدر ہیں تاہم بعض اوقات کسی جذبے کی فراوانی دوسرے جذبے کو منظر سے ہٹا دیتی ہے۔ پامال جذبہ اپنی کارفرمائی بہر حال جاری رکھتا ہے اور اس کے اثرات بھی محسوس وغیر محسوس طریقے پر مرتسم ہوتے رہتے ہیں بعض مقامات پر یہ دونوں جذبے اس طرح توازن سے انسانی زندگی میں سرایت کر جاتے ہیں کہ غم وطرب کی تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ یہی حالت ان دونوں اصناف سخن کی بھی ہے کہ بعض

---

(۱) اس مضمون میں قصیدے سے مراد صرف وہ صنف سخن لی گئی ہے جو بقول حالی زندوں کی مدح میں لکھی جاتی ہے گویا یہاں مدحیہ قصیدہ موضوع بحث سے خارج ہے۔

مقامات پر مرثیے اور قصیدے کی مماثلتیں چشم بینا کو متحیر و متعجب کر دیتی ہیں۔

اودھ کی تہذیب کا خمیر طربیاتی عناصر کی فراوانی سے اٹھا، تاہم اس تہذیب پر ہندوستان کی عظیم تہذیبی روایت کا سایہ پرتو فگن تھا بقول ڈاکٹر صفدر حسین:

> ''اودھ کی تہذیب بھی ہندوستان کی اس عظیم تہذیب کا عکس تھی جس نے بھی دلی میں عروج پایا تھا لیکن اب دلی ماند پڑ رہی تھی اور لکھنؤ عروج پر تھا۔ اس کے علاوہ نئے ماحول میں قدیم تہذیب بعض مقامی، معاشی اور نفسیاتی اثرات کی وجہ سے قدرے منفرد اور چمک دار صورت اختیار کر گئی تھی''۔ (۲)

اودھ سے ملحقہ علاقوں اور خصوصاً لکھنؤ میں سیاسی استحکام، معاشی اطمینان اور ذہنی سکون کی وجہ سے طربیہ عناصر فروغ پا رہے تھے اور سوز کو اصناف سخن میں ساز بنایا جا رہا تھا۔ (۳) شاہ اودھ کی تقلید میں پورے لکھنؤ میں چھوٹے بڑے درباروں کی کثرت تھی اور نوابین کے اردگرد عوام الناس کا ایک جم غفیر رہتا تھا جن کا مطمح نظر فقط اپنے مالک کی خوشنودی ہوتا تھا۔ مقربین کی جائز و ناجائز مدح و ستائش ممدوح میں عطا و نوازش کی صفت مزید اجاگر کر دیتی تھی۔ اسی بخشش اور جود و سخا کی عملی صورت تھی کہ لکھنؤ کے ہر فرد کی زبان پر یہ فقرہ جاری ہو گیا کہ:

''جس کو نہ دے مولا، اس کو دے آصف الدولہ''

اسی طرح نواب غازی الدین حیدر کا ارباب نشاط سے یہ کہنا کہ ''جب تک میں زندہ ہوں جتنا تمہاری قسمت میں ہے لے لو، سمیٹ لو''۔ (۴) ان طلب گاروں کی آتش شوق طلب کو بھڑکانے کے لئے کافی تھا۔ اب ایسی صورت میں اور طربیاتی ماحول میں قصیدے کا عروج نہ پانا اور مرثیے کا بام عروج تک پہنچ جانا محل نظر ہے۔ ناقدین کو اس اہم نکتہ کی طرف توجہ دینی

---

(۲) سید صفدر حسین ڈاکٹر 'لکھنؤ کی تہذیبی میراث' لاہور: بارگاہ ادب، ۱۹۵۷ء ص ۲۸۷

(۳) فراق گورکھپوری 'اردو کی عشقیہ شاعری' الہ آباد: سنگم پبلشنگ ہاؤس ۱۹۵۶ء

(۴) نجم الغنی 'تاریخ اودھ' مراد آباد: مطبع مطلع العلوم، ۱۹۰۱ء

چاہئے کہ عیش ونشاط اور درباری ماحول کے باوجود لکھنؤ میں قصیدے کو عروج کیوں نہ حاصل ہو سکا.....؟؟

انسانی زندگی غم و مسرت کے جذبات سے پر ہے۔ جدید نفسیات دانوں نے اس بات کا کھوج لگایا ہے کہ اعلیٰ ترین انسان وہ ہے جس کی زندگی میں غم وطرب کے جذبات و احساسات توازن سے ہوں۔ اس اعتبار سے ان ناقدین نے انسانی زندگی کو ایک سکے کی مانند قرار دیا ہے جس کے ایک رخ پر جذبۂ غم اور دوسرے پر جذبۂ طرب کی چھاپ ہے۔ اسی بات کو خواجہ میر درد نے شاعرانہ پیرائے میں یوں بیان کیا ہے:

دل پہ چاک ہے گُلِ خنداں
شادی و غم جہاں میں توام ہے

حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ انسان کی طرح اعلیٰ ترین تہذیب بھی اپنے اندر ایک ہی وقت میں جذبۂ طرب اور جذبۂ غم سموئے ہوئے ہوتی ہے۔ انگلستان اور لکھنؤ کی اعلیٰ تہذیبوں کا مطالعہ کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ انگلستان میں اعلیٰ ترین المیہ اور طربیہ ڈرامے ایک ہی عہد میں تخلیق ہوئے۔ اسی طرح لکھنؤ میں مرثیہ (المیہ) اور ریختی (طربیہ) ایک ہی عہد میں اپنے فنی کمال تک پہنچے۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ المیہ اور طربیہ احساسات کسی بھی تہذیب کی تشکیل کے لئے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ گویا لکھنوی تہذیب و معاشرت کے طربیاتی ماحول میں بااعتبار ہونے والی احساس الم کی نمائندہ صنفِ سخن ''مرثیہ'' کو ہم وہاں کی تہذیبی علامت اور اخلاقی ضرورت قرار دے سکتے ہیں۔(۵) اس حوالے سے رام بابو سکسینہ کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیے:

---

(۵) (i) سجاد باقر رضوی ' ڈاکٹر 'طنز و مزاح کے نظریاتی مباحث' کراچی: مقالہ پی ایچ ڈی (غیر مطبوعہ ص ۳۷۳

(ii) احراز نقوی ڈاکٹر 'جدید مرثیہ نگاری' (مرتبہ وحید الحسن ہاشمی) لاہور: مکتبہ تعمیر ادب، ۱۹۶۷ء ص ۲۰۳

''.....مرثیے میں اس حقیقی شاعری کا پرتو ہے جو اعلیٰ جذبات کو پراہیختہ کرتی ہے۔ اس کی ادب آموزی ایسے وقت میں جب دنیائے شاعری عیش پسند درباروں کی خوشامد اور تتبع میں نہایت ادنیٰ اور رکیک جذبات کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی، قابل صد ہزار آفرین ہے''۔(۶)

مرثیے میں دیگر اصناف کے محاسن کی موجودگی کے پیش نظر بیشتر ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ مرثیہ ایک مرکب صنف سخن ہے۔ (۷) اسی رویے کو شبلی نعمانی نے انیس کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

''میر انیس کا کلام شاعری کی تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے..... ان کے کلام میں شاعری کی جس قدر اصناف پائی جاتی ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتیں''۔(۸)

ان محاسن کی موجودگی کی وجہ سے ناقدین نے مرثیہ کا موازنہ وتقابل دیگر مغربی و مشرقی اصناف سے کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس طرح مرثیے کی ذاتی حیثیت متاثر ہونے کا امکان ہے۔ مرثیے کا جن دیگر اصناف سے موازنہ کیا گیا ہے ان میں ''قصیدہ'' سرفہرست ہے۔ اس سلسلے میں ناقدین نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مرثیہ اپنے مزاج کے اعتبار سے قصیدہ ہے (۹) اب ذیل میں ناقدین کی آراء کی روشنی میں مرثیے اور قصیدے کی مماثلتوں کے حوالے سے چند معروضات پیش کی جا رہی ہیں۔

اردو شاعری کی تاریخ میں قصیدہ اور مرثیہ دو قدیم اصناف سخن ہیں۔ جنوبی ہند کے شعراء کے دواوین کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ دونوں اصناف شعراء کے

---

(۶) رام بابو سکسینہ ''تاریخ ادب اردو (مرتبہ نسیم کاشمیری)'' لاہور: علمی کتاب خانہ، س۔ن، ص ۳۰۷

(۷) خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر 'تقدیم نظمیں' لاہور: بک ورلڈ، ۱۹۶۴ء، ص ۱۴۳

(۸) شبلی نعمانی 'موازنہ انیس و دبیر' آگرہ: مفید عام طبع، ۱۹۰۷ء، ص ۲۷۱

(۹) فرمان فتح پوری 'میر انیس۔ حیات و شاعری' کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۲ء، ص ۸۴

نزدیک معتبر رہے ہیں۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی شاعر ہو جس کے دیوان میں بادشاہ وقت کا قصیدہ اور اہل بیتؑ رسالت کی مدح میں مرثیہ موجود نہ ہو۔ اس اعتبار سے ''مدح'' کا عنصر قصیدے اور مرثیے میں مشترک قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی سوچ نے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی کہ مرنے والے متوفی کی مدح مرثیہ اور زندہ شخص کی مدح قصیدہ ہے لہٰذا یہ دونوں اصناف مزاجاً دراصل ایک ہیں۔ یہ رویہ یہاں تک اہم ہوگیا کہ حالی جیسے صاحب علم وبصیرت نے بھی مقدمہ شعروشاعری میں مرثیہ کو قصیدے کے ذیل میں پیش کیا اور اس سلسلے میں انہوں نے بھی یہی دلیل پیش کی کہ قصیدہ اور مرثیہ میں مدح کا عنصر مشترک ہے۔ حالی، رقمطراز ہیں:

> ''مرثیہ پر بھی اس لحاظ سے کہ اس میں زیادہ تر شخص متوفی کے محامد وفضائل ہوتے ہیں، مدح کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مردوں کی تعریف کو جس میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے مرثیہ کہتے ہیں۔ عرب کی قدیم شاعری میں قصائد اور مرثیے ایسے اور صحیح حالات وواقعات پر مشتمل ہوتے تھے کہ ان سے متوفی کی مختصر لائف استنباط ہوسکتی تھی''۔ (۱۰)

حالی اور دیگر ناقدین کی گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ ''مدح'' کا عنصر مشترک ہونے کی وجہ سے قصیدہ اور مرثیہ ایک ہی صنف کہلانے، کے لائق ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا رقمطراز ہیں:

> ''مدح کا عنصر بھی دونوں اصناف میں مشترک ہے۔ مدح کے حصے میں قصیدہ گو شاعر عموماً ممدوح کے عدل، شان وشکوہ اور بہادری کی تعریف کیا کرتے ہیں اور اس ضمن میں ممدوح کی تلوار اور گھوڑے کی تعریف بھی آجاتی ہے۔ مرثیہ گو شاعر بھی حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کی بہادری اور تلوار اور گھوڑے وغیرہ کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں''۔ (۱۱)

---

(۱۰) الطاف حسین حالی' مقدمہ شعروشاعری' لاہور: کشمیر کتاب گھر، س۔ن۔ص ۱۶۳

(۱۱) خواجہ محمد زکریا' ڈاکٹر' قدیم نظمیں' لاہور: بک ورلڈ، ۱۹۶۴ء، ص ۱۸۳

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مدح کے عناصر کی موجودگی کے نتیجہ میں ہر صنف قصیدے کی ذیل میں آجاتی ہے تو غزل، جس میں محبوب کی مدح سرائی جزو لاینفک ہے، قصیدہ کیوں نہیں.....؟؟ حقیقت یہ ہے کہ اصل مسئلہ مدح کا نہیں اس کی نوعیت اور طریقۂ پیشکش کا ہے۔ بلاشبہ قصیدہ نگار مدح سرائی کرتے وقت اعلیٰ ترین اقدار پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ قصیدے میں کسی مخصوص شخص کی مدح سرائی نہیں کرتا بلکہ وہ اس شخص کو اعلیٰ اقدار کا مظہر سمجھتے ہوئے قدری زندگی کو پیش کرتا ہے لہٰذا مولانا حالی کا یہ اعتراض کہ قصیدہ محض کسی شخص کی خوشامد ہوتا ہے، محل نظر ہے۔ (۱۲) اس کے علاوہ قصیدے سے حاصل ہونے والا انعام واکرام اعلیٰ فن کی سرپرستی کہا جاسکتا ہے نہ کہ خوشامد کا نتیجہ۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو قصیدہ گو شاعر اپنے اعلیٰ شعری ہنر کا اظہار کرتا ہے اور ممدوح شاعر کو انعام واکرام سے نوازتے ہوئے زندگی کے اعلیٰ رویوں کا اعتراف کرتا ہے۔ مرثیہ نگار بھی اپنے مرثیوں میں اعلیٰ ترین اخلاقی رویوں کی پیشکش ہی کرتا ہے مگر اس کے پس منظر میں تاریخ کی ایک عظیم مذہبی روایت کا سلسلہ بھی ہوتا ہے۔ یہی پس منظر دونوں کے انداز میں مدح سرائی میں بھی فرق کا موجب بنتا ہے۔

اب ذیل میں مرثیے اور قصیدے کے چند مدحیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں اور خود دیکھیں کہ دونوں کی نوعیتوں میں کس قدر فرق ہے اور مدح کے پیش کرنے میں قصیدہ نگار اور مرثیہ گو میں کیا فرق نمایاں ہوتا ہے:

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن — نام شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہر ذوالجلال والاکرام
شہسوار طریقۂ انصاف — نو بہار حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورت اعجاز — جس کا ہر قول معنی الہام
بزم میں میزبان قیصر و جم — رزم میں اوستادِ رستم و سام

(اقتباس: قصیدہ بہادر شاہ کی مدح میں، غالب)

---

(۱۲) الطاف حسین حالی 'مقدمہ شعر وشاعری' لاہور: کشمیر کتاب گھر، س۔ن۔ ص ۱۷۵

یعنی نواب فلک رتبہ شجاع الدولہ

قائم اس کا رہے تا حشر یونہی جاہ و جلال
بہ تمنائے جبیں بدر بھی ہوتا ہے ہلال
بسکہ یاں سجدے کے مشتاق ہیں ارباب کمال
یہ وہ در ہے کہ یہاں آ کے بہم پہنچا دے
رتبہ بال ہما ہر مگس بے پر و بال

(اقتباس: قصیدہ در مدح شجاع الدولہ، سودا)

بچوں میں سبز رنگ کوئی تھا کوئی صبیح
شیریں سخن، لبوں پہ نمک، رنگتیں ملیح
چاٹیں لبوں کو، ان کی جو باتیں سنیں فصیح
مردوں کو دم میں زندہ کریں صورت مسیح

جد و پدر کی طرح جری ہیں دلیر ہیں
بچے ہیں یوں، پہ غیظ جب آئے تو شیر ہیں

(حضرت عون و محمد کی مدح، انیس)

تیغ و ترنج اگر ہوں ہلال اور آفتاب
سرکاؤں چہرۂ علی اکبرؑ سے پھر نقاب
حوریں گلوں کو کاٹ کے تڑپیں رہے نہ تاب
گر دیکھتیں وہ حسن ملیح اور وہ شباب

پریاں تو ان کے سائے کا پیچھا نہ چھوڑتیں
دامن کبھی جناب زلیخا نہ چھوڑتیں

(حضرت علی اکبرؑ کی مدح، انیس)

قصیدے اور مرثیے کی ایک مماثلت ناقدین نے یہ تلاش کی ہے کہ دونوں اصناف

سخن کے اجزا ایک جیسے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ مرثیے کے اجزا قصیدے کے اجزا سے مستعار لیے گئے ہیں۔ ناقدین کا یہ کہنا بھی محل نظر ہے کہ میر ضمیر جس وقت مرثیہ کے اجزا متعین کررہے تھے اس وقت ان کے پیش نظر صرف قصیدے کی صنف تھی۔ گویا مرثیہ کی تشکیل قصیدے کی مرہون منت ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''مرثیے میں ''سراپا'' تو خیر قصیدے کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے لیکن تلوار کی تعریف، گھوڑے کی تعریف اور اہل بیتؑ کی دوسری صفات کا بیان بھی اسلوب قصیدہ ہی کے دائرے میں آتا ہے''۔ (۱۳)

''مرثیے کا چہرہ قصیدے کی تشبیب کی طرح سے ہے۔ جس طرح قصیدے کی تشبیب میں کبھی مناظر فطرت بیان کیے جاتے ہیں کبھی فخریہ مضامین آجاتے ہیں، کبھی اخلاقی خیالات سے آغاز ہوتا ہے، اسی طرح مرثیے میں بھی عام طور پر ایسے ہی تمہیدیہ مضامین ہوتے ہیں''۔ (۱۴)

مندرجہ بالا پیش کردہ نظریہ پر بحث سے قبل ضروری ہے کہ ہم قصیدے اور مرثیے کے اجزاء آپ کی خدمت میں پیش کردیں۔

اجزائے قصیدہ:

(۱) تشبیب یا نسیب (۲) گریز یا تخلص
(۳) مدح (۴) دعا یا خاتمہ

اجزائے مرثیہ:

(۱) تمہید (چہرہ) (۲) سراپا (۳) رخصت
(۴) آمد (۵) رجز (۶) واقعات جنگ
(۷) شہادت (۸) بین (۹) دعا

---

(۱۳) فرمان فتح پوری 'میر انیس حیات و شاعری' کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۶ء، ص ۸۴

(۱۴) خواجہ محمد زکریا ڈاکٹر 'قدیم نظمیں' لاہور: بک ورلڈ، ۱۹۶۳ء، ص ۱۸۳

آپ دونوں اصناف کے اجزا کا مطالعہ کیجئے اور بتائیے کہ تمہید، سراپا اور دعا کے علاوہ مرثیے کا کون سا جزو قصیدے سے ماخوذ قرار دیا جا سکتا ہے؟؟ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ قصیدے کی توسیعی شکل ہے لہٰذا مرثیے میں اس صنف کے اجزاء کی شمولیت حیران کن نہیں بلکہ رجز، واقعات جنگ، شہادت اور بین کے اجزا نے یہ بات ثابت کی ہے کہ قصیدے کی نسبت مرثیے میں موضوعات سمونے اور پیش کرنے کی زیادہ اہلیت ہے۔ اس کے علاوہ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ ضمیر نے مرثیے کے اجزا متعین کرتے وقت محض قصیدے کے اجزا کو پیش نظر رکھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرثیے میں ''بہاریہ'' اور ''ساقی نامہ'' کے اضافے کے وقت نواب مرزا عروج اور پیارے صاحب رشید کے پیش نظر کون سے قصائد تھے....؟؟ حقیقت یہ ہے کہ مرثیے نے قصیدے کے ہموار راستے پر اپنی عمارت تعمیر کی اور دیکھتے ہی دیکھتے مرثیہ قصیدے کی نسبت زیادہ مقبول ہو گیا اور حالی کو کہنا پڑا کہ ہمارے قصائد کی حالت تو ناگفتہ بہ ہے۔ البتہ ہمارے شعرا نے مرثیے میں ایک خاص قسم کی نمایاں ترقی کی ہے۔(۱۵) بہر حال مرثیہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد صنف ہے اور کسی دوسری صنف سے اس کو نتھی کرنا درست نہیں ہے بقول ڈاکٹر احسن فاروقی:

> ''جب ہم اردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمارے ادب کی سب سے زیادہ انوکھی Original صنف مرثیہ ہے..... مرثیہ ایسی صنف ہے جسے ہم نے اس کی موجودہ صورت میں کسی دوسری قوم یا اس کے ادب سے نہیں لیا بلکہ جس کی اردو ہی میں بنیاد پڑی اور اسی زبان میں نشو و نما پا کر وہ درجۂ کمال کو پہنچا''۔(۱۶)

ناقدین کا اصرار ہے کہ قصیدے اور مرثیے دونوں میں کسی نہ کسی ممدوح کی توصیف کی جاتی ہے اس لئے مقصد کے اعتبار سے یہ دونوں اصناف یکساں ہیں۔ جہاں تک قصیدے

---

(۱۵) الطاف حسین حالی 'مقدمہ شعر و شاعری' لاہور: کشمیر گھر، س۔ن۔ ص۱۶۴

(۱۶) احسن فاروقی 'مرثیہ نگاری اور انیس' لاہور: اردو اکیڈمی، ۱۹۵۱، ص۱۳

اور مرثیے میں ممدوح کی موجودگی کا ذکر ہے ابھی اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ قصیدہ گویا مرثیہ نگار اعلیٰ ترین اقدار کی گفتگو کرتا ہے۔ وہ اپنے ممدوح میں ہر وہ خوبی دیکھنا چاہتا ہے جو اعلیٰ ترین اقدار کی مظہر ہو۔ اس اعتبار سے ممدوح بھی اعلیٰ ترین اقدار کا نمائندہ بن کر قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ مرثیے اور قصیدے کے ممدوح میں فرق یہ ہے کہ مرثیے کا ممدوح بعض دیگر رجحانات و تصورات کی وجہ سے فوراً قابل قبول ہو جاتا ہے جبکہ قصیدے کے ممدوح کو ذہن انسانی ذرا تاخیر سے قبول کرتا ہے۔ اس کے کیا اسباب ہیں....؟؟ درحقیقت مرثیے کے ممدوح کی حیثیت عام انسان سے قدرے بالاتر سمجھی جاتی ہے اور مذہبی حوالے سے اسے بالعموم قابل تقلید سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ قصیدے کے ممدوح کو اس قسم کا تقدس حاصل نہیں ہوتا جو مرثیے کے ممدوح کے لئے مختص ہے۔ ذیل کے اشعار کا مطالعہ کیجئے تو قصیدے اور مرثیے کے ممدوح کا ایک واضح فرق آپ کے سامنے آجائے گا:

یوں کرسی زر پر ہے تری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو سر رحلِ طلائی
رکھتا ہے تو وہ دست سخا سامنے جس کے
ہے بحر بھی کشتی بکف از بہر گدائی
گمرہ کو ہدایت جو ترے راہ پہ لا دے
وہ زن بھی اگر ہو تو کرے راہ نمائی
خورشید سے افزوں ہو نشاں سجدے کا روشن
گر چرخ کرے در کی ترے ناصیہ سائی
عکس رخ روشن سے ترے جوں ید بیضا
کرتا ہے کف آئینہ اعجاز نمائی

(اقتباس: در مدح بہادر شاہ ظفر، ذوق)

یعنی وہ شاہ سلیماں کہ شکوہ سے اس کے
نیر حشمت و اقبال کو ہے چکاہٹ
جشن شاہانہ ہے اور ہیں امراء حاضر وقت
اس کے مجرے کو کھڑے فوجوں کے ہیں غٹ کے غٹ
بزم ایسی ہی مرتب ہے کہ سبحان اللہ
جس میں اقسام تماشا کا ہوا ہے جمگھٹ

(اقتباس: در مدح شہزادہ سلیمان شکوہ، انشاء)

نعرے سے تیرے ہووے ہیبت کا چاک سینہ
دل پر دلاوری کے وہ تیغ حیدری ہو
تیرے سوا جہاں میں کون آج ہے توانا
جو دل کے ناتواں کو دیتا توانگری ہو
جاروب کش ہے تیرے مشکوئے خسروی کا
زیبا ہے ماہ کو گر، فرمان مہتری ہو
خورشید نذر لائے جب افسر شعاع سے
منشور افسری پر توقیع خاوری ہو
لائیں پئے سواری، توسن کو جب سجا کر
صورت میں ہووے بجلی، پرواز میں پری ہو

(اقتباس: در مدح اکبر شاہ ثانی، ذوق)

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں آپ کے سامنے قصیدے کے ممدوح کی ایک خاص شبیہ ابھری ہوگی۔ اب ملاحظہ فرمایئے کہ مرثیے کا ممدوح کس طرح اپنی شخصیت میں سحر آفرینی پیدا کر کے قاری کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ اور قاری خود بخود اس کی تقلید کے لئے بے چین ہو جاتا ہے:

میں ہوں خالق کی قسم دوش محمدؐ کا مکیں | میں ہوں سردارِ شبابِ چمن خلد بریں
مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منور ہے زمیں | میں ہوں انگشترِ پیغمبرِ خاتم کا نگیں!

ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
محفل عالم امکاں میں اندھیرا ہو جائے

دوڑ کر چوم لئے پائے سرِ عرش سریر | حرؑ نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیرؑ
میں نے بخشی، مرے اللہ نے بخشی تقصیر | شہؑ نے چھاتی سے لگا کر کہا ''اے باتوقیر''!

میں رضا مند ہوں، کس واسطے مضطر ہے تو
مجھ کو عباسؑ دلاور کے برابر ہے تو

(اقتباسات مراثیٔ انیس)

مرثیے اور قصیدے کی ایک مماثلت ناقدین نے ''مبالغہ'' قرار دی ہے۔ ان کے خیال میں مرثیہ اور قصیدہ میں شاعر مبالغہ کو یکساں طور پر استعمال کرتا ہے، اس لئے قصیدہ اور مرثیہ صنف کے اعتبار سے ایک جیسے ہوتے ہیں۔

ہندوستان پر سیاسی گرفت کے بعد انگریزوں نے اپنے استعماری ہتھکنڈوں سے ہندوستانیوں کی جسمانی قوت پر تو قبضہ کر لیا لیکن وہ ان کی تخیلی سطح کو فتح نہ کر سکے۔ اس عمل کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ لکھنؤ کے فوجیوں کے ہاتھوں سے چھینی جانے والی تلواریں انیس کے مرثیوں میں زیادہ آب وتاب کے ساتھ چمکنے لگیں۔ اردو شاعری کی تخیلاتی پرواز سے انگریزی حکومت کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ جب تک شاعری میں تخیلاتی تلواریں چمکتی رہیں گی اس وقت تک یہ امکان باقی رہے گا کہ واقعاتی دنیا میں انہی تلواروں کا استعمال کیا جائے۔ نظم جدید کی فطرت نگاری نے تخیل کو چھوڑا اور واقعیت اور گردوپیش کے مناظر سے اپنا رشتہ استوار کیا۔ آزاد اپنے تخیل سے قطعی طور پر آزاد نہ ہو سکے اور انہوں نے ایک درجہ نیچے اتر کر تمثیل کے انداز میں نئے رویوں سے سمجھوتہ کر لیا مگر حالی خود کو واقعیت سے وابستہ کر کے امرِ واقعہ کو شاعری کہنے لگے، سرسید اور ان کے رفقا اپنی تمام تر علمی قابلیت اور ذہنی بصیرت کے باوجود اس نکتے کو فراموش کر

گئے کہ تخیل اور حقیقت دونوں کی حیثیت مسلم ہے۔ بہر حال کچھ تو نئے علوم کی خیرہ کردینے والی روشنی اور کچھ جدت سے لگاؤ کے سبب سے ان لوگوں نے ہر اس شے کے خلاف لکھنا شروع کر دیا جو تخیل کے لئے مفید ہو سکتی تھی۔ لہٰذا حالی نے تخیل کے اساسی رکن مبالغہ کو جھوٹ کے ہم معنی قرار دے کر شعرا کو مبالغے سے پرہیز کا مشورہ دیا۔ ملاحظہ فرمائیے:

> ''دوسری نہایت ضروری بات یہ ہے کہ شعر میں جہاں تک ممکن ہو حقیقت اور راستی کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے....... زمانے کا اقتضا یہ ہے کہ جھوٹ، مبالغہ، بہتان، افترا صریح، خوشامد، ادعائے بے معنی، تعلّی بے جا، الزام لایعنی، شکوہ بے محل اور اسی قسم کی باتیں جو صدق و راستی کے منافی ہیں اور شاعری کے قوام میں داخل ہو گئی ہیں، ان سے جہاں تک ممکن ہو قاطبۃً احتراز کیا جائے۔ یہ سوچ ہے کہ ہماری شاعری میں خلفائے عباسیہ کے زمانے سے لے کر آج تک جھوٹ اور مبالغہ برابر ترقی کرتا چلا آیا ہے اور شاعری کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں رکھا گیا بلکہ اس کو شاعری کا زیور سمجھا گیا ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جب سے ہماری شاعری میں جھوٹ اور مبالغہ داخل ہوا اسی وقت سے اس کا تنزل شروع ہوا''۔ (۱۷)

حالی نے مبالغہ کی جس طرح مذمت کی ہے وہ قابل ستائش نہیں شاعری میں مبالغہ کی حیثیت اساسی ہے۔ مبالغہ کسی شے کو ایک قدری حیثیت سے اٹھا کر دوسری قدری حیثیت میں لے جانے کا نام ہے گویا کسی شے کو جب ہم ایک سطح سے دوسری سطح تک لے جائیں تو مبالغہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر شے کو ادنیٰ سطح سے اعلیٰ سطح تک لے جائیں تو یہ اس کی تعریف ہوگی اور یہی مرثیہ اور قصیدے کا اسلوب ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی شے کو اعلیٰ سطح سے ادنیٰ سطح پر لے آئیں تو اس صورت میں بھی مبالغہ پیدا ہوگا مگر یہاں مبالغے کا مقصد تعریف کے بجائے تعریض ہوگا اور اس صورت میں طنز پیدا ہوگا جو ہجو یہ قصائد کا اسلوب ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر شاعر قصیدہ لکھ کر شکوہ بے محل پیدا کرتا ہے تو اس میں غلطی شاعر کی ہے یا مبالغہ کی؟؟ دوسری

---

(۱۷) الطاف حسین حالی 'مقدمہ شعر و شاعری' لاہور: کشمیر کتاب گھر، س۔ن۔ ص ۸۵

بات یہ کہ حالی بے چارے اس بات کو فراموش کر گئے کہ طنز بھی تو مبالغہ ہی سے جنم لیتا ہے۔ جو عوام الناس کی اصلاح کے لئے مفید بھی ہے اور کارگر بھی..... اب حالی سے یہ پوچھنا چاہئے کہ کیا کوئی ایسی چیز جو قوم کو راہ راست پر لا سکتی ہو، قوم کے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ شاعر تخیل کے بغیر اور تخیل مبالغہ کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، بات صرف قصیدے یا مرثیے ہی کی نہیں ہر صنفِ سخن میں شاعر مبالغہ کو بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے اور بلاشبہ مبالغہ سے بات میں حسن اور رعنائی پیدا ہو جاتی ہے۔ میر کی غزل کا یہ معروف شعر ملاحظہ فرمایئے اور بتایئے کہ اس میں مبالغہ کے استعمال نے حسن پیدا کیا؟

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

ماحصل یہ ہے کہ حالی کسی بھی سبب سے مبالغے کی مذمت کریں مبالغہ کے بغیر شاعری حالی کی غزلوں کی طرح بے لطف و بے مزا ہو جائے گی۔

مرثیے اور قصیدے دونوں اصناف سخن میں سخت شاعرانہ کاوشوں اور فنی ریاضتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعر میں یہ استعداد بھی ہونی چاہیئے کہ وہ شعر کی تاثیر اور حسن میں اضافے کرنے والے عناصر سے باخبر رہے۔ مبالغہ شاعرانہ حسن پیدا کرنے کا ایک نہایت کامیاب گر ہے۔ اس لئے ہر ہوشیار شاعر اپنے کلام میں حسن لطافت پیدا کرنے کے لئے مبالغہ کو بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے۔ اس اعتبار سے شبلی نعمانی کا یہ کہنا کہ انیس نے زمانے کے اقتضا اور مجبوری کے تحت اپنی شاعری میں مبالغہ استعمال کیا، قابل قبول نہیں۔ فرماتے ہیں:

> ''میر انیس کے زمانے میں مبالغہ کمال کی حد کو پہنچ چکا تھا اور یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب مبالغہ میں انتہا درجہ کا استبعاد نہیں ہوتا تھا، سامعین کو مزا نہیں آتا تھا مجبوراً میر صاحب نے بھی وہی روش اختیار کی''۔ (۱۸)

---

(۱۸) شبلی نعمانی ''موازنہ انیس و دبیر'' کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۲ء، ص ۹۳

حقیقت یہ ہے کہ انیس یا دیگر مرثیہ نگاروں نے جہاں مبالغے سے کام لیا ہے وہاں اپنی فنی مہارت کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ قصیدہ نگار بھی مبالغے سے کام لیتا ہے مگر اس کا بھرم قائم نہیں رہ پاتا۔ اگرچہ قصیدہ اور مرثیہ دونوں مبالغے کے جوہر سے مالا مال ہوتے ہیں تاہم ان میں جو فرق ہوتا ہے وہ ان مثالوں سے ظاہر ہو جائے گا:

چشم بد دور خسروانہ شکوہ لوحش اللہ، عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصر روم جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام
وارث ملک جانتے ہیں تجھے ایرج و تور و خسرو بہرام
زور بازو میں مانتے ہیں تجھے گیو و گودرز و بیژن و رہام

(اقتباس: قصیدہ در مدح بہادر شاہ ظفر، غالب)

کرتا ہے تری نذر سدا نقدِ سعادت
ہے مشتری چرخ کی کیا نیک کمائی
اک مرغ ہوا کیا ہے کہ سیمرغ نہ چھوڑے
گر سو بہوا ہووے ترا تیر ہوائی
ہر کوہ اگر کوہِ صفا ہو تو عجب کیا
ہو فیض رساں جب ترے باطن کی صفائی
ہو بلکہ صفا ایسی دل سنگ صنم میں
ہر بت میں کرے صورتِ حق جلوہ نمائی

(اقتباس: در مدح بہادر شاہ ظفر، ذوق)

وہ لو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب

سرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزہ گیاہ سے
سایہ کنویں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے
شیر اٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے
آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

(اقتباسات: مراثی انیس)

بعض مماثلتوں کی موجودگی کے باوجود مرثیے اور قصیدے میں تاثر اور نتائج کا واضح فرق موجود ہوتا ہے۔ تاثرات و نتائج کا یہ فرق معاشرے کی مروجہ اقدار کے سبب سے ہو یا اصناف کے مزاج و اسالیب سے، ناقدین کی یہ بات بہرحال مسلم ہے کہ اشعار کا فرق مراتب صرف اثر کی کمی اور زیادتی پر منحصر ہے۔ (۱۹)

لکھنؤ میں طربیہ عناصر کی خوب آبیاری ہوتی تھی تاہم محرم کا چاند دیکھتے ہی اہل لکھنؤ اپنی زندگی اور معمولات میں یکسر تبدیلی لے آتے تھے۔ طربیہ ماحول پر حزنیہ عناصر کا قبضہ ہو جاتا تھا اور پوری فضا حزن و ملال کی کیفیت میں ڈوب جاتی تھی۔ (۲۰) محرم کی رسومات کا آغاز ہو جاتا تھا جو چالیس روز تک جاری رہتی تھیں۔

مرثیہ کا براہ راست تعلق محرم کی رسومات سے ہے اور یہ ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو رسومات اور فن کے تعلق کو واضح کرتی ہے۔ لکھنؤ کی تہذیبی فضا میں المیہ اور طربیہ دونوں اقسام کے جذبوں کی پیش کش کے لیے دو مختلف اصناف سخن کا استعمال کیا گیا ایک مرثیہ

---

(۱۹) مسعود حسن رضوی 'ہماری شاعری' لکھنؤ: نول کشور، ۱۹۴۲ء ص ۹۹

(۲۰) صفدر حسین ڈاکٹر 'لکھنؤ کی تہذیبی میراث' لاہور: بارگاہ ادب، ۱۹۷۵ء ص ۲۲۱

اور دوسرے ریختی۔ کیونکہ مرثیے کا تعلق محرم کی رسومات سے ہے اس لئے اس کی تمام فضا المیاتی صورت حالات سے رنگی ہوتی ہے بقول ڈاکٹر محمد حسن:

''محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے دور حکومت میں دربار شعر و شباب کی رنگینیوں سے زیادہ مذہبی پرہیز گاری کی طرف رجوع رہا اور اس خشک علمی فضا کی مدد سے اس دور میں مرثیہ نے غزل پر فتح پائی۔ محرم اور دوسری اثناعشری رسوم پوری شان و شوکت سے اس سے بھی زیادہ سنجیدگی کے ساتھ منائی گئیں...... مذہب اور اس کے فرائض و رسوم کی ادائیگی میں مرثیہ خوانی اور دوسرے عناصر نے جگہ پائی جس سے یہ گریہ و ماتم بے روح اور خشک طور پر مذہبی ہونے کے بجائے ایک زندہ اور شاداب تقریب بن گیا''۔ (۲۱)

اگرچہ پورے مرثیے میں ایسے ٹکڑے بھی موجود ہوتے ہیں جو ممدوح کی مدح اور اس کے فضائل سے متعلق ہوتے ہیں اور وہ بھی جن میں فطرت کی اعلیٰ ترین عکاسی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود مجموعی تاثر المیاتی ہی ہوتا ہے۔ مرثیے کو جو عروج لکھنؤ میں ملا اس میں اردو کے روایتی اصناف سخن نے مل جل کر رنگ بھرے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ کا جوہر مرثیے میں شامل ہوا بقول ڈاکٹر محمد حسن:

''مرثیے نے اپنے میں مثنوی کی سادگی اور قصیدے کا شکوہ جذب کر لیا اور چونکہ داستان کی رنگارنگی اور ہمہ گیری ان عناصر کو اپنے اندر سمو سکتی تھی اس لئے مرثیہ ان نئے شاعرانہ جوہروں کے امتزاج سے زیادہ شاداب اور شاندار ہو گیا''۔ (۲۲)

اس طرح جو مرثیہ اردو میں پیدا ہوا وہ اپنے رنگ خاص کے باوصف خالص اودھ

---

(۲۱) ڈاکٹر محمد حسن ''لکھنؤ کا دبستان شاعری اردو زبان اور ہماری ثقافت''، لاہور: تاج بک ڈپو، ۱۹۷۱ء، ص ۳۳۱، ۳۳۲

(۲۲) ڈاکٹر محمد حسن ''لکھنؤ کا دبستان شاعری، اردو زبان اور ہماری ثقافت'' لاہور: تاج بک ڈپو، ۱۹۷۱ء ص ۳۳۳

تہذیب کی دین ہے۔ اسی نکتہ کو پروفیسر اعجاز حسین نے بھی پیش کیا ہے۔ رقمطراز ہیں:

''مرثیہ چونکہ ایک مسلسل نظم ہے اور اس میں وسعت اور تنوع کی بھی کمی نہیں، اسے اجزائے ترکیبی کے مختلف عنوانات کا فائدہ بھی حاصل ہے، اس لئے اس میں دیگر اصناف سخن مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی وغیرہ کی بعض خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں لیکن خاص بات یہ ہے کہ ہر خصوصیت کو مذہب نے ایک دوسرے انداز سے پیش کر دیا ہے۔ حسن و عشق کی روداد میں بھی یہاں تقدس و روحانیت کا غلبہ ہے''۔ (۲۳)

بہر حال یہ شاعری کا فریضہ ہو یا صنف سخن کی ضرورت اسی تقدس اور روحانیت نے مرثیہ کو معراج کمال بخشا۔ بیشتر مرثیہ نگاروں نے اس حزنیہ طرز احساس کی مدح سرائی بھی کی ہے اور حاضرین نے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے:

مہلت جو اجل دے تو غنیمت اسے جانو
آمادہ ہو رونے پہ سعادت اسے جانو
آنسو نکل آئیں تو عبادت اسے جانو
ایذا بھی ہو مجلس میں تو راحت اسے جانو
فاقے کیے ہیں دھوپ میں لب تشنہ رہے ہیں
آقا نے تمہارے لئے کیا ظلم سہے ہیں
(انیس)

اس کے ساتھ ساتھ شعرائے مرثیہ نے اس خاص حزنیہ ماحول کے خاتمے کو نہایت غم انگیز قرار دیا ہے:

اے ماتمیو! شاہ کا ماتم ہوا آخر — روئے نہ دبیر؟ آہ محرم ہوا آخر
لو چہلم سلطان دو عالم ہوا آخر — غم رہ گیا پر غم کا وہ موسم ہوا آخر

---

(۲۳) اعجاز حسین 'مذہب اور شاعری' کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۵، ص ۱۸۰

سر کھول دو اور پھاڑو گریبانوں کو اپنے

اے مومنو! رخصت کرو مہمانوں کو اپنے (دبیر)

اس کے برعکس قصیدے میں شاعر کو ایک طربیہ ماحول پیش کرنا ہوتا ہے۔ حالات کیسے ہی برے کیوں نہ ہوں قصیدہ نگار اس میں سے طربیہ عناصر ڈھونڈ لیتا ہے۔ یہی قصیدہ نگار کا شاعرانہ ہنر ہے۔ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

> ''ممدوح حقیر فقیر پرتقصیر ہی کیوں نہ ہو اس کی مدح میں جو قصیدے کہے جاتے ہیں، ان کے الفاظ اور تراکیب پرشکوہ، تشبیہات اور استعارات پرزور اور شعر کے تیور بڑے تیکھے ہوتے ہیں''۔ (۲۴)

ابھی آپ نے مرثیے کے دو بند پڑھے۔ اب چلتے چلتے قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے اور طربیہ اور المیہ احساسات کا فرق دیکھیے:

تجھ کو خبر نہیں کیا ہے دور شاہ اکبر

رفعت سے پست جس کی شان سکندری ہو

ہے فکر کیا جب ایسا فیاض ہو جہاں میں

اور دل کا اس کے مقصد خود بندہ پروری ہو

مثل سحاب جا کر باندھے ہوا فلک پر

جس پر کہ اس کی چشم الطاف سرسری ہو

(اقتباس: قصیدہ در مدح اکبر شاہ ثانی، ذوق)

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ   اب مآل سعی اسکندر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے   اب فریب طغرل و سنجر کھلا

ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے   دفتر مدح جہان داور کھلا

فکر اچھی پر ستائش ناتمام   عجز اعجاز ستائش گر کھلا

---

(۲۴) ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستان شاعری، لاہور: اردو مرکز، ۱۹۶۷ء طبع ثانی، ص ۱۳۷

جانتا ہوں ہے خط لوح ازل   تم پہ اے خاقان نام آور کھلا

تم کرو صاحب قرانی جب تلک

ہے طلسم روز و شب کا در کھلا

(اقتباس: قصیدہ بہادر شاہ کی مدح میں، غالب)

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ مرثیہ اور قصیدے کی بعض مماثلتیں حیرت انگیز ہیں تاہم یہ دونوں اصناف اپنی نوعیت اور مذاق کے اعتبار سے جداگانہ ہیں۔ اگر آپ بنظر غائر دیکھیں تو محض مرثیہ کے افکار ہی قصیدے سے جدا نہیں ہیں بلکہ ان کا اسلوب بھی ایک دوسرے سے منفرد ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم دونوں اصناف سخن کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کریں اور ایک صنف کے محاسن و نقائص کا دوسری پر انطباق نہ کریں۔ مختصر یہ کہ ہزاروں مماثلتوں کے باوجود قصیدہ قصیدہ ہے اور مرثیہ مرثیہ۔ قصیدہ کا طربیہ لہجہ اور مرثیہ کا المیہ لہجہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کا بنیادی سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔

⌘⌘⌘
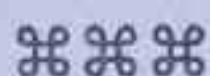
مرزا دبیر...... چند حقائق، چند معروضات

اُردو اصناف شعر میں مرثیہ ایک اہم ہندوستانی صنفِ سخن ہے (۱) اور کسی صورت
میں بھی اس سے قطع نظر کرنا دراصل برصغیر کی ہزار سالہ ہند مسلم تہذیب سے قطع نظر کرنا ہے۔
[یہ] عظیم تہذیب اپنے جلالی اور جمالی دونوں پہلوؤں کو منعکس کرتی ہے اور اصناف ادب میں بھی
[ا]س کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔ اردو غزل، بزمیہ داستانوں اور مثنویوں کو اس

---

(۱)
(i) سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، معروضات، لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۳۳
(ii) نیر مسعود، ڈاکٹر، ''اردو مرثیے کا جدید دور'' مشمولہ جدید فن مرثیہ نگاری، لاہور: مکتبہ تعمیر ادب، ۱۹۶۷ء، ص ۱۷۸
(iii) احسن فاروقی، ڈاکٹر، ''میر انیس کا ایک مرثیہ'' مشمولہ انیس ایک مطالعہ، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۲ء، ص ۵۱۵
(iv) اسد اریب، ڈاکٹر، اردو مرثیے کی سرگزشت، لاہور: کاروان ادب، ۱۹۸۹ء، ص ۷
(v) مسیح الزماں، ڈاکٹر، اردو مرثیے کا ارتقا، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، بار دوم ۱۹۹۲ء، ص ۹
(vi) سفارش حسین رضوی، میر انیس، دہلی، مکتبہ جامعہ، س ـ ن، ص ۹
(vii) فرمان فتحپوری، ڈاکٹر، میر انیس ـ حیات اور شاعری، کراچی، اردو اکیڈمی، ۱۹۷۶ء، ص ۴۴
(viii) وحید الحسن ہاشمی، جدید فن مرثیہ نگاری، لاہور: مکتبہ تعمیر ادب، ۱۹۶۷ء، ص ۲۵۹
(ix) ضمیر اختر نقوی، اردو مرثیہ پاکستان میں، کراچی: سید اینڈ سید، ۱۹۸۲ء، ص ۳۹

ارفع تہذیب کا جمالی مظہر اور رزمیہ مثنویوں، داستانوں اور مرثیہ کو اس کا جلالی اظہار قرار دیا جاسکتا ہے۔

توحید پر ہمارے ایمان نے ہمیں فنون کے ایک خاص وصف سے نوازا ہے اور وہ وصف یہ ہے کہ ہم ایک کو مختلف صورتوں میں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا مضمون خواہ ایک ہی ہو مگر اس کی ادائیگی اور اظہار کے رنگ روپ اور سانچے مختلف اور متنوع ہوتے ہیں۔ انیس کے بقول ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنا ہماری تہذیبی خصوصیت بن جاتی ہے۔ ہمارے کلاسیکی ادب کا بنیادی موضوع خدا، کائنات اور انسان کا باہمی تعلق اور اس کے حوالے سے جنم لینے والے معاملات سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس تعلق میں وجود کے مختلف درجات ہیں جن کا بیان مختلف سطحوں سے ادب و شعر میں ہوتا ہے۔

واقعہ کربلا بندے اور خدا کے مابین تعلق، خیر و شر کی آویزش، حق و باطل کی کشمکش اور انسان کے درمیان معاشرتی تعلقات کی اعلیٰ ترین علامت ہے۔ (۲) یہ علامت عمودی اور افقی دونوں سطحوں پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔ افقی سطح پر اس کا تعلق انسانی زندگی اور زندگی کے معاشرتی پہلوؤں سے ہے اور عمودی سطح پر یہ بندے کا تعلق خدا سے قائم کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسی بات کو یوں کہہ لیجئے کہ واقعہ کربلا عمودی سطح پر تو ایک علامت بن کر ہمارے سامنے آتا ہے جبکہ افقی سطح پر یہ ایک درس عمل ہے جو لوگوں کو اعلیٰ تر اخلاقیات کی تلقین کرتا ہے اور صراط مستقیم سے بھٹکے ہوؤں کو راہ راست پر لانے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ (۳)

ایک جانب واقعۂ کربلا کی درد انگیزی، ہولناکی اور دوسری جانب صبر و رضا، ایثار اور قربانی نے مل جل کر مجموعی طور پر ایک ایسی فضا تیار کی کہ ہر عہد کا شاعر اس سے متاثر ہوا اور اس نے اس واقعہ کے مختلف افقی اور عمودی پہلوؤں کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ یہی سبب ہے کہ ابتدائی دور شاعری سے لے کر آج تک صنف مرثیہ میں اعلیٰ ترین شعری کاوشیں دکھائی

---

(۲) گوپی چند نارنگ' سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ' لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز' ۱۹۹۱ء' ص ۱۸

(۳) سجاد باقر رضوی' ڈاکٹر' معروضات' لاہور: یونیورسل پبلی کیشن' ۱۹۸۸ء' ص ۳۴

دیتی ہیں۔ (۴) تاہم تہذیبی وابستگی کی وجہ سے اس صنف کا قوت و توانائی سے اظہار اسی وقت ممکن ہو سکا جب اسلامی تہذیب اپنے عروج پر دکھائی دینے لگی اور یہی تہذیبی عروج مختلف تہذیبی عوامل کے ذریعے مرثیے میں بھی ظاہر ہوا۔

ہندوستان کی تہذیبی و تاریخی صورت حال میں وقتاً فوقتاً جو تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں ان کا اثر کسی نہ کسی حوالے سے اُردو مرثیے پر بھی پڑا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر اہم تاریخی موڑ پر آپ کو مرثیے میں داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر تبدیلیوں کا احساس ہوگا۔ یہ تبدیلیاں خود اس بات کی غماض ہیں کہ ایک تو مرثیے میں عصری میلانات کو اپنے اندر سمونے اور پیش کرنے کی گنجائش موجود ہے اور دوسرے اس صنف میں دیگر اصناف کے شانہ بشانہ آگے سفر جاری رکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ مرثیے کا یہ سفر کئی صدیوں سے جاری ہے اور آج بھی اس صنف کو عوام الناس میں پہلے کی طرح مقبولیت حاصل ہے۔ (۵)

مرثیہ ہندوستانی تہذیب کی ایک نمائندہ صنفِ سخن ہے اور اس کا تعلق کسی دوسری تہذیب سے جوڑنا ادبی ناانصافی ہے۔ مرثیے کی صدیوں پھیلی ہوئی تاریخ کے پس منظر میں اس سوال کا کھوج لگانا سخت مشکل ہے کہ اردو مرثیے کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟؟ عام طور پر ناقدین ادب نے اس حوالے سے جزوی مباحث تو پیش کیے ہیں لیکن کسی حتمی نتیجہ پر پہنچنا ان کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اردو مرثیے کو بام عروج تک پہنچانے والوں میں انیس و دبیر سرفہرست ہیں اور اسی باعث انہیں اردو مرثیے کے مہر و ماہ بھی قرار دیا جاتا ہے تاہم سنجیدہ فکر ناقدین اب بھی اس بات پر مصر ہیں کہ اردو مرثیے کو حقیقی سطح پر معتبر بنانے اور اسے بامِ عروج تک پہنچانے میں میرزا سلامت علی دبیرؔ کو میر ببر علی انیس پر بھی

---

(۴) (ا) سفارش حسین رضوی 'اردو مرثیہ' دہلی: مکتبہ جامعہ ۱۹۶۵ء ص ۱۱

(ب) طاہر حسین کاظمی' ڈاکٹر 'اردو مرثیہ۔ میر انیس کے بعد' دہلی: ایرانین آرٹ پرنٹرز' ۱۹۹۷ء ص پیش لفظ

(۵) وحید الحسن ہاشمی' جدید فن مرثیہ نگاری' لاہور: مکتبہ تعمیر ادب' ۱۹۶۷ء ص ۲۶۱

فوقیت حاصل ہے(۶) حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ تمام تعصبات کو بالائے طاق رکھ دیں تو تاریخی طور پر یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ انیس نے دبیر کی شعری مشعل سے اپنے چراغ مرثیہ کو روشن کیا ہے۔

اب تو یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ مرزا سلامت علی دبیرؔ نے دوسرے ہم عصر شعرا کی نسبت مرثیہ کی صنف کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی (۷) اور اپنے افکار عالیات کے ذریعہ اس صنف میں وقار و تمکنت پیدا کی۔ آپ دبیر کے مرثیوں کا مطالعہ کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ جہاں دبیر نے افکار دقیق پیش کیے ہیں وہاں زبان سہل اختیار کی ہے اور جہاں موضوع سہل برتا ہے وہاں کجکلاہ زبان سے مرثیہ کی شان و شوکت میں اضافہ کیا ہے۔ دبیرؔ نے مرثیہ کا معیار محض اس لیے بلند کیا ہے کہ وقار مرثیہ کم نہ ہونے پائے اور مرثیہ صنف غزل کی طرح بچوں کا کھلونا نہ بن جائے۔

عام طور پر قارئین و ناقدین میں یہ مغالطہ عام ہے کہ مرزا دبیر کی صناعانہ شاعری کے جوہر صرف مرثیے میں ظاہر ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دبیر نے غزل، قصیدہ، مثنوی، سلام، نوحہ، رباعی، قطعہ و دیگر اصناف شعر میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔(۸) تاہم انہیں بخوبی احساس

---

(۶) درج ذیل ناقدین انیس کی نسبت مرزا دبیر کی فکری و فنی عظمت کے زیادہ قائل ہیں:

(i) ظہیر فتحپوری، ڈاکٹر، منتخب مراثی دبیر، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء

(ii) سفارش حسین رضوی، اردو مرثیہ، دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۶۵ء

(iii) سید ارؤف عروج، اردو مرثیے کے پانچ سو سال، کراچی: شارق پبلی کیشنز، س۔ن

(iv) مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، اردو مرثیے میں میرزا دبیر کا مقام، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۷۶ء

(v) مرزا محمد زماں آزردہ، مرزا سلامت علی دبیر۔ حیات و کارنامے، دہلی: جے کے آفسٹ پریس، بار دوم ۱۹۸۵ء

(vi) اسد اریب، ڈاکٹر، اردو مرثیے کی سرگزشت، لاہور: کاروان ادب ۱۹۸۹ء

(۷) ثابت لکھنوی، سید افضل حسین، حیات دبیر، لاہور: سیوک سٹیم پریس، ۱۹۲۳ء، ص ۳۸۵

(۸) صفدر حسین سید، ڈاکٹر، نادرات مرزا دبیر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء، ص ۱۰ تا ۱۲

تھا کہ ان تمام اصناف کا جوہر مرثیے میں موجزن ہے۔ یہی سبب ہے کہ آپ کو دبیر کے مرثیوں میں غزل کی ایمائیت' قصیدہ کا طنطنہ' مثنوی کا پھیلاؤ' سلام کا حزن' نوحہ کا ملال' قطعہ کا ایجاز اور رباعی کی عارفانہ گہرائی مل جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ ان متنوع اصناف کے جملہ محاسن سمٹتے ہیں تو دبیر کے مرثیے بن جاتے ہیں۔ یہی نہیں کہ دبیر نے محض شاعری میں اپنے افکار پیش کیے ان کی نثری تخلیقات بھی بے پناہ خصوصیات کی حامل ہیں۔ گویا دبیر کا طائر فکر' افلاک نثر و شعر کی جانب پرواز کرتا ہے۔(۹) ضرورت اس امر کی ہے کہ ناقدین دبیر کی ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تخلیقات کا ایک مرتبہ مجموعی احاطہ کریں اور اس بے مثال تخلیق کار کے مقام کا بار دگر تعین کریں۔(۱۰)

مرزا دبیر ایک زرخیز ذہن کے مالک تھے۔(۱۱) انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو مجتمع کر کے صنف مرثیہ کی آبیاری پر زور قلم صرف کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ ''یک گیر و محکم گیر'' کا اصول نہ اپناتے تو شاید ان کا مقام اتنا دقیع نہ ہوتا۔ اس موقع پر ایک اور غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ دبیر کی تمام شہرت انیس کی مرہون منت ہے(۱۲) یہ فکر لغو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دبیر اردو کا وہ پہلا مرثیہ نگار ہے جو اپنے عہد میں عالم گیر شہرت و حیثیت کا حامل ہو گیا تھا۔ بادشاہ وقت سے لے کر ایک عام انسان تک سب مرزا دبیر کی دل و جان سے قدر کرتے تھے۔(۱۳) ملکی سطح پر دلی اور لکھنؤ میں تو دبیر کا طوطی بولتا ہی تھا۔ کلکتہ' سندھ' پنجاب اور کابل و کشمیر کے ساتھ ساتھ مکہ' مدینہ اور نجف و کاظمین میں بھی مرزا دبیر کے

---

(۹) اکبر حیدری' ڈاکٹر' انتخاب مراثی مرزا دبیر' لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی' ۱۹۸۰ء' ص ۸

(۱۰) کاظم علی خان ''مرزا دبیر کے غیر مطبوعہ مراثی۔ بعض غلط فہمیوں کا ازالہ'' مشمولہ اردو مرثیہ (مرتبہ: ڈاکٹر شارب ردولوی) دہلی: اردو اکادمی' ۱۹۹۱ء' ص ۳۹۹

(۱۱) اسد اریب' ڈاکٹر' اردو مرثیے کی سرگزشت' لاہور: کاروان ادب ۱۹۸۹ء' ص ۶۵

(۱۲) ابو اللیث صدیقی' ڈاکٹر' لکھنؤ کا دبستان شاعری' کراچی: غضنفر اکیڈمی' طبع چہارم' ۱۹۸۷ء' ص ۶۳

(۱۳) ظہیر فتحپوری' ڈاکٹر' منتخب مراثی دبیر' لاہور: مجلس ترقی ادب' ۱۹۸۰ء' ص ۹

مراثی ذوق وشوق سے پڑھے اور سنے جاتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ لندن میں بھی دبیر کے مداحین موجود تھے۔ (۱۴) اصل بات یہ تھی دبیر کے مراثی ندرتِ افکار اور شائستہ اسلوب کے باوصف عوام وخواص میں مقبول تھے۔ مرزا دبیر بھی اس حقیقت کو جانتے تھے کہ وہ روایت شناس ہی نہیں روایت ساز بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے مرثیوں کے چہروں میں اپنی جدت فکر اور طبع رواں پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ بھی سنیے کہ دبیر اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں:

کہتا ہے سخن حضرت استاد ہمیشہ　　مضمون نئے کرتا ہوں میں ایجاد ہمیشہ
بھولے سے بتا دوں تو رہے یاد ہمیشہ　　کہنے میں ہے تاثیر خداداد ہمیشہ
بے لطف خدا یہ ہمہ دانی نہیں آتی
پر شمع صفت، چرب زبانی نہیں آتی

میں معرکے میں رستم میدان سخن ہوں　　میں بلبل خوش لہجۂ بستان سخن ہوں
ایمان سخن، دین سخن، جان سخن ہوں　　میں وارثِ اورنگ سلیمان سخن ہوں
عاجز ہوں کہ بندہ ہوں پر اعجاز بیاں ہوں
سر تا بہ قدم ہیچ ہوں لیکن ہمہ داں ہوں

مضمون جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کر آئے　　حامی جو سلیمانِ دو عالم نظر آئے
شیشے میں پری زاد معانی اتر آئے　　طاؤسِ تصور کی طرح دل میں در آئے
یاقوت بدخشاں سے، در آتے ہیں عدن سے
لعل اگلوں گا میں طوطیِ سدرہ کے دہن سے

جبریل کو وحی اور یہ سخن ہم کو مبارک　　مداحی سلطان زمن ہم کو مبارک
موتی کو صدف اور یہ عدن ہم کو مبارک　　رضواں کو بہشت اور یہ چمن ہم کو مبارک

---

(۱۴) (ا) اکبر حیدری، ڈاکٹر: انتخاب مراثی مرزا دبیر، لکھنؤ: اتر پردیش اکاڈمی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۱
(ب) ضمیر اختر نقوی: اردو مرثیہ پاکستان میں، کراچی: سید اینڈ سید، ۱۹۸۲ء، ص ۹۱

شہرہ ہے یہ تائید شہ جن و ملک سے
مضموں مرا گھر پوچھتے آتے ہیں فلک سے

اردو کے کم و بیش تمام ناقدین اس امر پر متفق ہیں کہ مولوی شبلی نعمانی نے ''موزانہ انیسؔ و دبیرؔ'' میں انیس کے مقام و مرتبہ کو بلند کرنے کے لیے دبیرؔ کے کم اہم اشعار نقل کیے ہیں۔(۱۵) میری دانست میں یہ اعتراض محل نظر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمام علمی صلاحیت کے باوجود شبلی نعمانی میں ''دبیر فہمی'' کی صلاحیت ہی موجود نہیں تھی (۱۶) یہی سبب ہے کہ شبلی نعمانی نے انیسؔ و دبیر دونوں کے محض سطحی اور سامنے کے اشعار پیش کر کے من گھڑت نتائج پیش کر دیئے ہیں۔ میرا موقف یہ ہے کہ شبلی نے انیسؔ و دبیر دونوں کے مراثی کا کلی طور پر مطالعہ ہی نہیں کیا تھا ورنہ وہ نظیر الحسن فوق کی المیزان کی اشاعت پر ایک مکتوب میں یہ نہ ارقام فرماتے کہ

''آج مجھ کو موازنہ کی قدر ہوئی کیونکہ اس بہانے اردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا اور ایک باکمال کے جوہر اچھی طرح کھلے''۔(۱۷)

مولوی شبلی بلاشبہ باکمال دبیر کے مخفی جوہروں سے تو پردہ نہ اٹھا سکے لیکن میرے نزدیک ان کا

---

(۱۵) اردو کے بیشتر دردمند ناقدین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ شبلی نعمانی نے طے شدہ نتائج کے مطابق دبیرؔ کو انیس سے کم تر ثابت کرنے کی شعوری جد و جہد کی ہے اور یہ ادبی بد دیانتی ہے۔

(i) ظہیر فتحپوری' ڈاکٹر' منتخب مراثی دبیر' لاہور: مجلس ترقی ادب' ۱۹۸۰ء

(ii) اسد اریب' ڈاکٹر' اردو مرثیے کی سرگزشت' لاہور: کاروانِ ادب' ۱۹۸۹ء

(iii) ابواللیث صدیقی' ڈاکٹر' لکھنؤ کا دبستانِ شاعری' کراچی: غضنفر اکیڈمی' طبع چہارم' ۱۹۸۷ء

(iv) عبدالرؤف عروج' اردو مرثیے کے پانچ سو سال' کراچی: شارق پریس' س۔ن

(v) مسیح الزمان' ڈاکٹر' اردو مرثیے کا ارتقاء' لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکاڈمی' بار دوم ۱۹۹۲ء

(vi) حامد حسن قادری' مختصر تاریخ مرثیہ گوئی' کراچی: اردو اکیڈمی سندھ' ۱۹۶۲ء' ص ۱۰۷

(۱۶) فراق گورکھپوری'' کلام دبیر'' لکھنؤ: ادارہ یادگار دبیرؔ' ۱۹۶۵ء' ص ۳۶

(۱۷) نظیر الحسن فوق' المیزان' علی گڑھ: فیض عام' ۱۹۱۴ء

کارنامۂ خاص یہ ضرور ہے کہ انہوں نے انیس کے توسط سے دبیرؔ کا ذکر کر کے انہیں موضوع بحث بنا دیا۔(۱۸) ورنہ یقین واثق ہے کہ یہ کمزور حافظے والے مسلمان ناقدین ہیں۔ آج یقیناً مرزا دبیرؔ کو بھول چکے ہوتے۔ ایک بات البتہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ مولوی شبلی عمر بھر تو بلاغت کی مدح سرائی کرتے رہے اور انہوں نے اپنے نظام تنقید کی بنیاد بھی بلاغت پر رکھی تھی لیکن عملی تنقید میں انہوں نے بلاغت کے نمائندے دبیر کو چھوڑ کر فصاحت کے علمبردار انیس کو فوقیت کیوں دی......؟؟

اُردو تنقید میں انیس و دبیر کا موازنہ عام ہے۔ ناقدین نے انیس و دبیر کی مماثلتیں اور اختلافات تلاش کر کے نئے نئے نکات وضع کر لیے ہیں۔ اس صورت حال میں دونوں شعرا کے افکار و اسالیب کا موازنہ کیا جاتا ہے اور طے شدہ حتمی نتائج پیش کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ طریقۂ کار معروضی نہ ہونے کے باعث اپنی اہمیت اور افادیت کھو بیٹھا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب ہم ان دونوں شعرا کو نئے حالات و واقعات کے پس منظر میں دیکھیں اور ان کے کلام کے نئے رُخوں کو اُجاگر کرنے کی سعی کریں۔(۱۹) اگر ہم نے موازنے کے سابقہ معیارات کو پیش نظر رکھا تو یہ ادبی بددیانتی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں مرثیہ نگار اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف المزاج ہیں۔ انیس کے دل میں کربلا بسی ہوئی ہے جبکہ دبیرؔ کے دماغ میں۔ یہی سبب ہے کہ انیس ہندوستان میں بیٹھ کر دل کے آئینے میں کربلا کے تمام مناظر کو دیکھتے اور اپنے قارئین کو دکھاتے ہیں جبکہ دبیر ذہنی توانائی برتتے ہوئے واقعہ کربلا کو عقلی و معروضی سطح پر پیش کرتے ہیں۔ یہی دونوں کیفیتیں ان کے اسالیب میں بھی جلوہ گر ہیں۔ دبیر کے کلام میں دماغ سوزی کے باعث سنجیدگی' بردباری' ثقاہت' متانت اور تعقل پسندی کے عناصر جلوہ گر ہو کر ان کے کلام کو دقیق بنا دیتے ہیں۔(۲۰) میرے نزدیک دبیر کا سب سے بڑا

---

(۱۸) ہلال نقوی' ڈاکٹر' بیسویں صدی اور جدید مرثیہ' کراچی: محمدی ٹرسٹ' ۱۹۹۴ء' ص ۶۴

(۱۹) مسیح الزماں' ڈاکٹر' اردو مرثیے کا ارتقاء' لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکاڈمی' بار دوم ۱۹۹۲ء' ص ۳۷۷

(۲۰) ہلال نقوی' ڈاکٹر' بیسویں صدی اور جدید مرثیہ' کراچی: محمدی ٹرسٹ' ۱۹۹۴ء' ص ۶۵

کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسے دور میں اردو مرثیے کو اپنے منطقی استدلال، فلسفیانہ افکار، اعلیٰ تر دلائل و براہین اور ثقہ اسلوب سے دقیق بنایا۔ (۲۱) جب ایک گروہ اس صنف شعر کو سبک کرنے میں مصروف تھا۔ یہ بات صرف میری ذہنی اختراع نہیں دبیر بھی اس صورت حال کو سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک مرثیے کے صرف دو بند ملاحظہ فرمائیے۔

سحبان بہ مرا طفل دبستان سخن ہے
ثابت ہے کہ حسان ثنا خوان سخن ہے
آئندہ جسے کچھ سروسامان سخن ہے
آئے یہی گو ہے یہی میدان سخن ہے

کس طرز کی رونق ہو اس انداز کے آگے
جادو کہیں چل سکتا ہے اعجاز کے آگے

کب شعلۂ خس نور کی قندیل کو پہنچے
اڑ کر نہ مگس طنطنۂ فیل کو پہنچے
پشہ کا نہ غل صورِ سرافیلؑ کو پہنچے
بلبل نہ لب و لہجہ جبریلؑ کو پہنچے

ہم ہیں وہ سخن ور کہ سخن ور ہے ہمارا
القاب سخن سنج سخن ور ہے ہمارا

انیس و دبیر کے مراثی اپنے مزاج اور کیفیت کے لحاظ سے بھی منفرد ہیں۔ انیس نے ہندوستانی تہذیب و مظاہر فطرت کے ذریعہ کرب و بلا کے مناظر کو اُجاگر کیا ہے جبکہ دبیرؔ فطرت سے بلند ہو کر فلسفیانہ سطح پر کرب و بلا کے مناظر پیش کرتے ہیں۔ انیس کی شاعری کا دروازہ باغ فطرت کی جانب کھلتا ہے جبکہ دبیرؔ کا تخیل ہفت آسمان کی سیر کرتا ہے۔ انیس کا کمال یہ ہے کہ وہ ان دو آنکھوں سے جو دیکھتے ہیں وہ اپنے قارئین و سامعین کو بھی دکھا دیتے ہیں جبکہ دبیرؔ چشم

---

(۲۱) آغا سہیل، ڈاکٹر، ادب اور عصری حسیت، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء، ص ۳۷

معرفت سے کائنات کو دیکھتے ہیں اور ان کے ارفع مناظر دیکھنے کے لیے چشم معانی آشنا کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دونوں کے اسالیب میں بھی بعد المشرقین ہے۔ انیس سادہ بیانی سے بات کرنے کے عادی ہیں جبکہ دبیر کی شاعری فلسفیانہ توجیہات اور علمی موشگافیوں کے باعث عام قارئین کے لیے دقیق بن جاتی ہے۔ انیس و دبیر کی زبان میں وہی فرق ہے جو میر امن دہلوی کی باغ و بہار اور رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب میں ہے۔ اگر میر انیس اپنی سادہ بیانی اور فصاحت کے باعث حیات جاوید پائیں گے تو میرزا دبیر دقیق طرز اور بلاغت کے باوصف شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ پانے کے حقدار ہوں گے۔ (۲۲)

دانشمندوں کا کہنا ہے کہ انسانی زندگی غم ونشاط سے عبارت ہے۔ انسان کی زندگی میں مجموعی طور پر غم کی فراوانی ہوتی ہے لہٰذا وہ حزنیہ ماحول میں عمر بسر کر دیتا ہے۔ دبیر اس حقیقت سے آگاہ تھے۔ ایک تو واقعہ کربلا کی ہولناکی اور درد انگیزی اور دوسری جانب شاعر کا الم انگیز لب ولہجہ دونوں نے مل کر دبیر کے مرثیوں میں غم واندوہ کی ایسی کسک پیدا کر دی ہے جس کی آنچ سے آج بھی قارئین کے دل سلگ اُٹھتے ہیں۔ مرزا دبیر اپنے مرثیوں میں ملال انگیز فضا پیدا کرنے کے لیے کئی طریقے اور حربے اختیار کرتے ہیں۔ کہیں وہ مظلوم کرداروں کے اعمال وحرکات سے غم کی کیفیت ابھارتے ہیں' کہیں ظالموں کے مظالم پیش کر کے گریہ کا سامان فراہم کرتے ہیں کہیں وہ درد انگیز مکالمات کے ذریعہ حزن وملال اُجاگر کرتے ہیں اور جہاں انہیں موقع ملتا ہے وہ غم انگیز الفاظ کے استعمال سے فغاں کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد سے لے کر ڈاکٹر ظہیر فتح پوری تک تمام ناقدین بکائیہ کیفیات میں دبیر کو دوسرے تمام مرثیہ نگاروں پر فوقیت دیتے ہیں۔ (۲۳)

اب آپ مرزا دبیر کے صرف تین حزنیہ بند پڑھیے اور درج بالا نکات کی تصدیق

---

(۲۲) ابواللیث صدیقی' ڈاکٹر' لکھنؤ کا دبستان شاعری' کراچی: غضنفر اکیڈمی' طبع چہارم' ۱۹۸۷ء' ص ۶۲۷

(۲۳) (ا) محمد حسین آزاد' آب حیات' لاہور' آزاد بکڈپو' ۱۹۰۷ء' ص ۵۲۷

(ب) ظہیر فتح پوری' ڈاکٹر' منتخب مراثی دبیر' لاہور: مجلس ترقی ادب' ۱۹۸۰ء' ص ۳۲

فرمایئے۔

یاں بانوئے حزیں نے یہ لاشوں پہ کی فغاں　　ان کی کوئی بہن نہیں ہووے جو نوحہ خواں
بہنوں کی طرح روئیں انہیں میری بیٹیاں　　قاسمؑ کی ماں کو دیکھ کے پھر یہ کیا بیاں
گزری ہے ایک رات فقط بیاہ ہونے کو
اپنی بہو کو بھیجو گی لاشوں پہ رونے کو؟

....

کیا ہو گئی بھیا تری دستار گلابی　　پرزے کیا اُمت نے ترا روئے کتابی
تر خوں میں ہوئی ہائے تری ریش خضابی　　کیسی ترے کنبے کی ہوئی خانہ خرابی
میں کہتی تھی میرا کفن و گور کرو گے
اس کی نہ خبر تھی کہ تمہیں پہلے مرو گے

....

مرکب کے ساتھ ساتھ چلے شاہ دیں پناہؑ　　اک روشنی زمیں پہ ملی درمیانِ راہ
دیکھا کہ نیزہ سینے میں ہے اک جواں کے آہ　　منہ لا کے منہ کے پاس شہؑ دیں نے کی نگاہ
بسمل نے پوچھا کیا مرے بابا حسینؑ ہو
یہ بولے کیا حسینؑ کے تم نور عین ہو

ناقدین نے اگرچہ مرثیے کے اجزا کا تعین کرتے ہوئے شہادت اور بین کو اہمیت دی ہے تاہم مرزا دبیر کے بیشتر مرثیے ایسے ہیں جن کی مجموعی فضا ہی غم انگیز ہے اور بعض مرثیے تو ایسے ہیں جن کا آغاز ہی بکائیہ انداز میں ہوتا ہے۔ دراصل میرزا دبیر مرثیے میں "مرثیت" (۲۴) کو دوسرے اجزا پر فوقیت دیتے تھے غالباً میرزا دبیر کے الم انگیز مرثیوں کے مطالعہ کے بعد ہی انیس نے تمام مرثیہ نگاروں کو یہ تلقین کی تھی کہ ع

مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

---

(۲۴)　وحید الحسن ہاشمی، سید 'تنقیدی جہتیں' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص ۳۷

تمام ناقدین اس امر پر متفق ہیں کہ میرزا دبیر کے کلام میں جو درد والم کی کیفیات موجزن ہیں وہ انہی سے مختص ہیں۔ ان کے تمام مرثیوں میں عموماً اور مرثیوں کے آخری بندوں میں خصوصاً بکائیہ رنگ غالب رہتا ہے۔ آپ مرثیوں کے دعائیہ بندوں کا مطالعہ فرمائیے تو آپ دیکھیں گے کہ میرزا دبیرؔ نہ تو دنیاوی دولت کی ہوس کرتے ہیں اور نہ معاشرتی جاہ ومرتبہ کے طلب گار نظر آتے ہیں۔ وہ تو آلام روزگار کو بھی غم حسینؑ کے ذریعہ آسان بنانے کے متمنی ہیں۔

گزشتہ صفحات میں آپ نے میرزا دبیرؔ کے چند الم انگیز بندوں کا مطالعہ فرمایا ہے۔ اب راقم الحروف کی خواہش ہے کہ میں ان کے مرثیے کے چند مسلسل بند آپ کی خدمت میں پیش کرے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ غم والم کے کتنے دریا ہیں دبیر کے مرثیوں میں موجزن ہیں۔ یہ بند شہادت حضرت علی اصغرؑ کے حوالے سے ہیں:

ہاتھوں پہ اس کو لے کے چلے شاہ کربلاؑ — اور ساتھ ساتھ گود کو کھولے ہوئے قضا
لکھا ہے دھوپ تیز تھی اور گرم تھی ہوا — اصغرؑ پہ ماں نے ڈال دی اُجلی سی اک ردا
چادر نہ تھی وہ چہرۂ پرآب و تاب پر
ٹکڑا سفید ابر کا تھا آفتاب پر

....

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفیؐ — لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہوں گا کیا؟
پانی کے واسطے نہ کروں گا میں التجا — منت کروں گا بھی تو سنیں گے نہ اشقیا
کم ظرف سنگ دل ہیں کہاں رحم کھائیں گے
مجھ کو یقیں نہیں ہے کہ پانی پلائیں گے

....

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے — چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے — چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے

آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

ماں نے بہت گلے سے لگایا نہ چپ ہوئے
بہنوں نے گودیوں میں کھلایا نہ چپ ہوئے
گہوارے میں پھوپی نے جھلایا نہ چپ ہوئے
رو رو کے سارے گھر کو رُلایا نہ چپ ہوئے
واں اشک بار تھے تو یہاں بے قرار ہیں
پانی کے تم سبھوں سے یہ اُمیدوار ہیں

....

گر میں بقول عمر و شمر ہوں گناہ گار
یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصور وار
شش ماہہ، بے زبان، نبیؐ زادہ، شیر خوار
ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بے قرار
سن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

....

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر
رو کر کہا جو کہنا تھا سو کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر
سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اس نورِ عینؑ نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے
مولا فلک کو دیکھ رہے تھے کہ ناگہاں
لی حرملہ نے سامنے سے دو تا نک کی کماں
ترکش سے چن کے کھینچ لیا تیر جاں ستاں
جوڑا کماں میں تاک کے حلقوم بے زباں
چھٹتے ہی حلق بچے کا چھیدا جو تیر نے
گھبرا کے غش سے کھول دیں آنکھیں صغیرؑ نے (۲۵)

---

(۲۵) منظر عباس نقوی، مرثیے کی لسانی اہمیت، مشمولہ اردو مرثیہ مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی، دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۹۵

یہ اور اسی قبیل کے سینکڑوں بند ہیں جو مرزا دبیر کی منظر و محاکات نگاری کے حوالے سے بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں تاہم قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ دبیرؔ نہایت سلیقے سے حزن و ملال کی کیفیت کو اُجاگر کرنے کی سعی کرتے ہیں اور صورتِ حال کو پر درد الفاظ کے استعمال سے مزید الم ناک بنا دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک دبیر کی یہ وہ صفت ہے جو اسے دوسرے مرثیہ نگاروں سے ممتاز بنا دیتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرزا دبیرؔ نے اپنے مرثیوں میں درد و غم کو اتنے تواتر اور کثرت کے ساتھ کیوں پیش کیا ہے......؟؟؟ کیا یہ محض مرثیہ میں رثائیت پیدا کرنے کی شعوری کوشش تھی یا اس کے پس پردہ کچھ اور محرکات بھی ہیں۔ ہمارے نزدیک مرزا دبیر کا سارا کلام درد و غم و آلام سے پر ہے اور یہی چیز انہیں دوسرے مرثیہ نگاروں سے منفرد بھی بناتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مرزا دبیرؔ نے اپنے مرثیوں میں حزنیہ رنگ پیدا کرنے کے تمام حربے شعوری طور پر استعمال کیے ہیں۔ اگر ایک جانب انہوں نے مناظر و محاکات کے ذریعہ غم کی کیفیات اُجاگر کی ہیں تو دوسری جانب صورتِ حالات اور الفاظ کے ذریعہ غم انگیز فضا تخلیق کر دی ہے۔ آیئے ان اسباب کا سراغ لگاتے ہیں جو مرزا دبیر کے مرثیوں میں درد و غم پیدا کرنے کا موجب بنے۔ ہمارے خیال میں اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ مرزا دبیرؔ کربلا کے غم کو آفاقی سطح پر دیکھنے اور دکھانے کے متمنی تھے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ کرب و بلا کی غم انگیزی کائنات کے رگ و پے میں جاری و ساری ہو جائے۔ اپنے مرثیوں کو غم و الم کا خوگر بنا کر وہ کائنات کے وجود میں غم حسینؑ کا نشہ سمونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مرزا دبیر ذاتی غم کو آفاقی غم میں گھلا ملا دینا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہم اپنے بڑے سے بڑے غم کو بھی غم حسینؑ کے پس منظر میں دیکھیں گے تو اس کی حیثیت ثانوی رہ جائے گی۔ دبیرؔ کی زندگی کا مطالعہ ہمیں احساس دلاتا ہے کہ انہوں نے ہر قسم کا غم جھیل لیا لیکن کبھی اُف تک نہ کی۔ دبیر کی زندگی میں یہ صبر و رضا اور استغنا غم حسینؑ کی دین ہے۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ مرزا دبیر جانتے تھے کہ جس طرح محبت کی انتہا نفرت قرار پاتی ہے اسی طرح غم کی انتہا طرب ہے۔ گویا مرزا دبیرؔ غم حسینؑ میں اس

لیے محو رہتے تھے کہ انہیں خبر تھی کہ دنیا و آخرت میں غم حسین کا انجام خوشی و طرب کے سوا کچھ نہیں۔ان کے مرثیہ کا یہ بند ہمارے موقف کی تائید کرے گا۔

دبیر خستہ قلم روک، دل تھوا افگار　　دعا یہ مانگ خدا سے بہ دیدۂ خونبار
بہ حق احمدؐ مختار و حیدرؑ کرار　　بہ حق شبرؑ و شبیرؑ فاطمہؑ اطہار
نہ کوئی رنج میں آفاق میں سہوں یارب
حسینؑ امام کی برکت سے خوش رہوں یارب

چوتھا سبب یہ تھا کہ مرزا دبیر کا عہد طرح طرح کے مسائل و مصائب کا شکار تھا۔لوگ طرح طرح کے مسائل میں گرفتار تھے اور حالات کی تبدیلی کے لیے روز و شب دعا گو تھے۔مرزا دبیر نے معاشرے کے ان الم انگیز حالات و واقعات کو اپنے مرثیوں میں محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجے کہ دبیر کے مرثیوں میں اس کا پورا عہد محفوظ ہے اور غم والم کی وہ کیفیات جو اس معاشرے میں موجزن تھیں مرزا دبیر نے انہیں مرثیوں کے ذریعہ اُبھارنے اور پیش کرنے کی بلیغ سعی کی۔ پانچواں سبب یہ تھا کہ دبیر اس راز سے باخبر تھے کہ رونے دھونے سے ''تسکین'' کا ایک پہلو بھی نکلتا ہے۔لہٰذا اپنے مرثیوں میں رقت انگیز مناظر سمو کر وہ اپنے سامعین و قارئین کی ''تسکین'' کا سامان فراہم کرتے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ دبیر کے مرثیے پڑھ کر ہر دردمند انسان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں اور پھر قاری تھوڑی دیر کے بعد پرسکون ہو جاتا ہے۔گویا دبیر کے خیال میں سکون و تسکین کے متلاشی کو مرثیوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ چھٹا سبب یہ ہے کہ اگر مرثیہ درد و غم کی باتوں سے خالی ہو جائے تو وہ کسی ''کام'' کا نہیں رہتا۔اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مرثیہ کے آخر میں مرثیہ نگار مآل کار کا اہتمام کرتا ہے۔وہ خود بھی مثاب ہوتا ہے اور قارئین کو بھی مثاب کرتا ہے۔مرزا دبیر اپنے مرثیوں میں غم حسینؑ کی دولت اس لیے نچھاور کرتے تھے کہ ان کے حاضرین آنسوؤں کے موتیوں سے اپنا دامن اُمید بھر لیں۔ظاہر ہے کہ جن اشکوں کا مقدر رومال فاطمہؑ بن جائے ان کی قدر و قیمت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے......؟؟؟

آپ درج بالا نکات کا ایک مرتبہ مطالعہ فرما لیجئے اور پھر مرزا دبیر کے مختلف مرثیوں
کے درج ذیل بندوں کا مطالعہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ پیش کردہ وہ تمام نکات و اسباب
مرثیے کے ان بندوں میں موجزن و متحرک ہیں۔

حضرت عباسؑ علمدار کی شہادت کے بعد ایک منظر ملاحظہ فرمائیے:

تب رو کے یہ کی زوجہ عباسؑ نے تقریر　　اے بیبیو! تم میں تو نہیں بانوئے شبیرؑ
سایہ نہ پڑے اس پہ مرا اب کسی تدبیر　　جیویں صد وہی سال شہؑ بیکس و دلگیر
صد شکر کہ شوہر ہوا سرورؑ پہ تصدق
اولاد مری اکبرؑ و اصغرؑ پہ تصدق

....

روتی تھی بہت حضرت عباسؑ کی دختر　　فرمایا سکینہؑ نے بہن میرا مقدر
آیا ہے یہ غم دونوں کے حصے میں برابر　　تو منہ پہ مرے خاک لگا میں ترے منہ
آفت میں گرفتار ہیں، محبوس بلا ہیں
عباسؑ علمدار کے ہم اہل عزا ہیں

....

جب خاکِ عزا دونوں نے ماتھے پہ لگائی　　اور ہائے علمدارؑ کہا دھوم مچائی
حضرتؑ کو مگر دیکھ کے واں تاب نہ آئی　　آخر چلے میداں کو شہِؑ کرب و بلائی
طاقت نہ رہی ضبط کی سلطان امم کو
اللہ نگہبان کہا شہؑ نے حرم کو

خاموش دبیرؔ اب کہ نہیں طاقتِ گفتار　　ہر مصرعہ برجستہ ہے سلکِ درِ شہوار
بے مثل ہے یہ مرثیہ بے منت و تکرار　　جز عونِ علمدار یہ تقریر ہے دشو
روشن ہے یہ سب پر کرم شاہ زمن سے
کیا گوہر مضمون نکلتے ہیں دہن سے

حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے حوالے سے یہ بند ملاحظہ فرمایئے:

بانو نے کہا دیکھئے تو آپ ادھر کو لو چھوڑ دیا ہاتھوں سے اب زخم جگر کو
دم توڑتے ہیں، کس کے لیے ڈھانکوں میں سر کو گھر لٹتا ہے، ہے ہے میں نکل جاؤں کدھر کو
غصے کی اب آنکھیں ہیں نہ یہ پیار کی آنکھیں
پتھرا گئیں، ہے ہے مرے دلدار کی آنکھیں

بچہ نہ موا تھا کوئی مجھ سوختہ جاں کا دم توڑنا دیکھا بھی تو اس شیر جواں کا
باندھو مری آنکھیں یہ ہے دستور کہاں کا اتنا بھی نہ ہو سخت کلیجا کسی ماں کا
ہے ہے، نہیں کیوں حشر بپا ہوتا ہے لوگو
آگے مری آنکھوں کے یہ کیا ہوتا ہے لوگو

تنکا مرے بچے کا ڈھلکتا ہے دہائی سر آپ کے زانو سے سرکتا ہے دہائی
دم سینے میں بے طرح اٹکتا ہے دہائی سب روتے ہیں کچھ ہو نہیں سکتا ہے دہائی
گھبرائے ہوئے نام علیؑ لیتے ہیں اکبرؑ
کیوں کھینچ کے ہاتھوں کو پٹک دیتے ہیں اکبرؑ

اتنے میں کیا اکبرؑ غازی نے تبسم اور شیر کے نعرے سے ہوا شور تلاطم
بانو نے کہا یوسف۔ شبیرؑ ہوا گم کیوں شیر خدا لے چلے بچے کو مرے تم
اس کوکھ جلی کی تو نہ فریاد کو پہنچے
دم توڑتے میں پوتے کی امداد کو پہنچے

....

احسنت دبیرؔ اب تو سخن ہے ترا اعجاز ہر مصرع موزوں ذرکتوں سے ہے ممتاز
اوروں کی ہے یہ نظم کہاں سوز کہاں ساز اب مرثیۂ حضرت عباسؑ کر آغاز
سینے میں مرے سوز ہے اکبرؑ کے الم کا
عباسؑ علمدار سے لے سایہ علم کا

جلاد آستین چڑھاتا ہوا چلا　　خنجر پہ انگلیوں کو پھراتا ہوا چلا
مجمع کو راس و چپ سے ہٹاتا ہوا چلا　　ارکانِ عرشِ حق کو ہلاتا ہوا چلا
اب کیا کہوں کہ پاؤں رکھا کس مقام پر
پھٹتا ہے سینہ حالِ شہِ تشنہ کام پر

روحِ رسولؐ کہتی تھی، جلاد رحم کر　　یہ سینہ میرا سینہ ہے یہ سر ہے میرا سر!
یہ دل ہے میرا دل، یہ جگر ہے مرا جگر!　　یہ میرا نورِ عین ہے یہ ہے مرا پسر!
بیٹھا ہے تو حسینؑ دلاور کے سینے پر
یہ لوٹتا تھا، تیرے پیمبرؐ کے سینے پر

زہراؑ پکاری، عرشِ الٰہی ہلاؤں گی!　　اے شمر، تجھ پہ آہ کی بجلی گراؤں گی
اس کو نہ مارے گا تو دعا دیتی جاؤں گی!　　محشر میں حُرؑ سے پہلے تجھے بخشواؤں گی
اس نوحے پر بھی عرش کو اُس نے ہلا دیا
خنجر کو بوسہ گاہِ نبیؐ سے ملا دیا

غُل پڑ گیا، حسینؑ نے سر کو فدا کیا!　　اعدا نے جشنِ فتح کا ساماں بپا کیا
رُخ، شمر نے سوے حرمِ مصطفےؐ کیا　　اِک نیزے پر علم، سرِ شاہِ ہُدا کیا
پردہ اٹھائے دیکھتی تھی خواہرِ حسینؑ
نیزے پہ اُس کے آگے چڑھایا سرِ حسینؑ

زینبؑ نے ''ہائے بھائی'' کہا اور نکل پڑی　　بانو نے پھینکی سر سے ردا اور نکل پڑی
کبرا پکاری ''وا ابتا'' اور نکل پڑی　　چلائی فضہ ''ہائے خدا'' اور نکل پڑی
آگے تو بے حواس حرم روتے جاتے تھے
پیچھے پکارتے ہوئے سب بچے آتے تھے

اب ذیل میں صرف چار مرثیوں کے آخری بند ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ دبیرؔ کیا دعا مانگ رہے ہیں؟

خاموش دبیرؔ اب کہ پھٹا جاتا ہے سینہ شبیرؑ سے کر عرض کہ اے شاہِ مدینہ
امداد مری کیجیے از بہر سکینہؑ دریائے تباہی میں ہے خادم کا سفینہ
تم نوحِ غریباں ہو ہر اِک دُکھ کی دوا ہو
روضے پہ بلا لو مجھے اعجاز نما ہو

....

رو کر کہا یہ بانو سے اس نیک ذات نے اماں دلہن بنی بھی تھی میں ان کے سامنے
بس اے دبیرؔ خوب ملے نظم کے لیے تائید غیب کے ہیں نمونے یہ مرثیے
بحرِ رواں ہے یا کہ طبیعت ملی ہے یہ
سقائے اہلِ بیتؑ کی دریا دلی ہے یہ

....

اب وقت ہے دُعا کا کہ ہے شدت بکا آمیں کہیں دبیرؔ محبانِ مرتضیٰؑ
یارب ہیں جتنے شیعۂ سلطانِ لافتیٰ مطلب ادا ہوں سب کے مع بانیٔ عزا
یارب نہ کوئی غم ہو انہیں جز غمِ حسینؑ
یہ سب محبّ ہے جلوہ دہِ ماتمِ حسینؑ

....

خیمے کو پیٹتی ہوئی زینب رواں ہوئی بس اے دبیرؔ بس کہ قیامت رواں ہوئی
کس کس کی یاں زبان نہ صرف بیاں ہوئی لیکن کسی سے ختم نہ یہ داستاں ہوئی
آقا سے عرض کر مری امداد کیجیے
ناشاد ہوں خدا کے لیے شاد کیجیے

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اُردو شاعری

میں مرثیہ وہ صنف ہے جس میں تمام اصناف سخن کے جملہ محاسن یکجا ہو گئے ہیں۔ اسی طرح درج بالا گزارشات کی روشنی میں اب میں یہ نکتہ باور کرانے کی جسارت کر رہا ہوں کہ اردو کلاسیکی مرثیہ نگاروں کے مرثیوں کے تمام محاسن مرزا دبیر کے مراثی میں مجتمع ہو گئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مرزا دبیر کو میر انیس سے جدا کر کے ایک شاعر کے طور پر سمجھا جائے اور اس کی فنی قدر و قیمت کا بار دگر تعین کیا جائے۔ اگر ہم نے اس سلسلے میں کوتاہی سے کام لیا تو آنے والا وقت ہمیں معاف نہیں کرے گا۔

⌘⌘⌘
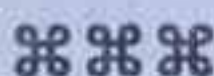
آل رضا کا سنِ ولادت۔ چند معروضی حقائق

اُردو شاعری کی آبرو "غزل" کو ہماری تہذیبی روایت میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اس صنف کے ساتھ جو اغماض برتا گیا' اس کے نتیجے میں یہ صنف بے اعتبار قرار پائی اور نظم نگاری کو عروج ملا۔ پورے ہندوستان میں نظم گوئی کی تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ غزل کے مزاج میں بھی تبدیلی رونما ہونے لگی۔ لکھنؤ میں اس عہد کے شعراء نے بھی نظم نگاری کی جانب توجہ کی' مگر بعض شعراء نے غزل کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا۔ ان شعراء کی پیہم کاوشوں کے نتیجے میں غزل ایک بار پھر با اعتبار صنفِ سخن کے طور پر ہمارے سامنے آئی۔ غزل کے ان لکھنوی محسنین میں دیگر شعراء کے علاوہ "سید آلِ رضا" کا نام بھی معتبر ہے۔ (۱) اور لکھنؤ کی جدید شعری روایت کے پاسبانوں میں سید آل رضا سرفہرست ہیں۔ (۲)

سید آلِ رضا نیوتنی نامی قصبہ ضلع اناؤ (لکھنؤ) میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے ابتداً رضا نیوتنوی اور بعد میں رضا لکھنوی کے نام سے معروف ہوئے۔ آپ کے والد ماجد خان

---

(۱) مجتبیٰ حسین' ادب و آگہی' کراچی' مکتبۂ افکار' س۔ن' ص ۳۲۵۔

(۲) ابواللیث صدیقی' لکھنؤ کا دبستان شاعری' لاہور' اُردو مرکز ۱۹۶۷ء' طبع دوم' ص ۸۹۵۔

بہادر جسٹس سید محمد رضا اودھ کے اضلاع میں انصاف و قانون کے مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد لکھنؤ چیف کورٹ کے سینئر جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ آلِ رضا نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد سیتاپور ہائی اسکول سے انٹرنس کی سند حاصل کی اور حصول علم کی خاطر لکھنؤ پہنچے۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کی سند حاصل کی اور میو سینٹرل کالج الہ آباد سے ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ آپ کی بہترین قانونی صلاحیتوں کے اعتراف میں آپ کو ''لیبر ٹربیونل'' کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ تقسیم برصغیر کے بعد آپ اپنے حقیقی بھائیوں جناب ہاشم رضا' جناب مسعود رضا اور جناب کاظم رضا کے پرزور اصرار پر لکھنؤ سے عروس البلاد کراچی تشریف لے آئے اور وکالت ہی کو ذریعۂ معاش بنایا۔ (۳) پاکستان میں آلِ رضا نے اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ ملک بھر میں علم و ادب کے شائقین کا ایک ایسا طبقہ پیدا کیا' جو آج بھی گلستانِ علم و ادب کی آبیاری میں مصروف ہے۔ (۴) آخری عمر میں آپ نزلہ بخار جیسے معمولی مرض میں مبتلا ہوئے اور اسی حالت میں ۲ مارچ ۱۹۷۸ء کو ۸۲ برس کی عمر میں اس دارِ فانی سے جنت الفردوس کی سمت کوچ کر گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون ○

آلِ رضا مشرقی تہذیب و ثقافت کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ ان کی شخصیت میں یہ وضعداری' رکھ رکھاؤ' نفاست اور متانت اسی تہذیب کی عطا ہیں۔ آلِ رضا بلاشبہ ایک گم شدہ تہذیب کے نمائندے ہیں اور اس تہذیب کے اسرار و رموز سے وہی آگاہ ہو سکتا ہے' جس نے اس کی جلوہ گری دیکھی ہو۔ یہ تہذیب و ثقافت دراصل ہزار سالہ ہندو مسلم تعلقات کی دین ہے۔ ظاہر ہے کہ اب وہ تہذیب و ثقافت تو لوٹ کر نہیں آ سکتی' مگر اس کو محفوظ کرنا اور عہد جدید میں اس کے معانی متعین کرنا ہر تخلیق کار کا فرض ہے اور آلِ رضا نے اس فرض منصبی کو نہایت

---

(۳) شبیہ الحسن' آلِ رضا کا فن غزل گوئی' لاہور' سفینہ پبلی کیشنز' ۱۹۸۹ء' ص ۳۶۔

(۴) آلِ رضا مرحوم نے لاہور اور کراچی میں اپنے دیرپا نقوش چھوڑے ہیں۔ کراچی میں جناب شاہد نقوی اور لاہور میں جناب سید وحید الحسن ہاشمی آلِ رضا کے شعری مشن کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

خوشگوار طریقے سے سرانجام دیا ہے اور اسی لئے ان کے بیشتر رفقاء اور ناقدین نے انہیں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دیا ہے۔(۵)

آلِ رضا لکھنوی لب ولہجہ کے ایک منفرد شاعر ہیں۔ انہوں نے غزل گوئی سے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور پچاس برس تک اسی میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ انہوں نے غزلوں کے دو دواوین ''نوائے رضا'' (۶) اور ''غزل معلی'' (۷) اپنی یادگار چھوڑے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جدید مرثیے کا سنگِ بنیاد رکھا اور مرثیے کے قالب کو یکسر تبدیل کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کے تمام مرثیوں کا ایک مجموعہ ''مراثی رضا'' (۸) کے نام سے شائع ہو کر اربابِ دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ آلِ رضا کا بے شمار کلام اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا، راقم الحروف نے دس برس کی مسلسل محنت و مشقت کے بعد ان کا بیشتر غیر مطبوعہ کلام یکجا کر لیا ہے جو ''باقیاتِ آلِ رضا'' (۹) کے نام سے ۲۰۰۰ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ آلِ رضا کی غیر مطبوعہ غزلوں کا مجموعہ ''غزل معلی کے بعد'' اور سلاموں کا مجموعہ ''سلام خاک نشینوں پہ'' زیرِ ترتیب ہیں اور انشاء اللہ جلد ہی زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر قارئین تک پہنچ جائیں گے۔

آلِ رضا کی ادبی و شعری کارگزاریوں کے احاطے کے لئے جب ہم نے ۱۹۸۰ء

---

(۵) (i) شوکت تھانوی ''لکھنؤ کی چند ادبی شخصیتیں'' نقوش، محمد طفیل، مرتب (لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۵ء) ص ۵۳۷۔

(ii) ضیاء الحسن موسوی ''غزل معلی سے کربلائے معلی تک'' سب رس، خواجہ حمید شاہد، مدیر، کراچی: ایوان اردو، دسمبر ۱۹۷۹ء، ص ۲۱۵۔

(۶) آلِ رضا ''نوائے رضا'' لکھنو۔ نظامی پریس، ۱۹۲۹ء

(۷) آلِ رضا ''غزل معلی'' کراچی: مکتبۂ افکار، ۱۹۵۹ء

(۸) آلِ رضا ''مراثی رضا'' کراچی: خراسان اسلامک ریسرچ سنٹر، ۱۹۸۱ء

(۹) شبیہ الحسن، ڈاکٹر، باقیات آلِ رضا، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

(''باقیات آلِ رضا'' میں ان کی غزلیں، نظمیں، سلام، قطعات، رباعیات، مناقب، حمد، نعت اور ترانے وغیرہ شامل ہیں)

میں ایم۔اے کی سطح پر باقاعدہ تحقیقی کام شروع کیا تو آغاز ہی میں ہم پر منکشف ہوا کہ آلِ رضا کے سنِ ولادت کے بارے میں مرتبین، مصنفین اور ناقدین میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ جب سنِ ولادت کے حتمی تعین کے لئے ہم نے مختلف اصحاب کے پیش کردہ سنین کا بغور مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ آلِ رضا کا سنِ ولادت ۱۸۹۴ء سے ۱۹۰۶ء کے درمیان کہیں متعین ہوتا ہے۔ ان سنین کی موجودگی میں کسی بھی سن سے اختلاف یا اتفاق اپنی سطح پر ہمارے لئے ایک عرصے تک پیچیدہ مسئلہ بنا رہا۔ بہر حال ہم نے اپنی مقدور بھر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور تحقیق و تدوین کے مروجہ اصولوں کی روشنی میں آلِ رضا کے سنِ ولادت کے حتمی تعین کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ ہم اس کاوش میں کہاں تک سرخرو ہوئے ہیں' اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ اب ذیل میں آلِ رضا کے سنِ ولادت کے بارے میں پیش کردہ آراء کا جائزہ لیا جائے گا اور آخر میں حتمی رائے پیش کی جائے گی۔

(۱)

آلِ رضا کے سن ولادت کا سب سے قدیم سراغ ہمیں ''ہما اخلاق حسین'' کے تذکرے میں ملتا ہے۔ محترمہ رقمطراز ہیں:

''......نام سید آلِ رضا' تخلص رضا کرتے ہیں۔ پیدائش غالباً ۱۸۹۴ء'' (۱۰)

ہما اخلاق حسین کے خیال میں آلِ رضا ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے خیال میں محترمہ کا تعین کردہ یہ سن اصولِ تحقیق و تدوین کے مطابق سراسر غلط ہے' کیونکہ:

۱۔ مولفہ نے اگر فنِ تحقیق و تدوین کے مطابق درست سن کا تعین کیا ہوتا تو وہ خود ''غالباً'' کا لفظ استعمال نہ فرماتیں۔ اس لفظ نے اس پیش کردہ سن کو مزید مشکوک بنا دیا ہے۔

۲۔ مولفہ کی ابتدائی معلومات بھی انتہائی ناقص ہیں۔ آلِ رضا کے پہلے دیوان ''نوائے

---

(۱۰) ہما اخلاق حسین' ''جوئبار (تذکرہ)'' لاہور: فیروز سنز' س۔ن' ص ۳۸۹۔

رضا'' کے بارے میں رقم طراز ہیں:۔

''......دیوان ان کا ''نوائے رضا'' لکھنؤ میں چھپا تھا' مگر اب مفقود ہے''۔(۱۱)

۳۔ کسی بھی دوسرے مرتب' مصنف اور ناقد نے اس سن ولادت کی تصدیق نہیں کی۔

ان پیش کردہ معروضات کی روشنی میں ہما اخلاق حسین کے پیش کردہ سن ولادت ''۱۸۹۴ء'' کو کسی بھی طرح درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

(۲)

آلِ رضا کے سنِ ولادت کا تعین بعض مرتبین نے ''۱۸۹۵ء'' کیا ہے۔اس سن کے غلط تعین کی اصل وجہ دراصل آلِ رضا کا ایک خودنوشت اقتباس ہے جو انہوں نے ''شعرستان'' کے لئے تحریر کیا تھا۔وہ خود رقمطراز ہیں:

''......اپنا تذکرہ کیا عرض کروں۔سنتا ہوں کہ جون ۱۸۹۵ء میں یعنی ۵۶ سال ادھر ایک سید کے گھر اپنے ننہال قصبہ نیوتنی ضلع اناؤ (اودھ) میں پیدا ہوا تھا''۔(۱۲)

اس خودنوشت اقتباس کے نتیجہ میں مندرجہ ذیل مرتبین و مولفین نے بغیر غور وفکر کے آلِ رضا کا سنِ ولادت ۱۸۹۵ء قرار دے دیا۔

ا۔ ڈاکٹر ہلال نقوی

''سید آلِ رضا جون ۱۸۹۵ء میں نیوتنی ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے''۔(۱۳)

---

(۱۱) ہما اخلاق حسین ''جوبار (تذکرہ)'' لاہور: فیروز سنز' س۔ن' ص ۳۸۹۔

(۱۲) نعمانی تاثیر' مظہر صدیقی (مرتبین) 'شعرستان (تذکرہ)' کراچی' مکتبہ پرچم' ۱۹۵۲ء' ص ۱۵۶

(۱۳) ہلال نقوی (تعارف شعراء) ''مرثیہ قطب شاہ سے ساحر تک'' کراچی: پاکستان ریڈرس گلڈ' ۱۹۷۷ء' ص ۷۵

ب۔ محمد واصل عثمانی

''سید آلِ رضا جون ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ لکھنؤ میں نہیں بلکہ اناؤ ضلع کے ایک قصبہ نیوتنی میں۔ جہاں شعر و سخن کی کوئی محفل نہ جمتی تھی۔'' (۱۴)

ج۔ عشرت علی صدیقی

''سید آلِ رضا جون ۱۸۹۵ء میں اناؤ ضلع کے ایک قصبہ نیوتنی میں پیدا ہوئے۔'' (۱۵)

د۔ جواد اصغر نقوی

''......وہ ۱۸۹۵ء میں قصبہ نیوتنی ضلع اناؤ (یو۔پی) میں پیدا ہوئے''۔ (۱۶)

ر۔ عرفان عباسی

''......رضا صاحب نیوتنی ضلع اناؤ کے ایک تعلیم یافتہ، خوشحال اور معزز گھرانے میں ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔'' (۱۷)

مندرجہ بالا تمام مرتبین کے پیش کردہ سن ۱۸۹۵ء کا ماخذ دراصل آلِ رضا کا خودنوشت اقتباس ہی ہے۔ اگر اس اقتباس کا تجزیہ کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آلِ رضا کا سنِ ولادت ۱۸۹۵ء نہیں ہے، کیونکہ:

ا۔ تحقیقی معیار کے مطابق آلِ رضا کا پیش کردہ سن ولادت درست قرار نہیں دیا جا سکتا اور خصوصاً ''سنتا ہوں'' کے الفاظ نے اس کو مزید مشکوک کر دیا ہے۔

---

(۱۴) محمد واصل عثمانی ''سید آلِ رضا'' غزل اور مرثیے کا شاعر' کراچی: روزنامہ ''حریت'' ۸ مارچ ۱۹۷۸ء۔

(۱۵) عشرت علی صدیقی (ایڈیٹر) ''دبستان لکھنؤ کی ایک اور بہار ختم ہوئی'' لکھنؤ روزنامہ ''قومی آواز'' ۱۱ مارچ ۱۹۷۸ء

(۱۶) جواد اصغر نقوی (ایڈیٹر) ''آہ سید آلِ رضا'' کراچی: پندرہ روزہ ''ارشاد'' اپریل ۱۹۷۸ء

(۱۷) عرفان عباسی۔ آپ (تذکرہ شعرائے لکھنؤ۔ حصہ اول)۔ لکھنؤ: اردو پبلشرز ۱۹۷۸ء۔ ص: ۱۲۶

ب۔ آلِ رضا نے اس خود نوشت اقتباس کو بادلِ ناخواستہ اور قلم برداشتہ تحریر کیا تھا۔ ایسی ہنگامی صورت میں درست سن کے تعین کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ خود رقمطراز ہیں:

> ''...... یہاں یہ مشکل ہے کہ اپنی بیس سال کی مدتِ شاعری میں آج تک کبھی کسی سے بحیثیت شاعر خود اپنا تعارف نہیں کرایا کیونکہ اپنے لئے شاعری محض ایک تفریحی مشغلہ رہی۔ خیر' انکار و اصرار کی یہ کشاکش اس منزل پر ختم ہوئی کہ مظہر میاں ہی کی ضد پوری ہو رہی ہے' لیکن حیف اس دو چار صفحے کاغذ کی قسمت پر' جس کی قسمت میں اس طرح ''بادلِ ناخواستہ'' اور پھر ''قلم برداشتہ'' تحریر سے سیاہ ہونا ہو۔ مجھے تو اپنے انکار کی سزا مل گئی کہ اب کچھ سوچ سمجھ کر لکھنے کا وقت نہیں رہا۔ کہا جاتا ہے کہ کاپی پریس جا رہی ہے۔'' (۱۸)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آلِ رضا نے بغیر غور و فکر کے اپنا سنِ ولادت قیاساً ۱۸۹۵ء تحریر کر دیا ہے اور یہ تحقیقی اعتبار سے ناقابلِ اعتبار ہے۔

ج۔ آلِ رضا نے اس اقتباس کی تحریر کے وقت اپنی عمر کا تعین ۵۶ برس کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں معرضِ وجود میں آئی۔ اس لحاظ سے بھی اگر ۱۹۵۲ء میں سے ۵۶ برس کم کر دیے جائیں تو پھر بھی سنِ ولادت ۱۸۹۵ء کے بجائے ۱۸۹۶ء قرار پائے گا۔

بہرحال مندرجہ بالا داخلی اور خارجی شواہد کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ آلِ رضا ۱۸۹۵ء میں پیدا نہیں ہوئے اور انہوں نے قیاساً یہ سنِ ولادت تحریر کر دیا تھا۔ ان کے اسی قیاسی پیش کردہ سن کے نتیجے میں مرتبین نے بھی غلطی سے اس سن کو اپنا لیا۔ اب اس غلط فہمی کے ازالے کے بعد مندرجہ بالا دیگر مرتبین کی آراء کا تجزیہ محض وقت کا ضیاع ہے۔

(۴)

آلِ رضا کے سنِ ولادت کا ایک تعین عبدالوحید خاں نے کیا ہے۔ ان کے خیال میں آلِ رضا ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے' وہ رقمطراز ہیں:

---

(۱۸) نعمان تاثیر' مظہر صدیقی (مرتبین) ''شعرستان'' کراچی: مکتبۂ پرچم' ۱۹۵۲ء' ص ۱۵۶۔

"......سید آلِ رضا نام' رضا تخلص' ۱۸۹۷ء میں قصبہ نیوتنی' ضلع اناؤ (اودھ) میں پیدا ہوئے۔" (۱۹)

مولف نے آلِ رضا کے سنِ ولادت کا تعین بغیر شواہد کے کرلیا ہے۔ سنِ ولادت کا یہ حتمی تعین ہمارے خیال میں درست نہیں' کیونکہ:

ا۔ مولف کی معلومات آلِ رضا کے بارے میں محدود معلوم ہوتی ہیں' کیوں کہ انہوں نے پورے تذکرے میں آلِ رضا کی مرثیہ نگاری کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا بلکہ اس بات پر بار بار اصرار کیا ہے کہ:

"......وہ خالصتاً غزل گو شاعر ہیں۔ ان کی غزل کا آغاز اسی صنفِ لطیف سے ہوا اور آج بھی وہ غزل ہی کہتے ہیں۔ جناب رضا کی ابتداء غزل سے ہوئی اور آج تک وہ اسی صنف کے ساتھ نباہ رہے ہیں۔" (۲۰)

ب۔ عبدالوحید خاں کے اس پیش کردہ سن کو دیگر مرتبین نے قبول نہیں کیا اور کسی نے اس سن کو اہمیت نہیں دی۔

ان نکات کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آلِ رضا کا سنِ ولادت ۱۸۹۷ء بہر حال ہرگز نہیں ہوسکتا ہے۔

(۴)

آلِ رضا کے سنِ ولادت کا سب سے مضحکہ خیز تعین روزنامہ "مارننگ نیوز" کے اداریہ سے ہوتا ہے۔ مدیر صاحب کے بقول ۱۹۷۸ء میں آلِ رضا نے ۷۲ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اس لحاظ سے ان کا سنِ ولادت ۱۹۰۶ء متعین ہوتا ہے' جو سراسر لغو اور مضحکہ خیز ہے۔ مدیر صاحب رقمطراز ہیں:

---

(۱۹) عبدالوحید خاں (مرتب)۔ جدید شعرائے اُردو (تیسرا حصہ)۔ لاہور: فیروز سنز ۱۹۶۹ء۔ ص ۷۷۶

(۲۰) عبدالوحید خاں (مرتب)۔ جدید شعرائے اُردو (تیسرا حصہ)۔ لاہور: فیروز سنز ۱۹۶۹ء۔ ص ۷۷۷

"Death has removed two noted literary figures of our country from the scene within this week- Syed Ale-Raza who died of heart failure on Wednesday last, was a celebrated Urdu Poet, one of the last remaining with the great virtucsoes of our literature. Aale Raza, who died at the age of 72, was the eldest brother of Syed Hashim Raza......"(21)

مدیر صاحب نے آلِ رضا کا سنِ ولادت ۱۹۰۶ء متعین کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۹۰۶ء میں سید آلِ رضا دس برس کے ہو چکے تھے اور ابتدائی گھریلو تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسکول بھی جانے لگے تھے:

''......اس عہد کے دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی اور پھر باقاعدہ تعلیم کے لئے ''سیتاپور اسکول'' میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اس اسکول سے ۱۹۱۲ء میں انٹرنس کی سند امتیازی نمبروں سے حاصل کی۔''(۲۲)

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آلِ رضا کی پیدائش کا یہ سن بالکل غلط ہے۔ ہمارے خیال میں عدمِ واقفیت، غلط فہمی یا ٹائپ کی غلطی کی وجہ سے عمر ۸۲ برس کے بجائے ۷۲ برس شائع ہو گئی ہے۔ اگر ہم قیاسی تصحیح کے اُصول کے مطابق ۸۲ برس کو درست مان لیں تو مسئلہ بالکل حل ہو جاتا ہے۔

(۵)

ہمارے خیال میں کسی بھی شاعر کے سنِ ولادت کے حتمی تعین سے قبل تحقیق و تدوین کے اصولوں سے کماحقہٗ آگہی، شاعر سے متعلق تمام معلومات سے واقفیت، شاعر سے متعلق

---

(۲۱) ایڈیٹر "Great Loss to Urdu" کراچی، روزنامہ ''مارننگ نیوز'' ۳ مارچ ۱۹۷۸

(۲۲) شبیہ الحسن، آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، لاہور: سفینہ پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۳۵

دیگر پیش کردہ مواد پر مکمل دسترس اور ذہنی تجزیے کی صلاحیت نہایت ضروری ہے۔ آلِ رضا کے سنِ ولادت کے تعین کے سلسلے میں مندرجہ بالا مرتبین، ناقدین اور مولفین کے بیانات میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ہم نے ان بیانات کا بغور مطالعہ و تجزیہ کرنے کے بعد حقائق و شواہد کی روشنی میں یہ رائے قائم کی ہے کہ آلِ رضا کا سنِ ولادت دراصل ''۱۸۹۶ء'' ہے۔ اس سن کے تعین کے ہمارے پاس کئی داخلی اور خارجی شواہد موجود ہیں۔ ذیل میں مختصراً ان شواہد کو نکات کی صورت میں پیش کیا جارہا ہے:۔

ا۔ سب سے پہلے ہم آلِ رضا کے والد جسٹس سید محمد رضا مرحوم کی ڈائری سے ایک اقتباس پیش کررہے ہیں، جس میں انہوں نے آلِ رضا کی پیدائش سے متعلق چند معلومات بہم پہنچائی ہیں:

"A son born to me on the 10th June 1896 (27th Zilhejjaha) at 7 A.M., Wednesday. Got a telephone with effect from Neutani on the 10th at 2 P.M. Telephone sent to Chaunda and Harcloi at 3/15 P.M. Named S. Aalay Raza."(23)

''۱۰ جون ۱۸۹۶''۔

اصولِ فنِ تحقیق و تدوین کے مطابق اولاً کسی بھی اولاد کی تاریخِ پیدائش سے متعلق سب سے مستند سند اس کے والد کی تسلیم کی جاتی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس بھی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آلِ رضا کا سنِ ولادت یقیناً ۱۸۹۶ء ہے۔ ثانیاً اس اقتباس کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جسٹس محمد رضا مرحوم نے اپنی ڈائری میں یہ اقتباس ۱۰ جون ۱۸۹۶ء ہی کو رقم کرلیا تھا۔ اس لحاظ سے کسی قسم

---

(۲۳) سید آلِ رضا کے والد سید محمد رضا مرحوم کی ذاتی بیاض سے لیا گیا اقتباس۔ مخزونہ سید ہاشم رضا صاحب (کراچی)۔ آخر میں لکھی گئی اُردو تاریخ اسی طرح مرقوم ہے۔

کے ذہنی انتشار یا بھول چوک کا اندیشہ بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ ثانیاً اس ڈائری میں آلِ رضا کے دیگر بھائیوں کی تاریخ ہائے ولادت بھی درج ہیں اور وہ تمام درست ہیں۔ رابعاً یہ ڈائری کچھ عرصہ آلِ رضا کے پاس بھی محفوظ رہی۔ اگر وہ اس سنِ ولادت کے بارے میں مشکوک ہوتے تو وہ اس کو درست کر دیتے یا کم از کم کسی جگہ اس کی تصحیح ضرور فرما دیتے۔ بہرحال تمام شواہد اس بات پر دال ہیں کہ اس ڈائری کا اقتباس بالکل درست ہے اور آلِ رضا ۱۰ جون ۱۸۹۶ء کو متولد ہوئے ہیں۔

ب۔ آلِ رضا کے خود مرتب کردہ شعری مجموعے "غزلِ معلیٰ" میں بھی ان کا سنِ ولادت ۱۸۹۶ء ہی رقم ہے۔ ایک علیحدہ صفحے پر یہ عبارت درج ہے:۔

"...... نام آلِ رضا۔ سن پیدائش جون ۱۸۹۶ء۔ بمقام قصبہ نیوتنی، ضلع اناؤ (یو۔ پی۔ انڈیا)۔" (۲۴)

ج۔ سید آلِ رضا کے چھوٹے بھائی سید ہاشم رضا صاحب رقمطراز ہیں:۔

"...... سید آلِ رضا ۱۰ جون ۱۸۹۶ء کے دن قصبہ نیوتنی، ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ پہلی مارچ ۱۹۷۸ء کی شب انہوں نے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی......"۔ (۲۵)

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات ہمارے تعین کردہ سنِ ولادت پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ہاشم رضا صاحب کے بیان کے بعد تو مزید کسی اندرونی اور بیرونی شہادت کی ضرورت بھی نہیں محسوس ہوتی۔ تاہم ہم مزید شہادتیں بھی پیش کر رہے ہیں۔

د۔ آلِ رضا کے شاگرد سید وحید الحسن ہاشمی نے سب سے پہلے آلِ رضا کے سنِ ولادت کا تعین ۱۸۹۶ء کیا ہے، وہ رقمطراز ہیں:

"...... جدید مرثیے کے بانی سید آلِ رضا ایڈووکیٹ ۱۸۹۶ء میں نیوتنی میں

---

(۲۴) آلِ رضا۔ غزلِ معلیٰ۔ کراچی: مکتبۂ افکار (س۔ن)، ص: ۴

(۲۵) سید ہاشم رضا۔ تمہیدی جملے (مراثیٔ رضا)۔ کراچی: خراسان اسلامک ریسرچ سنٹر، ۱۹۸۱ء۔

پیدا ہوئے......"(۲۶)

ر۔ ضیاء الحسن موسوی اپنے مضمون "غزل معلّٰی سے کربلا معلّٰی تک" میں آلِ رضا کا سنِ پیدائش ۱۸۹۶ء قرار دیتے ہیں۔(۲۷)

س۔ روزنامہ 'ڈان' کراچی' میں Literary Round up کے عنوان سے Ariel نامی کالم نگار رقمطراز ہیں:

"......Aaley Raza was born in 1896, when Sir Syed was living, and he died whenSir Syed,'s fifth generation is in the school."(28)

ص۔ پروفیسر سید وصی رضا نے آلِ رضا پر لکھے گئے ایک سوانحی خاکے میں ان کا سنِ ولادت ۱۸۹۶ء قرار دیا ہے۔(۲۹)

ط۔ سید ضمیر اختر نقوی نے "گلشنِ آرزو لکھنوی کا آخری پھول" کے عنوان سے لکھے جانے والے مضمون میں آلِ رضا کا سنِ پیدائش ۱۸۹۶ء قرار دیا ہے۔(۳۰)

ع۔ سید ضمیر اختر نقوی نے اپنے جدید مرثیاتی تذکرے میں بھی آلِ رضا کا سنِ ولادت ۱۸۹۶ء تحریر کیا ہے۔(۳۱)

ف۔ محترمہ سلطانہ مہر نے آلِ رضا کے سنِ ولادت کا تعین ۱۸۹۶ء قرار دیا ہے۔(۳۲)

ق۔ یاور عباس "یادِ رفتگاں" کے حوالے سے "سید آلِ رضا مرحوم" کے عنوان سے ایک

---

(۲۶) سید وحید الحسن ہاشمی۔ جدید فن مرثیہ نگاری۔ لاہور: مکتبہ تعمیر ادب' ۱۹۶۷ء۔ ص ۴

(۲۷) ضیاء الحسن موسوی۔ مجلہ بیادِ آلِ رضا۔ کراچی: ابن حسن پریس' ۱۹۷۸ء ص ۶۳

(۲۸) اریل (محمد علی صدیقی)۔ لٹریری راؤنڈ اپ۔ کراچی: روزنامہ "ڈان" ۱۷ مارچ ۱۹۷۸ء

(۲۹) سید وصی رضا "سید آلِ رضا مرحوم" کراچی: روزنامہ "مشرق" ۴ جنوری ۱۹۸۴ء

(۳۰) سید ضمیر اختر نقوی' "گلشنِ آرزو کا آخری پھول"۔ کراچی: روزنامہ "جنگ" ۱۷ مارچ ۱۹۷۸ء

(۳۱) سید ضمیر اختر نقوی' اُردو مرثیہ پاکستان میں' کراچی: سید اینڈ سید' ۱۹۸۲ء۔

(۳۲) سلطانہ مہر۔ سخنور' تذکرہ شعرائے پاکستان' کراچی: ادارہ التحریر' ۱۹۷۹ء۔ ص: ۱۵۱

مضمون میں رقمطراز ہیں:

''......سن پیدائش ۱۸۹۶ء، سنِ وفات ۱۹۷۸ء، عمر ۸۲ سال، با قاعدہ شاعری کی ابتداء: ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۳ء کے درمیان ہوئی......'' (۳۳)

ک۔ پاکستان نیشنل اکیڈمی کراچی نے ''بیادِ رفتگاں'' کے عنوان سے ایک ''سووینئر'' شائع کیا۔ اس میں بھی مرتبین نے آلِ رضا کا سنِ ولادت ۱۸۹۶ء قرار دیا ہے۔'' (۳۴)

گ۔ سید زائر حسین کاظمی نے اپنے ایک مضمون ''پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب کی چند ملاقاتیں'' کے حاشیے میں آلِ رضا کا سنِ ولادت ۱۸۹۶ء قرار دیا ہے۔ (۳۵)

ل۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنی کتاب 'بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' میں آلِ رضا کا سن ولادت ۱۰ جون ۱۸۹۶ء قرار دیا ہے۔ (۳۶)

م۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب ''باقیاتِ آلِ رضا'' میں بھی آلِ رضا کا سن ولادت ۱۸۹۶ء قرار دیا ہے۔ (۳۷)

ن۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب ''ترجیحات'' میں ''آلِ رضا کے سن ولادت کا حتمی تعین'' کے عنوان سے ایک طویل تحقیقی مقالے میں آلِ رضا کا سن ولادت ۱۰ جون ۱۸۹۶ء ثابت کیا ہے۔ (۳۸)

و۔ آلِ رضا کے شاگرد سید وحید الحسن ہاشمی نے اپنی تازہ ترین کتاب 'سید آلِ رضا کے

---

(۳۳) یاور عباس۔ سید آلِ رضا مرحوم۔ کراچی: پندرہ روزہ ''آہنگ'' اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۹

(۳۴) خاور جمیل (چیئرمین)۔ سید آلِ رضا۔ کراچی: سوئینیر پاکستان نیشنل سنٹر، ص: ۲۱

(۳۵) سبطِ محمد نقوی (مرتب) مسعود حسن رضوی، فرد اور فنکار۔ لکھنؤ: واجد علی شاہ اکیڈمی، ۱۹۸۰ء، ص ۵۶

(۳۶) ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ' کراچی' محمدی ٹرسٹ' ۱۹۹۴ء، ص ۶۰۰

(۳۷) سید شبیہ الحسن، ڈاکٹر، ''باقیات آلِ رضا'' لاہور، الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۲۵۔

(۳۸) سید شبیہ الحسن، ڈاکٹر، ترجیحات، لاہور، اظہار سنز، ۱۹۹۸ء، ص ۳۳

خطوط اور اصلاحیں' میں ۱۸۹۶ء کو آلِ رضا کا سن ولادت قرار دیا ہے۔(۳۹)

آلِ رضا کے سنِ ولادت ۱۸۹۶ء کے حتمی تعین کے لئے ہم نے جو طریقہ کار اختیار کیا' اس کا بیان بھی ضروری ہے۔

اولاً ہم نے آلِ رضا کے اہل خانہ کو اہمیت دی ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے آلِ رضا کے والد جسٹس سید محمد رضا مرحوم کی خود نوشت بیاض کا اقتباس پیش کیا ہے۔ اس کے بعد مرحوم کے حقیقی بھائی سید ہاشم رضا مرحوم کی تحریروں کو پیش نظر رکھا ہے۔ ثانیاً ہم نے ان اصحاب کی تحریروں کو اہمیت دی ہے' جن کا تعلق آلِ رضا سے براہ راست رہا ہے' اس سلسلے میں فی الوقت ہم نے چار اصحاب وحید الحسن ہاشمی' ضمیر اختر نقوی' ڈاکٹر ہلال نقوی اور ضیاء الحسن موسوی کی آراء کو اہمیت دی ہے کیونکہ یہ چاروں حضرات زمانی اور فکری اعتبار سے سید آلِ رضا کے قریب رہے ہیں۔ ثالثاً ہم نے آلِ رضا کی زندگی میں شائع شدہ کتابوں کو اہمیت دی ہے۔ اس سلسلے میں بالخصوص ہمارے پیشِ نظر جدید فنِ مرثیہ نگاری (وحید الحسن ہاشمی) اور غزل معلیٰ (سید آلِ رضا) رہی ہیں اور ہم نے ان کے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کتب میں ان کا سنِ ولادت غلط شائع ہوتا تو وہ تصحیح فرما دیتے۔ سید آلِ رضا کی خاموشی سے بھی ہمارے متعین کردہ سنِ ولادت کو تقویت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے ردو قبول کے لئے تحقیق و تدوین کے جدید اُصولوں کا بھی سہارا لیا ہے۔

مندرجہ بالا پیش کردہ داخلی و خارجی شواہد کی روشنی میں اب ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آلِ رضا کا سن ولادت ۱۰ جون ۱۸۹۶ء ہے تاہم تحقیق کی دنیا بہت وسیع ہے اور ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

⌘⌘⌘

---

(۳۹) سید وحید الحسن ہاشمی' سید آلِ رضا کے خطوط اور اصلاحیں' لاہور' الحسن پبلی کیشنز' ۲۰۰۴ء' ص ۳۰
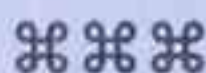
نسیم امروہوی کی تخلیقات کا موضوعاتی منظر نامہ

ایک زمانہ تھا کہ جب علم و ادب کی قدر عجز و انکسار سے کی جاتی تھی اور اہلِ دانش کی قدر افزائی کو ادب و علم کی خدمت کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اس خوشگوار صورت حال میں باصلاحیت ادیب اور شاعر نہایت سکون سے اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کرتا تھا اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی روایت سازی اس کا بنیادی مطمحِ نظر ہوا کرتا تھا۔ عصر حاضر میں شعراء و ادباء کی قدر افزائی تو درکنار شعر و ادب کی حالت ہی انتہائی ناگفتہ بہ ہو چکی ہے۔ علم و ادب کے قدر دانوں کی کمی ہوتی جا رہی ہے اور جو تھوڑے بہت علم شناس و ادب نواز باقی رہ گئے ہیں وہ تخلیق کاروں کی باہمی چپقلشوں اور باہمی گروہ بندیوں کی وجہ سے دل گرفتہ ہو گئے ہیں۔ اب عالم یہ ہے کہ ٹریفک کے حادثے میں ہلاک ہو جانے والے کے اہل خانہ کی کفالت کا انتظام و اہتمام تو ہو جاتا ہے لیکن علم کی شمع پر نچھاور ہو جانے والے پروانوں کے اہل خانہ کی کفالت کا کوئی انتظام و انصرام نہیں ہوتا (۱) اس صورت حال کا ذمہ دار کون ہے.....؟؟ اس کا فیصلہ قارئین کو کرنا ہے۔

---

(۱) شبیہ الحسن ٗ ڈاکٹر ٗ شام و سحر کی باتیں ٗ لاہور ٗ الحبیب پبلی کیشنز ٗ ۱۹۹۸ ٗ ص ۱۰۴

عصر حاضر کی خراب ادبی صورت حال نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب کو بھی متاثر کیا ہے۔ آج کل کا ہر معمولی تخلیق کار خود کو ''علامہ'' اور اپنی ہر تحریر کو ''حرف آخر'' سمجھنے لگا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اگر کوئی غیر جانبدار نقاد ایسے تخلیق کار کی کسی کوتاہی پر گرفت کرے تو وہ خود ساختہ علامہ اخلاقیات کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مرنے مارنے پر کمر بستہ ہو جاتا ہے۔ اس ملال انگیز صورت حال کا ذمہ دار کون ہے....؟؟ وہ نقاد جو ستائش باہمی کے نظریے کے تحت ہر الٹا سیدھا لکھنے والے کو زمانے کا مجدد ثابت کر دیتا ہے۔ یا وہ قاری جس کا ذہنی افق انتہائی پست ہو چکا ہے یا وہ معاشرہ جو غیر اہم چیزوں کو معتبر ثابت کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ (۲) بہر حال اس ناگفتہ بہ صورت حال کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ معتبر ناقدین نے چپ سادھ لی ہے اور زاغ و زغن بول رہے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ جب عالم کی پہچان یہ قرار دی جاتی تھی کہ وہ علم کے مختلف شعبوں میں کس حد تک عبور رکھتا ہے اور اپنے افکار و نظریات کی ترسیل سے علوم کے مختلف موضوعات و عنوانات کو کس طرح مالا مال کرتا ہے۔ گویا عالم کے لئے یہ ضروری قرار پاتا ہے کہ وہ علم کی مختلف جہتوں کو اپنے قلم کا اسیر ثابت کرے اور جب وہ قلم کو جنبش دے تو قرطاس پر حروف کی بجائے موتی چمکنے لگیں۔ بیسویں صدی کی علمی و ادبی کائنات میں نسیم امروہوی کی ایک ایسی شخصیت جگمگا رہی ہے جس نے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر علم و ادب کی مختلف شاخوں کو جس طرح ثمر دار بنایا ہے اس کی جتنی بھی مدح سرائی کی جائے کم ہے۔ انہوں نے بے پناہ خلوص، والہانہ جذبے اور بے پایاں شوق سے ہر کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی اور خود بھی سرخرو ہوئے اور مشتاقان ادب کو بھی سرخرو کیا۔ شاید ایسے ہی دیدہ ور لوگوں کے لئے حکیم سعدی نے کہا تھا:

''مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید''

نسیم امروہوی کی ایک صفت کی جانب ڈاکٹر عبید اللہ خان نے اشارہ کیا ہے آپ

---

(۲) شبیہ الحسن، ڈاکٹر، شام و سحر کی باتیں، لاہور، الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۹۱

بھی ملاحظہ فرمائیے:

''نسیم امروہوی ایسے ادیبوں اور فنکاروں میں سے تھے جو شہرت کے بھوکے نہیں ہوتے بلکہ دنیا سے الگ تھلگ رہ کر علمی و ادبی کارنامے انجام دینے کے لئے کسی گوشے کو تلاش کر کے پوری لگن کے ساتھ اس کام میں لگے رہتے ہیں''۔(۳)

آپ کا اسم گرامی سید قائم رضا اور تخلص قائم تھا۔ آپ ۲۷ رجب المرجب ۱۳۲۶ھ مطابق ۲۴ اگست ۱۹۰۸ء کو امروہہ ضلع مراد آباد (بھارت) میں متولد ہوئے۔(۴) اپنی ولادت کے بارے میں خود رقم طراز ہیں:

''فجر کے اس لمحے میں متولد ہوا جب پڑوس کی مسجد کا موذن اذان صبح کی پہلی تکبیر کہہ رہا تھا۔ کنبہ کی خواتین نے بعثت کے متبرک دن اور اذان صبح کی تکبیر اول، ان دونوں باتوں کو میرے حق میں فال نیک سمجھا''۔(۵)

ابتداء میں آپ اپنے تخلص کی نسبت سے قائم امروہوی کہلائے مگر بعد میں نواب سید باقر علی خان کی فرمائش پر اپنا تخلص ''نسیم'' رکھ لیا اور اسی نسبت سے ''نسیم امروہوی'' کے نام سے زبان زدِ عوام و خاص ہوئے۔ اس تخلص کی تبدیلی کا پورا واقعہ سید تصویر حسین نقوی نے قلم بند کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''مرثیہ ختم کر کے قائم منبر سے اتر رہے تھے کہ نواب سید باقر علی خان نسیم نے مجمع سے مخاطب ہو کر ایک اہم اعلان کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ سامعین خاموش ہو گئے اور سید صاحب نے اپنا تعارف کرانے کے بعد فرمایا کہ استاد کے انتقال کے وقت سے اب تک میں نے مرحوم کی ایک امانت احتیاط سے اپنے پاس رکھی ہے۔ وہ ہے ان کے جانشین کا تخلص یعنی ''نسیم'' جسے آخر عمر

---

(۳) عبیداللہ خان، ڈاکٹر (رائے) بجھی وہ شمع، لاہور، اظہار سنز، ۱۹۸۷ء، ص ۳۳

(۴) ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، کراچی، محمدی ٹرسٹ، ۱۹۹۴ء، ص ۵۰۱

(۵) نسیم امروہوی، مراثی نسیم (جلد سوم)، لاہور، اظہار سنز، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲

میں استاد مرحوم بہت پسند فرماتے تھے۔ اور ان کی تمنا بھی تھی کہ اب معجز یا
برجیس کی اولاد میں کوئی مرثیہ گو شاعر ہو تو میں اس کا یہ تخلص رکھوں۔ آج تک
میں اسی واسطے یہ تخلص اپنائے رہا کہ کوئی دوسرا شاعر اسے اپنے لئے مخصوص نہ
کرسکے، چنانچہ میں ''نسیم'' تخلص کرتا ہوں اور آج اس امانت کی ذمہ داری
سے سبکدوش ہوتا ہوں۔ استاد مرحوم کا صحیح وارث آج مجھے مل گیا اور یہ امانت
اس کے حوالے کرتا ہوں......'' (۶)

آپ کا سلسلۂ نسب انتیس کڑیوں کے توسط سے حضرت امام محمد تقیؑ سے جاملتا ہے، اس طرح آپ کا مکمل نام سید قائم رضا رضوی، نسیم امروہوی قرار دیا جاسکتا ہے۔ (۷)

نسیم امروہوی کا خاندان امروہہ میں علم و ادب کا گہوارہ قرار دیا جاتا تھا۔ (۸) حضرات کا تو کیا کہنا، خواتین بھی علم و ادب کے زیور سے آراستہ اور پیراستہ تھیں۔ اسی سبب سے نسیم امروہوی کی ابتدائی تعلیم کا بندوبست گھر پر کیا گیا۔ فارسی اور عربی کے ابتدائی اسباق منشی حمید حسن اور مولانا باقر حسین سے پڑھے۔ انگریزی کی باقاعدہ تعلیم اپنے نانا سید ذکی حسن سے حاصل کی، مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا، وہ خود رقم طراز ہیں:

''جب میں اردو کی رواجی کتابیں اور قرآن شریف نصف سے زیادہ پڑھ
چکا تو نانا مرحوم نے (جو والد اور دادا کی رحلت کے بعد میرے سرپرست
تھے) مجھے انگلش گرامر شروع کرائی۔ رات کو جب والدہ حسب معمول آج
کا سبق یاد کرانے کے لئے بیٹھیں تو انگلش گرامر کی شکل دیکھتے ہی مارے غصے
کے آگ بگولا ہو گئیں۔ کتاب مجھ سے چھین کر پھاڑ ڈالی اور دوسرے دن

---

(۶) تصویر حسین، نقوی ''نسیم امروہوی کا پہلا مرثیہ اور اس کی مجلس'' مشمولہ عرفان نسیم، کراچی، انجمن سادات امروہہ ۱۹۷۴ء، ص ۳۲

(۷) بلال نقوی، ڈاکٹر (مرتب) ارمغان نسیم، کراچی، انجمن سادات امروہہ ۱۹۹۱ء، ص ابتدائی

(۸) رئیس امروہوی ''نسیم امروہوی۔ شخص و شاعر'' مشمولہ ارمغان نسیم، کراچی، انجمن سادات امروہہ، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱

جامعۂ نورالمدارس (امروہہ) سے جو ہمارے گھر سے کوئی دو ڈھائی سو قدم کے فاصلے پر تھا) منشی حمید حسن مرحوم کو بلوا کر مجھے ان کے سپرد کر دیا....." (۹)

آپ نے جامعۂ نورالمدارس میں فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی اورینٹل کالج میں منشی فاضل کا امتحان دیا اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ مولانا سید مرتضیٰ حسین اور مولانا یوسف حسین مجتہدین کی شبانہ روز محنت کا یہ نتیجہ نکلا کہ نسیمؔ امروہوی نے مولوی فاضل، عالم فاضل اور نورالافاضل (درس نظامی) کے امتحانات مختلف اوقات میں امتیازی نمبروں سے پاس کر لئے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے تعلیمی میدان میں کئی اسناد حاصل کیں اور اپنے اساتذہ کا نام روشن کیا۔

نسیمؔ امروہوی کو شعری ذوق ورثے میں ملا تھا۔ (۱۰) ان کے ننھیال اور ددھیال دونوں میں اہل علم و ادب کی بہتات تھی اور خاص طور پر ان کے ددھیال میں بعض یگانۂ روزگار شخصیات پیدا ہوئی تھیں۔ شاعری کا باقاعدہ سلسلہ چار نسلوں سے متواتر چلا آ رہا تھا۔ نسیمؔ امروہوی کے جدِامجد خادم حسین ولیؔ ایک صاحب طرز مرثیہ نگار تھے۔ ان کے بیٹے حیدر حسین یکتاؔ بھی مرثیہ نگار تھے اور انہیں حضرت امام حسینؑ سے بے پناہ عقیدت و الفت تھی۔ یہی عقیدت مودت کا روپ دھار کر ان کے صاحبزادے جواد حسین شمیمؔ کے رگ و پے میں سما گئی اور وہ تمام عمر حضرت حسینؑ کی مداحی کرتے رہے۔ شمیمؔ امروہوی صاحب طرز ادیب، شاعر اور بے مثال مرثیہ نگار تھے اور اپنی شاعرانہ خوبیوں کی وجہ سے "فرزدق ہند" کے خطاب سے نوازے گئے۔ ان کے صاحبزادے اور نسیمؔ امروہوی کے والد برجیس حسین برجیسؔ ایک مردِ مومن اور کامیاب مرثیہ گو تھے۔ ان کے بے شمار مراثی آج بھی اہل سخن سے داد وصول کر رہے ہیں۔ (۱۱)

---

(۹) نسیم امروہوی 'مراثی نسیم (جلد سوم)' لاہور 'اظہار سنز' ۱۹۸۶ء 'ص ۱۹

(۱۰) رئیس امروہوی 'نسیم امروہوی۔ شخص و شاعر (مقدمہ)' مراثی نسیم (جلد دوم)' کراچی 'پاکستان ریڈرس گلڈ' ۱۹۷۶ء 'ص ۲

(۱۱) صفدر حسین 'ڈاکٹر (مقدمہ)' مراثی نسیم (جلد اول)' کراچی 'علی اطہر جعفری ناشر' ۱۹۶۲ء 'ص ۹

نسیمؔ امروہوی نے اپنے دادا شمیم امروہوی کے زیرِ تربیت شاعری کا آغاز کیا، ابھی ان کی عمر صرف گیارہ برس تھی (۱۲) کہ والدہ کے اصرار پر انہوں نے دو شعر کہے اور دادا کی خدمت میں پیش کیے۔ انہوں نے جزوی اصلاح دی اور اس طرح نسیم امروہوی باقاعدہ شاعروں کے زمرے میں آگئے۔ نسیمؔ امروہوی کے اصلاح شدہ اشعار یہ ہیں:

ہمارے محمدؐ تمہارے محمدؐ   سبھی اُمتی کے سہارے محمدؐ
سحر اٹھ کے ہم جن کا پڑھتے ہیں کلمہ   وہ ہیں آمنہؓ کے دلارے محمدؐ

والد اور دادا کے انتقال کے بعد نسیمؔ امروہوی نے غزل گوئی کے میدان میں قدم رکھا اور سید انوار الحسن اور سید عسکری رضا عرشؔ سے اصلاح لی۔ ابتدائی غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

نہ روکو ہاتھ کو، خنجر گلے پہ چلنے دو   ہمارے دل کی تمنا تو کچھ نکلنے دو
چکھائی حضرت واعظ نے تلخیٔ گفتار   ذرا سی مے سے مجھے ذائقہ بدلنے دو

کہیں ہے رنگِ حقیقت کہیں مجاز کی بو
چمن کے رنگ دکھائے مری غزل نے دو

نسیمؔ امروہوی کی غزلوں میں ایک خاص انداز کا بانکپن جھلکتا ہے۔ ان کے ہاں لکھنوی لب و لہجہ کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی چند معروف غزلوں کے منتخب اشعار ملاحظہ فرمایئے:

مرنے کی آرزو میں جیے جا رہا ہوں میں   منزل کو ساتھ ساتھ لئے جا رہا ہوں میں
ترجیح دے کے غم کو نشاطِ دوام پر   قسمت سے انتقام لئے جا رہا ہوں میں

اس سنگِ آستاں کو غرض ہو تو خود بڑھے
سجدے تو اپنی دھن میں کیے جا رہا ہوں میں

نسیم امروہوی کی غزل گوئی کا زمانہ بہت مختصر ہے لیکن وہ عمر بھر اس صنف کی زلف گرہ گیر کے اسیر رہے۔ نسیم امروہوی کی غزلیات کا کوئی جدا مجموعہ تو شائع نہ ہو سکا تاہم ان کی

---

(۱۲) طاہر حسین، کاظمی، ڈاکٹر ’اردو مرثیہ۔ میر انیس کے بعد‘ دہلی ایرانین پریس، ۱۹۹۷ء ص ۱۳۷

غزل کے مداحین میں جون ایلیا بھی شامل رہے ہیں۔(۱۳) تاہم نسیم امروہوی اپنی غزل گوئی کو بھی کوئی مقام دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔(۱۴) نسیم امروہوی کے غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

نہ تجلی، نہ رخ، نہ آئینہ — اب تو کچھ بھی نظر نہیں آتا
لذتِ موت بھی ہے کیا لذت — یہ مزا عمر بھر نہیں آتا
یا تو راہِ عشق میں دل کی کوئی منزل نہیں — یا کوئی منزل بہ قدر آرزوئے دل نہیں

ناخدائے عشق میری ہمتوں کی داد دے
میں وہاں کشتی ڈبوتا ہوں، جہاں ساحل نہیں

اپنی جدت طبع اور شاعرانہ ماحول کے زیر اثر نسیم امروہوی جلد ہی شعرائے امروہہ میں اپنے لئے مقام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سلسلے میں وہ خود رقمطراز ہیں:

> ''سرزمین امروہہ پر جہاں بڑے بڑے خوش فکر شاعروں کا ہجوم تھا، ایک لڑکے کے کلام کا پھلنا پھولنا اور سرسبز ہونا کوئی آسان بات نہ تھی۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ دادا مرحوم اور دیگر اسلاف کو کم وبیش ایک صدی سے امروہہ میں وہ شاعرانہ عظمت حاصل تھی کہ بزم شعر وسخن میں ہمیشہ قیادت اور صدرنشینی کا مسلمہ استحقاق رکھتے تھے اور ان کے اعتراف کمال کی نیت سے برادری نے یہ تاج مجھے بھی پہنا دیا تھا......'' (۱۵)

امروہہ کے بعد نسیم امروہوی میرٹھ پہنچے۔ کچھ عرصہ قیام کیا اور پھر لکھنؤ سکونت اختیار کی۔ لکھنؤ کے شعری اور ادبی ماحول نے ان کی شاعری پر ایک خوشگوار اثر ڈالا۔ شعراء وعلمائے لکھنؤ سے

---

(۱۳) جون ایلیا ''کچھ ذکر نسیم کی غزل گوئی کا'' مشمولہ ارمغان نسیم' کراچی: انجمن سادات امروہہ' ۱۹۹۱ء' ص ۹۶

(۱۴) نسیم امروہوی' مراثی نسیم (جلد سوم)' لاہور' اظہار سنز' ۱۹۸۶ء' ۱۲۸

(۱۵) نسیم امروہوی' مراثی نسیم (جلد سوم)' لاہور' اظہار سنز' ۱۹۸۶ء' ص ۵۱

استفادہ کیا اور اپنے مخصوص انداز شاعری سے خوب نام کمایا۔(۱۶) اس سلسلے میں وہ خود رقمطراز ہیں:

"لکھنو کے قیام میں مجھے شعر وسخن کا ماحول بھی ملا اور اساتذہ فن اور علماء کی صحبتیں بھی نصیب ہوئیں...... غرضیکہ دن رات کی ان صحبتوں اور شاعرانہ ماحول کا میری مرثیہ گوئی پر بہت اچھا اثر پڑا۔ میں نے خود بھی بہت جلد محسوس کیا کہ اب میرے انداز فکر اور حسن بندش میں روز بروز ایک خوشگوار تبدیلی آتی جارہی ہے......(۱۷)

نسیم امروہوی نے لکھنو سے ہجرت کی اور ۱۵ مئی ۱۹۵۰ء کو پاکستان پہنچے اور کراچی ان کا مستقر ٹھہرا۔ کراچی کی علمی اور ادبی فضا کو آپ نے اپنے شعری افکار سے مالا مال کیا اور گہرے نقوش چھوڑے۔ اس کے بعد آپ سندھ کے ایک علاقے خیر پور میرس میں گوشہ نشین ہو گئے، اور تمام زندگی علم وادب کی خدمت کرتے رہے۔ سندھ اور خصوصا کراچی میں انہوں نے علم وادب کی جو خدمت کی ہے، اسے اس مختصر سے مضمون میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ آخر کار مشرقی تہذیب وتمدن کا یہ جیتا جاگتا نمونہ علم وادب کو گریہ کناں چھوڑ کر ۲۸ فروری ۱۹۸۷ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملا.....(۱۸)

انا للہ وانا الیہ راجعون ۝

حضرت رئیس امروہوی نے آپ کے انتقال پر اپنے جذبات ان اشعار میں پیش کیے:

میر و مرزا کی زمانے میں نشانی تھے نسیم
مرثیہ گوئی میں استادِ معانی تھے نسیم

---

(۱۶) ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، کراچی، محمدی ٹرسٹ، ۱۹۹۴ء، ص ۵۰۵

(۱۷) نسیم امروہوی، مراثی نسیم (جلد سوم) لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۶ء، ص ۵۱

(۱۸) شبیہ الحسن (مرتب)، بجھی وہ شمع، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳

ان کے اعجازِ سخن سے تھے سخنور عاجز
ہمہ تن معجزۂ تازہ بیانی تھے نسیمؔ (۱۹)

نسیم امروہوی کی وفات حسرت آیات کے بعد سب سے پہلے راقم الحروف نے ۱۹۸۷ء میں ''بجھی وہ شمع'' کے عنوان سے ایک مختصر کتاب ترتیب دی۔ جسے اظہار سنز نے بڑے سلیقے اور اہتمام سے شائع کیا۔ (۲۰) اس کتاب کو راقم الحروف نے چھ حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اس کے عنوانات درج ذیل ہیں۔

(۱) پس و پیش (دیباچہ)

(۲) نسیم سحر (سوانح حیات و موضوعات فن)

(۳) احساسات (مشاہیر علم و ادب کے تاثرات)

(۴) خراج تحسین (منظوم نذرانۂ عقیدت)

(۵) مکاتیب نسیم (غیر مطبوعہ)

(۶) اوراق گل (انتخاب کلام)

اس کتاب میں پہلی مرتبہ پاکستان کے نامور دانشوروں اور شعرا نے نسیمؔ امروہوی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جن ادیبوں اور دانشوروں نے راقم کی درخواست پر اپنے خیالات و احساسات رقم کیے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر آغا سہیل، شاعر حسینیت قیصر بارہوی، پروفیسر جیلانی کامران، پروفیسر سجاد حارث، ڈاکٹر سہیل احمد خان، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ڈاکٹر عبید اللہ خان، پروفیسر سجاد رضوی، ڈاکٹر حسن رضوی، پروفیسر عارف عبدالمتین، حفیظ تائب، انتظار حسین، سید سبط الحسن ضیغم، وارث سرہندی، ڈاکٹر اسلم رانا، سید وحید الحسن

---

(۱۹) رئیس امروہوی، روزنامہ ''جنگ'' کراچی، جمعہ ۶ مارچ ۱۹۸۷ء

(۲۰) شبیہ الحسن (مرتب)، بجھی وہ شمع، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۷ء

ہاشمی، یونس جاوید، ڈاکٹر طارق عزیز، ڈاکٹر سید مرتضٰی زیدی، قائم نقوی، محمد علی اعظم رضوی، سید اظہار الحسن رضوی، جمیل احمد رضوی، شیخ صفدر علی، ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری اور ڈاکٹر ناہید شاہد۔(۲۱)

نسیم امروہوی کو منظوم خراج تحسین پیش کرنے والوں میں قیصر بارہوی، سید وحید الحسن ہاشمی، ظفر جونپوری، ظہور حیدر جارچوی، ڈاکٹر شبیہ الحسن، شائق زیدی، حسن عسکری کاظمی کے اسمائے گرامی بطور خاص شامل ہیں۔ حضرت قیصر بارہوی نے ''بجھی وہ شمع'' کے حوالے سے ایک نظم زیب قرطاس کی تھی قارئین کی دلچسپی کے لیئے پیش خدمت ہے۔

جائزہ

چنا ہے دستِ اجل نے وہ بے مثال گلاب
چمن پہ شب کی طرح چھا گئے غموں کے سحاب
بساطِ فکر و نظر پر کسے محیط کہوں
نہاں ہوا ادبیت کا مہر عالمتاب
میں دیکھتا ہوں بہت شمعیں جل رہی ہیں مگر
''بجھی وہ شمع'' نہ تھا جس کی روشنی کا جواب
وہ ایک شخص، وہ اِک انجمن، وہ اِک دنیا
وہ حرف حرف سمندر وہ لفظ لفظ کتاب
وہ نکتہ داں وہ محقق وہ عالمِ تاریخ
وہ اِک فقیہہ وہ اِک معتمد رئیس نصاب
وہ وضعدارِ جہانِ شرف، امینِ عمل
سخاوتوں میں وہ خورشید آسمان ثواب

---

(۲۱) ''بجھی وہ شمع'' کی بیشتر چیزیں ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنی مرتبہ کتاب ''ارمغان نسیم'' میں بھی شائع کر دی ہیں۔

وہ گلستانِ سخن کے لئے ''نسیم سحر''

خطاب ''شاعر آل محمدؐ'' اس کا خطاب

وہ اک محافظِ اقدار مرثیہ گوئی

حسینیت کا مبلغ انیسیت کا شباب

ابھی تو محوِ تکلم تھا وہ امیر زبان

یہ کس نے ڈال دیا حشرِ خامشی کا نقاب

کھلا یہ رازِ کلامِ نسیم سے قیصر

سخنوری کے صحیفے کو مل گئے اعراب

نسیمؔ امروہوی امروہے کے ایک علمی و ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے خاندان میں فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والوں کی ہمیشہ کثرت رہی۔اس خاندان نے شعرو ادب کے علاوہ دیگر فنون مثلاً مصوری، صحافت، نفسیات وغیرہ میں بھی خوب نام کمایا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر سجاد باقر رضوی رقم طراز ہیں:

> ''ان کا تعلق امروہے کے اس خانوادے سے تھا جو اپنی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کے لئے پورے برصغیر میں معروف ہے۔اپنے خاندان کے دیگر اہل کمال لوگوں کی طرح نسیم امروہوی بھی صاحب کمال بزرگ تھے''۔(۲۲)

اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ علم وادب سے یہ والہانہ شیفتگی انہیں ورثے میں ملی تھی، البتہ نسیمؔ امروہوی کا کمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے خاندان کے اہل کمال بزرگوں کے ان بکھرے محاسن وکمالات کو اپنی ذات میں یکجا کرلیا تھا یہی سبب ہے کہ ان کے ہاں موضوعات و افکار کا ایک ناپیدا کنار سمندر ٹھاٹھیں ماررہا ہے۔

نسیمؔ امروہوی نے طبعی میلانات کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں کی روشنی میں بھی

---

(۲۲) شبیہ الحسن (مرتب)، بجھی وہ شمع، لاہور، اظہار سنز، ۱۹۸۷ء، ص ۲۶

طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے شعرو ادب کا تمام عمر سنجیدگی سے مطالعہ کیا اور اس میدان میں ایک ماہر فنکار اور دانش مند ادیب کی طرح خامہ فرسائی کرتے رہے۔ اسی وجہ سے ان کے موضوعات متنوع اور ان کی شخصیت جامع الحیثیات قرار دی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر جیلانی کامران رقمطراز ہیں:

''نسیم امروہوی ہمارے عہد کے ان ادیبوں میں شامل ہیں جو ادب کو سنجیدہ مطالعے اور شعری طبعیت کو روایت کے عالی قدر معیاروں کے حوالے سے پہچانتے ہیں.....'' (۲۳)

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ نسیم امروہوی ایک متنوع الجہات شخصیت کے مالک ہیں یہی سبب ہے کہ معتبر تخلیق کاروں کی طرح انہوں نے یک سمتی سفر نہیں کیا ہے بلکہ جس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اس میں اپنے تخلیقی جوہر دکھائے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

''پرانے ادیبوں اور شاعروں کی زندگی اور کارناموں کو ذہن میں ابھاریے تو اندازہ ہوگا کہ ان میں سے بیشتر جامع الصفات ہوتے تھے۔ علوم وفنون کی جملہ شاخوں تک یکساں رسائی حاصل ہوا کرتی تھی اور نثر و نظم کی جس صنف کو ہاتھ لگاتے تھے، ادنیٰ توجہ سے اسے ایک نیا رنگ، روپ دے جاتے تھے لیکن اب یہ صورت باقی نہیں رہی ہمارے عہد کے شاعر و ادیب بالعموم یک صنفت و یک فن ہوتے ہیں، کوئی مرثیہ نگار ہے، کوئی غزل گو، کوئی مزاح نگار ہے کوئی نظم گو، کوئی نقاد ہے کوئی شاعر، کوئی مقالہ نگار ہے کوئی لغت نویس، کوئی محقق ہے کوئی مترجم، کوئی انشاپرداز ہے اور کوئی افسانہ نویس، ایسے بہت کم لوگ ہیں جو زبان و ادب کے مختلف شعبوں میں بیک وقت کوئی قابل ذکر نشان بنانے کی صلاحیت رکھتے ہوں البتہ نسیم امروہوی ان گنے چنے ادیبوں اور شاعروں میں سے ہیں جن میں پرانے ادیبوں اور شاعروں کی خوبو اور ہمہ

---

(۲۳) شبیہ الحسن (مرتب)، بجھی وہ شمع، لاہور، اظہار سنز، ۱۹۸۷ء، ص ۲۹

گیری نظر آتی ہے۔ان ہی جیسے لوگوں کے دم سے ہمارے ہاں شعر گوئی اور شعر فہمی زبان دانی وتبحر علمی اور نکتہ سنجی ونکتہ آفرینی کا بھرم ہنوز قائم ہے'' (۲۴)

نسیم امروہوی نے علم وادب کے مختلف اصناف میں خامہ فرسائی کی اور ہر صنف میں اپنی فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے، ان کے ہاں موضوعات کا ایک حیرت انگیز تنوع ملتا ہے۔ان کی ایک صد سے زائد شائع شدہ تصنیفات وتالیفات (۲۵) اس بات پر دال ہیں کہ وہ ایک حیرت انگیز دماغ کے مالک تھے اور یہ محاسن وکمالات کسی ایک انسان میں یکجا ہو جانا کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ان کی تمام علمی وادبی خدمات کا احاطہ تو اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں۔تاہم ان کے اہم کارناموں کا ایک موضوعاتی مطالعہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ہم نے ابتداً تمام موضوعات کو اہم عنوانات کی صورت میں تقسیم کیا ہے اور ان عنوانات کے ذیلی وضمنی موضوعات پر بھی مختصر روشنی ڈالی ہے۔آخر میں موضوعات کے حوالے سے نسیم امروہوی کی تصنیفات وتالیفات بالترتیب پیش کر دی گئی ہیں۔

شاعری:

انیسؔ ودبیرؔ نے ''اردو مرثیہ'' کی راہیں اس قدر طویل اور کشادہ کر دیں کہ دیگر مرثیہ نگار اس میدان میں طبع آزمائی کے فوراً بعد ہی ہانپ جاتے یا کانوں کو ہاتھ لگا کر قلم رکھ کر

---

(۲۴) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر (دیباچہ) ''صبح ازل''، لاہور: نامی پریس، ۱۹۸۱ء، ص ۷

(۲۵) نسیم امروہوی کی تصانیف کی فہرست درج ذیل تصنیفات وتالیفات میں دیکھی جا سکتی ہیں

(ا) نسیم امروہوی، مراثی نسیم (جلد دوم)، کراچی: پاکستان ریڈرس گلڈ، ۱۹۷۶ء، ص ر

(ب) نسیم امروہوی، مراثی نسیم (جلد سوم)، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۰

(ج) ہلال نقوی، ڈاکٹر (مرتب) ''ارمغان نسیم''، کراچی: انجمن سادات امروہہ، ۱۹۹۱ء، ص ۱۸۵

(د) شبیہ الحسن، ڈاکٹر (مرتب)، بجھی وہ شمع، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۷ء، ص ۱۹

(ر) ضمیر اختر نقوی، اردو مرثیہ پاکستان میں، کراچی: سید اینڈ سید، ۱۹۸۲ء

(س) ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، کراچی: محمدی ٹرسٹ، ۱۹۹۵ء، ص ۵۲۱

(ص) شبیہ الحسن، ڈاکٹر، ترجیحات، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۹۸ء، ص ۸۲

صاف لفظوں میں کہہ دیتے:

''یہ انہی کا حق ہے''۔

مگر آفرین ہے نسیم امروہوی پر، جنہوں نے انیس و دبیر کی روایت کی پاسداری بھی کی اور اپنے لئے ایک علیحدہ راہ بھی نکالنے میں کامیاب و کامران ہوئے۔ بقول پروفیسر عارف عبدالمتین:

''سوادِ مرثیہ میں انہوں نے اردو کی اس عظیم صنفِ سخن کی عظیم روایت کے دل پذیر تسلسل کا یوں اہتمام کیا کہ عہدِ نو کے تہذیبی و ثقافتی تقاضوں کا درخشاں پہلو بھی نظر انداز نہ ہونے پایا......'' (۲۶)

اس سلسلے میں عاشور کاظمی کی رائے بھی دیکھ لیجیے:

''انہوں نے قدیم لہجے اور اسلوب میں جدید فکر سمونے کی کوشش کی جسے مدھم آنچ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جو حرارت تو باقی رکھتی ہے لیکن اس سے آگے کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی...... یہی نہیں کہ وہ ہمارے عہد میں مرثیے کی کلاسیکی روایت کے آخری شاعر ہیں بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اس عہد میں اور اس تناظر میں ان کا کوئی مدمقابل بھی نہیں ہے''۔ (۲۷)

نسیم امروہوی نے اردو مرثیہ کو مواد اور ہیئت ہر اعتبار سے جدید عہد کے تقاضوں سے بہرہ ور کیا۔ انہوں نے اپنے مرثیوں میں عصری آشوب اور جدید شعری رجحانات اور میلانات کو جگہ دی۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مرثیوں میں جدید اسلوب اور فکر کے بے شمار خزانے پوشیدہ ہیں۔ اسی باعث نوجوان نقاد نوازحسن زیدی نے نسیم امروہوی کو حالی و اقبال کی توسیع قرار دیا ہے۔ (۲۸) نسیم امروہوی کے مرثیوں کی حتمی فہرست ہمارے پاس نہیں تاہم اندازہ ہے کہ انہوں نے ۲۲۸ سے زائد مرثیے کہے اور سینکڑوں مرثیہ نگاروں کے ہزاروں

---

(۲۶) عارف عبدالمتین (رائے) ''بجھی وہ شمع'' لاہور: اظہار سنز' ۱۹۸۷ء' ص ۳۸

(۲۷) عاشور کاظمی' سید' مرثیہ نظم کی اصناف میں' دہلی' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس' ۱۹۹۶ء' ص ۶۵

(۲۸) نوازحسن زیدی' سید' نجم آفندی۔ فکر و فن' لاہور' الحسن پبلی کیشنز' ۲۰۰۰ء' ص ۲۹۰

مرثیوں کی نوک پلک درست کی۔ اس طرح نسیم امروہوی اس صنف سخن کے شاعر ہی نہیں بلکہ دبستان قرار دیئے جاسکتے ہیں۔(۲۹)

اردو زبان میں "شخصی مرثیوں" کا باقاعدہ آغاز تو بہت پہلے ہو چکا تھا مگر اسے عروج انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں نصیب ہوا۔ نسیم امروہوی اس طرز مدح سرائی کو عصری ضرورت قرار دیتے تھے اور اس کی افادیت سے باخبر تھے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے بھی آٹھ شخصی مرثیے کہے، جو شائقین علم و ادب میں بے حد مقبول ہوئے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی کا یہ موقف بالکل درست ہے کہ نسیم امروہوی کی شعری عظمت میں ان کے مرثیوں کا بھی خاص دخل ہے۔(۳۰)

"غزل" کو ناقدین ادب نے اردو شاعری کی آبرو کہا ہے، مگر ہمارے خیال میں یہ اردو شاعری کی ضرورت ہے۔ کسی بھی صنف سخن میں نامور ہونے والا شاعر ابتدأ غزل گو ضرور ہوتا ہے۔ نسیم امروہوی نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ اس میں کچھ تو احباب کی فرمائش کو دخل رہا ہے اور کچھ ماحول کے تقاضوں کو۔ تاہم انہوں نے مشاعروں میں غزل سرائی سے ہر عہد میں پرہیز کیا۔ آخر عمر میں انہوں نے مرثیہ کی طرف اپنی تمام تر توجہ مبذول کر کے غزل گوئی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس کنارہ کشی کے دو اسباب انہوں نے خود بیان فرمائے ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

> "موجودہ دور میں غزل نام کی جو نظم رائج ہوئی وہ یا تو ایک نئے اسلوب میں مذکورہ ادوار کا پرتو ہوتی ہے یا خرمن درخرمن ایسی تخیل ہوتی ہے جس میں معاشیات، غریب کی حمایت، مزدور کی سرپرستی، سرمائے اور پرستش زر سے نفرت اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے، مگر تغزل نہیں ہوتا..... میں تغزل سے بے

---

(۲۹) مہدی نظمی: "عہدِ حاضر کے ممتاز پاکستانی مرثیہ گو شعرا" مشمولہ اُردو مرثیہ مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی، دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۴۲

(۳۰) ہلال نقوی، ڈاکٹر: بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، کراچی، محمدی ٹرسٹ، ۱۹۹۵ء، ص ۵۳۳

بہرہ نہیں، مگر اسے محمدؐ و آلِ محمدؐ کی مدح سے فروتر سمجھتا ہوں، اسی لئے حتی الامکان اس سے دور رہنا چاہتا ہوں.....'' (۳۱)

اب اس حوالے سے ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''ان تمام منزلوں سے گزرنے کے بعد مجھے اعتراف ہے کہ میں تغزل کو برتنے سے صرف اتنی ہی دلچسپی رکھتا ہوں کہ مرثیے میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے جہاں اس کا سہارا لینے کی ضرورت پڑے وہاں قلم کو شکستگی کا اور طبیعت کو خستگی کا احساس نہ ہو۔ یہ ہے میرے تغزل کی داستان اور اس وادی میں تخیل کی سرگزشت!'' (۳۲)

مندرجہ بالا عبارت کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ نسیم امروہوی نے کافی تعداد میں غزلیں کہی ہیں، ان غزلوں میں سے کچھ تو مطبوعہ صورت میں موجود ہیں اور کچھ تلاش کے بعد حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ان کی غیر مطبوعہ غزلوں کی اشاعت وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس طرح ہم نسیم امروہوی کی شاعری میں غزل گوئی کے حوالے سے جنم لینے والے اثرات کا کھوج لگا سکتے ہیں۔

نسیم امروہوی نے ''سلام'' ''قصیدے'' اور ''رباعی'' کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی اور اپنی طبع کے خوب جوہر دکھائے۔ انہوں نے بے شمار سلام و قصائد اور لاتعداد رباعیات کہیں مگر ان کی خاطر خواہ اشاعت کا انتظام و اہتمام نہ ہو سکا۔ میری معلومات کے مطابق انہوں نے ایک صد سے زیادہ سلام، پچاس سے زائد قصائد اور دو صد سے زیادہ رباعیات کہیں۔ یہ تمام کلام ملک کے معروف دینی اور ادبی رسائل کی زینت بنتا رہا ہے۔ ان مذہبی شہ پاروں میں ایک طرف تو مذہب سے والہانہ جذباتی لگاؤ کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں اور دوسری سمت سماجی اور اخلاقی اقدار کی بقا کے لئے واضح اشارے بھی موجود ہیں۔ اس طرح نسیم

---

(۳۱) نسیم امروہوی ''مراثی نسیم'' (جلد سوم) لاہور، اظہار سنز، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۹

(۳۲) ایضاً ص ۱۳۱

امروہوی نے عقیدت کے ان گلدستوں میں مذہب اور اخلاق کے خوشبودار پھول سجا کر پیش کر دیئے ہیں۔ ان کے سلام، رباعیات اور قصائد کے علیحدہ مجموعے ہنوز شائع نہیں ہو سکے ہیں۔ اس سلسلے میں پیش رفت کی شدید ضرورت ہے۔

نسیم امروہوی نے ''نظم کی صنف'' کو بھی اپنے افکار عالیہ سے مالا مال کیا ہے۔ بیسویں صدی میں اپنے خیالات کے موثر اظہار کے لئے شعرا نے نظم کی صنف کا سہارا لیا۔ اس خصوصی توجہ کی بنا پر صنف نظم کے موضوعات میں اضافہ ہوا اور ہر قسم کے خیالات اس میں سمانے لگے۔ اقبال اور ترقی پسند شعراء نے تو اس صنف کی خوب آبیاری کی، اور اسے معراج کمال تک پہنچا دیا۔ نسیم امروہوی نے عہد بہ عہد بدلتے ہوئے حالات اور رجحانات پر ہمیشہ گہری نگاہ رکھی اور ان کو شاعرانہ لباس پہناتے رہے۔ انہوں نے دوررس نگاہوں سے حالات کا تجزیہ کیا اور قوم کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ اس سلسلے میں پروفیسر سید وقار عظیم کی یہ گراں قدر رائے ملاحظہ فرمایئے:

> ''برق وباراں'' بدیہی طور پر قومی اور اصلاحی نظم ہے لیکن واقعات کے بیان میں رزم و بزم کی مصوری کے جداگانہ شرائط کا لحاظ، اوصاف و فضائل کے ذکر میں تعقل و تفکر کی کارفرمائی اور حقائق کے اظہار میں سبب اور نتیجے کے منطقی تعلق کا احساس ایسی چیزیں ہیں جو اس قومی نظم کو اس نسیم نے دی ہیں جو شاعر اہل بیت ہے اور جو فن مرثیہ نگاری میں انیس کا تتبع اور ان کی شاعرانہ روایت کا پرستار ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ''برق وباراں'' کے قومی مزاج کی تشکیل میں حالی اور اقبال کے فکروفن کے اثرات زیادہ واضح ہیں''۔ (۳۳)

نسیم امروہوی نے سمجھدار مسیحا کی طرح مریض کا نہیں، مرض کا علاج کرنے کی سعی کی۔ انہوں نے سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی، دینی، اخلاقی، غرض ہر موضوع پر منظومات

---

(۳۳) وقار عظیم، سید: ''نسیم امروہوی کی طویل قومی و اصلاحی نظم برق وباراں'' مشمولہ ارمغان نسیم، کراچی: انجمن سادات امروہہ، ۱۹۹۱ء، ص ۲۵

کے ذریعے سے اپنا اصلاحی نقطہ نظر پیش کیا اور آنے والے وقت نے ان کے خیالات کی تائید و توثیق کی۔ برصغیر پاک و ہند میں سیاسی بیداری کے لئے جن شعراء نے کاوشیں کیں، ان میں نسیم امروہوی کا نام بھی پیش پیش ہے اور خصوصاً پاکستان کے قیام کے پس منظر میں لکھی جانے والی ان کی بعض منظومات کی تاثیر و اثرات کی داستان بعض بزرگوں کے ذہنوں میں آج بھی محفوظ ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی نے انہیں ''مصلح شاعر'' قرار دیا ہے۔ (۳۴)

منظومات کے سلسلے میں نسیم امروہوی کا یہ کارنامہ بھی یادگار رہے گا کہ انہوں نے بچوں میں شاعرانہ شعور پیدا کرنے کی علمی کوششیں اور کاوشیں کیں۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے معمولی موضوعات پر نہایت رواں اور متین اسلوب میں نظمیں کہیں جن میں اصلاحی رویہ بھی کارفرما رہا۔ ان کی یہ منظومات ہر دور میں مقبول رہیں اور اسی سبب سے درسی کتابوں کی زینت بنیں۔ نسیم امروہوی کے موضوع کی یہ جہت بھی نہایت اہم ہے۔ اس سلسلے میں محترمہ نسرین عباس رضوی کی یہ گراں قدر رائے ملاحظہ فرمائیے:

> ''شاعری کی سطح پر بچوں کے ادب کا فروغ بہت اہم مرحلہ ہے۔ قوموں کے استحکام اور معاشرے کی استواری و مضبوطی کا انحصار بچوں کی ذہنی پرورش پر ہے جس کا ثمر مستقبل کے شجر پر نمودار ہوتا ہے۔ اس ثمر کی نمود میں شعری ذوق کی کارفرمائیاں بھی اہم ہیں۔ اس میدان میں بھی بچوں کے لئے نسیم صاحب نے بڑے یادگار نمونے چھوڑے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی بعض نظمیں یہ ہیں۔ ''جنگل کا شہزادہ، سورج سے دو دو باتیں، رنگ برنگے پھول، تتلیاں، دیہات کی صبح، پریم سویا، امید کے کرشمے، پالن ہار، میٹھی میٹھی نیند، وطن کی جان، اٹھ وطن کے سورما اور مرغی کا بچہ اور بطا''۔ (۳۵)

---

(۳۴) طاہر حسین کاظمی، ڈاکٹر 'اردو مرثیہ میر انیس کے بعد' دہلی ایرانین پریس' ۱۹۹۷ء، ص ۱۴۸

(۳۵) نسرین عباس رضوی 'بچوں کا ادب اور نسیم امروہوی'' مشمولہ ارمغانِ نسیم' کراچی: انجمن سادات امروہہ' ۱۹۹۱ء، ص ۱۷۰

لسانیات:

لفظ شناسی ایک نہایت کٹھن شعبہ ہے۔ موقع محل کے مطابق درست جگہ پر درست لفظ کے استعمال کا فن بہت دشوار ہے۔ یہی سبب ہے کہ اکثر لوگوں کے حصے میں یہ ہنر نہیں آ سکا۔ اس کے لئے شدید محنت، مسلسل لگن اور بے پناہ ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر لفظ اپنا علیحدہ تہذیبی و ثقافتی پس منظر بھی رکھتا ہے، جس سے آگاہ ہونا بھی از بس کہ ضروری ہے۔ اس اعتبار سے لفظ شناس ہونے کا کیا مطلب بر آمد ہوتا ہے، بقول ڈاکٹر سہیل احمد خان:

> ''الفاظ کو زندہ انسانوں کی طرح محسوس کرنا، یہ ہنر کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے، نسیم امروہوی صاحب کی لغت نویسی ہو یا مرثیہ نگاری، لفظوں سے اس زندہ تعلق کی ترجمانی ہے۔ الفاظ کے چاروں اور پھیلی ہوئی تہذیبی اقدار اور الفاظ میں گہرا ربط تلاش کرتے ہیں۔ لفظوں سے اپنے اس ربط خصوصی کی وجہ سے لغت نویسی کے کٹھن مراحل ان کے لئے آسان ٹھہرے......'' (۳۶)

لسانیات کا علم دراصل دیگر علوم کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ تمام دنیا میں اس علم کی مختلف شاخوں پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج کل طالبان شوق لسانیات سے خاصی دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ نسیم امروہوی نے بھی لسانیات کی ذیلی و ضمنی شاخوں سے تعلق جوڑا ہے اور اس سلسلے میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ذیل میں لسانیات کے ضمن میں ان کے چند خصوصی رخ پیش کئے جا رہے ہیں۔

لفظ شناسی اور لفظ فہمی کے حوالے سے ''لغت نویسی'' نسیم امروہوی کا ایک خاص موضوع ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں لغات کی ترتیب، تشکیل اور تدوین پر جس قدر محنت اور لگن سے کام کیا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔ اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کی یہ رائے ہمارے موقف کو مضبوط کرتی ہے:

---

(۳۶) سہیل احمد خان، ڈاکٹر (رائے) بجھی وہ شمع، لاہور، اظہار سنز، ۱۹۸۷ء، ص ۳۰

''حضرت نسیم امروہوی علم و ادب کی دنیا کے ایک سربرآوردہ شخصیت تھے۔ نثر اور شاعری دونوں میدانوں میں ان کے کمالات کا ایک زمانہ معترف ہے۔ پھر لسانیات پر بھی انہیں حیرت انگیز عبور حاصل تھا۔ نسیم اللغات اور ترقی اردو بورڈ کراچی کے لغت کی ترتیب میں انہوں نے علمی و لسانی تبحر کے ناقابل تردید ثبوت فراہم کر دیئے''۔ (٣٧)

یہ امر انتہائی مسرت انگیز ہے کہ نسیم امروہوی نے اپنی لغات میں فقط لفظ کی معنوی سطح ہی کو اجاگر نہیں کیا بلکہ لفظ کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر اور ارتقائی سفر کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ علمی وادبی اور تحقیقی سطح پر ان کی لغات عوام و خواص میں ہمیشہ مقبول رہی ہیں۔ انہوں نے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کئے بغیر، اس دقت طلب کار خیر کو جاری رکھا، بقول پروفیسر سجاد حارث:

''ایک کاروباری معاشرے میں تبحر علمی اور لغت نویسی زیادہ منفعت بخش کام یا کاروبار تصور نہیں کیا جاتا، تاہم ایسے معاشروں میں کچھ مہذب روحیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو جلب منفعت سے بالاتر ہو کر اپنے علمی اور تحقیقی شغف اور محنت شاقہ سے انسان کے ذہنی اور تہذیبی ارتقاء کی نئی جہات دریافت کرتی ہیں۔ نسیم امروہوی مرحوم جیسے علم دوست افراد ہی کسی قوم کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں.....'' (٣٨)

نسیم امروہوی نے لغت پر کئی سطحوں سے کام کیا ہے۔ ایک طرف تو انہوں نے لفظ و معانی کا رابطہ تلاش کر کے مستند لغات مرتب کیں اور دوسری جانب انہوں نے اقبال کی اردو اور فارسی شاعری کے حوالے سے فرہنگیں مرتب کیں۔ ماحصل یہ کہ اردو لغت نویسی میں نسیم امروہوی کا نام ان کے سنہرے کام کی وجہ سے ہمیشہ جگمگاتا رہے گا اور طالبان علم اس سے اپنی تشنگی بجھاتے رہیں گے۔ بقول ڈاکٹر آغا سہیل:

---

(٣٧) احمد ندیم قاسمی (رائے) بجھی وہ شمع' لاہور' اظہار سنز' ١٩٨٧ء' ص ٢٥

(٣٨) سجاد حارث' پروفیسر (رائے) بجھی وہ شمع' لاہور' اظہار سنز' ١٩٨٧ء' ص ٢٩

''......حضرت نسیمؔ امروہوی اُردو زبان کی لغت میں معرب، مفرس اور مہند الفاظ کے مخارج پر ایک مستند عالم کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے بھی ان کا ایک اہم مقام تھا۔ ان کے سانحۂ ارتحال سے جو خلاء پیدا ہوا اُس کا پر ہونا کم سوادی اور قحط الرجال کے اس دور میں ممکن نہیں......'' (۳۹)

'قواعد اور انشا'' کے میدان کو سخت بنجر اور دقیق قرار دیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ لسانیات سے شغف رکھنے والے بھی اس سمت توجہ نہیں دیتے ہیں، تاہم نسیمؔ امروہوی مرحوم کا ایک پسندیدہ موضوع ''اُردو قواعد و انشاء'' بھی رہا ہے۔ انہوں نے اس خشک اور مشکل موضوع میں اپنے دلکش اسلوب کی وجہ سے قاری کے لئے دلچسپی پیدا کردی ہے۔ انہوں نے اُردو قواعد اور انشاء کے متعلق جو بنیادی معلومات بہم پہنچائی ہیں، وہ ان کے تحقیقی مزاج کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انہوں نے اپنی تصنیفات و تالیفات میں اس خشک موضوع کو سیراب کردیا ہے۔

''عروض'' کے فن سے آگہی عام آدمی کے بس کی بات نہیں اور پھر اس فن کو دوسروں تک پہنچانا اور بھی مشکل ہے۔ نسیمؔ امروہوی نے ان سنگلاخ موضوعات پر قلم اٹھایا اور نہایت سلاست اور روانی سے انہیں پیش کردیا ہے۔ عروض، معانی، قافیہ اور بلاغت وغیرہ کی یہ بحثیں ان کے تبحر علمی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی تصنیفات و تالیفات کو اپنے دور میں نہایت ممتاز مقام حاصل تھا اور آج بھی ان کی کتابوں سے بے شمار لوگ استفادہ کررہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نسیم امروہوی نے جس محنت اور لگن سے قواعد و انشا اور لسانیات کے حوالے سے کام کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور قائم نقوی کی اس رائے سے ہم سب اتفاق کریں گے کہ:

''......جناب نسیم امروہوی نے تن تنہا وہ کام کیا ہے جو کسی ادارے یا اکیڈمی کے کرنے کا تھا۔ تخلیقی اور تحقیقی سطح پر اردو ادب میں نسیم امروہوی کا ایک خاص مقام و مرتبہ ہے۔ لسانیات اور لغت کے حوالے سے بھی انہوں نے

---

(۳۹) آغا سہیل، ڈاکٹر (رائے) بجھی وہ شمع، لاہور، اظہار سنز، ۱۹۸۷ء، ص ۲۸

جتنا کام کیا ہے۔ وہ کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ (۴۰)''

اس ضرورت اس امر کی ہے کہ نسیم امروہوی کی لسانیات اور قواعد و انشا سے متعلق تمام تصنیفات و تالیفات کو یکجا کر کے شائع کر دیا جائے تا کہ قارئین اس سے بیش از بیش فائدہ اٹھا سکیں۔

۳۔ دینیات و اسلامیات

نسیم امروہوی کی شخصیت کا ایک پہلو ان کا ''عالم دین'' ہونا بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے ادیانِ عالم کا بغور مطالعہ کیا اور دین اسلام کی تعلیمات کو بہتر سمجھتے ہوئے ان پر عمل کرنے کی تلقین فرمائی۔ انہوں نے علمی و ادبی سطح پر دینیات اور اسلامیات کے ممکنہ موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس کام کو مذہبی تناظر میں دیکھنے سے اس کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور تفسیر لکھی۔ نماز و حج اور دیگر ارکانِ اسلام کی شرح قرآن و حدیث کی روشنی میں کی اور اثناء عشری کے عقیدے سے متعلق بعض کتابوں کا بامحاورہ ترجمہ بھی کیا۔ مجموعی طور پر ان کتابوں میں مذہبی عقیدت کے ساتھ علمی، لسانی، تحقیقی اور تنقیدی انداز فکر و نظر کی بے نظیر ترجمانی ملتی ہے، بقول پروفیسر سجاد رضوی:

> ''......ناانصافی کی بات ہوگی اگر مرحوم کے ایک اہم کام کی طرف اشارانہ کیا جائے اور وہ حضرت امام زین العابدینؑ کی دعاؤں ''صحیفۂ کاملہ'' کی تدوین ہے۔ یوں تو صحیفۂ کاملہ کے بہت سے تراجم ملتے ہیں لیکن نسیم امرہوی صاحب کے ترجمے کی شان اور ہے۔ اس ترجمے کی ابتداء میں نسیم امرہوی نے جو مقدمہ تحریر فرمایا ہے، وہ بذاتِ خود ایک کتاب ہے، جس میں انہوں نے اپنی پوری تحقیقی کاوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ (۴۱)''

نسیم امروہوی کی دینی اور مذہبی تصانیف پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا

---

(۴۰) قائم نقوی (رائے) بجھی وہ شمع، لاہور، اظہار سنز، ۱۹۸۷ء، ص ۴۳

(۴۱) سجاد رضوی (رائے) بجھی وہ شمع، لاہور، اظہار سنز، ۱۹۸۷ء، ص ۳۷

ہے کہ انہیں مذہب اور اس سے متعلقہ موضوعات پر کس قدر دسترس حاصل تھی۔ ڈاکٹر صفدر حسین کا موقف یہ ہے کہ نسیم امروہوی کا مذہب سے والہانہ لگاؤ کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ مذہبی شاعری کے ذریعہ اسلاف کا نام روشن کرنا چاہتے تھے۔ (۴۲)

۴۔ ادبی نثری کاوشیں

نسیم امروہوی مرحوم نے نثری میدان میں یوں تو کئی کارنامے سرانجام دیئے، مگر ''افسانوی نثر'' کی طرف ان کی توجہ حیرت انگیز ہے۔ انہوں نے کئی افسانے اور ڈرامے تخلیق کئے مگر اپنی طبیعت کو وہ اس سمت مرتکز نہ کر سکے۔ اس کی وجہ شاید ان کے بقول یہ رہی ہو کہ:

> ''......میری فطرت کا اقتضا یہ ہے کہ اگر طبیعت میں کوئی جذبہ بے اختیار پیدا ہوتا ہے تو کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسے موزونیت اور کاوش کے ساتھ نظم کا جامہ پہناؤں، عالم یہ ہے کہ نثر کے مقابل نظم کی طرف طبیعت زیادہ مائل ہوتی ہے۔ (۴۳)''

ماحصل یہ کہ اگر نسیم امروہوی اس افسانوی نثر کی طرف توجہ دیتے تو اس کے کچھ بہتر نتائج پیدا ہوتے اور ہمارے سامنے کوئی بڑا افسانہ نگار یا ڈرامہ نویس آ جاتا۔

''آپ بیتی'' یا خودنوشت سوانح عمری کا فن نہایت قدیم ہے، تاہم جدید دور میں سائنسی شعور کے نتیجے میں اس فن میں ایک معروضی اندازِ نظر کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ آپ بیتی کا اصل مقصد اپنی حیات کی گم شدہ کڑیوں کو جوڑنا اور عہدِ گم گشتہ کو محفوظ کرنا قرار دیا جا سکتا ہے۔ نسیم امروہوی مرحوم نے بھی اپنی خودنوشت سوانح حیات میں اپنی ذات اور عہد دونوں کا مطالعہ پیش کیا ہے، اگرچہ یہ آپ بیتی جامع اور مکمل قرار نہیں دی جا سکتی، تاہم اس کے مطالعے سے ہم بعض حیرت انگیز حقائق سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ اس آپ بیتی میں مرحوم نے اپنی شخصیت ہی کو

---

(۴۲) صفدر حسین ڈاکٹر ''نسیم امروہوی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے'' مشمولہ ارمغان نسیم، کراچی: انجمن سادات امروہہ، ۱۹۸۶ء، ص ۵۶

(۴۳) نسیم امروہوی، مراثی نسیم (جلد سوم)، لاہور: اظہار سنز، ۱۹۸۶ء، ص ۸۰

موضوع نہیں بنایا بلکہ پورے عصر کو اپنی شخصیت کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے' جو کسی حد تک کامیاب قرار دی جاسکتی ہے۔

۵۔ نفسیات

جدید علوم کے فروغ اور انسانی معاملات کے کھوج نے نفسیات کے علم کی اہمیت اور ضرورت میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ نفسیات کا مطالعہ آج کے عہد کا ایک لازمی جزو بن گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ نسیم امروہوی نے بھی ایک باشعور ادیب کی طرح اس سمت توجہ دی ہے۔ وہ بنیادی طور پر نفسیات دان نہیں' مگر اس موضوع سے ان کی دلچسپی کا یہ حال ہے کہ انہیں جہاں موقع ملتا ہے وہ اس علم سے خاطر خواہ کام لے لیتے ہیں۔ خالصتاً نفسیات کے موضوع پر ان کی کتاب کا مطالعہ کیجیئے تو احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے جدید نفسیاتی رویوں کا سہارا لیتے ہوئے ایک اہم معاشرتی ضرورت کو حل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ نفسیات کے شائقین اور عوام الناس نسیم امروہوی کی نفسیات شناسی کے قائل دکھائی دیتے ہیں۔

۶۔ تاریخ نویسی

روایت سے آگہی بہتر مستقبل کے لئے ناگزیر ہے۔ اور روایت سے باخبر رہنے کے لئے تاریخ کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ نسیم امروہوی مرحوم کو تاریخ سے خاص دلچسپی رہی ہے۔ تاریخی شخصیات' واقعات' مقامات اور معاملات پر ان کی خاص نگاہ رہی ہے اور انہوں نے مختلف اصناف میں ان تاریخی حقائق کو سمو دیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے دیکھ لیجئے:

> ''... جو چیز مرثیہ نگاری کی تاریخ میں انہیں ممتاز و منفرد بنا دیتی ہے وہ روایات کے انتخاب وصحت کے باب میں ان کا محتاط رویہ ہے۔ بات یہ ہے کہ نسیم امروہوی صرف شاعر ہی نہیں ایک جید عالم بھی ہیں۔ ان کی نظر صرف زبان و بیان کے نکات تک محدود نہیں ہے۔ اسلام اور تاریخ اسلام کی روح سے بھی وہ خوب واقف ہیں۔'' (۴۴)

---

(۴۴) فرمان فتح پوری' ڈاکٹر (دیباچہ) ''صبح ازل'' نامی پریس' ۱۹۸۱ء' ص ۹

اس کے ساتھ ساتھ انہیں خالص تاریخ نویسی سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ ان کی بعض تصانیف تو تاریخ نویسی کی مروجہ تعریف سے بھی زیادہ تاریخی تصانیف ہیں!

۷۔ انتقاد

تنقید اور تخلیق ایک رشتۂ ازلی میں منسلک ہیں۔ اسی طرح سے تخلیق کار اور نقاد میں بھی ایک مثبت رشتہ استوار ہوتا ہے اور اعلیٰ تخلیق کار بنیادی طور پر نقاد ہی ہوتا ہے۔ نسیم امروہوی کی تنقیدی بصیرت و بصارت کے تمام اہل کمال معترف رہے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کے نظری و علمی تنقیدی مضامین شائع ہو کر ارباب دانش و بینش سے داد وصول کر چکے ہیں۔ راقم الحروف کی تجویز یہ تھی کہ نسیم امروہوی کے مضامین (تنقیدی) شائع ہو جائیں، جس کے جواب میں مرحوم نے ان کوششوں کو سراہا تھا اور ممکن امداد کی یقین دہانی کرائی تھی، مگر افسوس کہ یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ بہر حال ان کے مطبوعہ تنقیدی مضامین کی موجودگی میں کہا جا سکتا ہے کہ نسیم امروہوی مرحوم ایک صاحب بصیرت نقاد تھے۔ ان مضامین کے ساتھ ساتھ بے شمار شعراء کے دواوین پر ان کے مقدمے، تبصرے اور تقریظیں بھی ان کی بصیرت و بصارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

نسیم امروہوی کی ساری زندگی تصنیف و تالیف میں بسر ہوئی۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت نہیں دیکھی جس نے بیک وقت نثر و شعر میں اتنے وقیع کارنامے انجام دیئے ہوں۔ نسیم امروہوی کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے متداولہ علوم کو متداولہ اصناف میں استعمال بھی کیا ہے۔ امروہے سے شروع ہونے والا نسیم امروہوی کا یہ سفر کراچی میں ختم تو ہو گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سفر کے اثرات اردو شعر و ادب پر آج بھی مرتسم ہو رہے ہیں۔ نسیم امروہوی کے اس ادبی سفر کے بارے میں سید تقی الحسن نے بڑے کام کی بات لکھی ہے۔ آپ بھی دیکھیے:

> ''......متحدہ ہندوستان کے چالیس کروڑ انسانوں کے انبوہ کثیر میں کسی شخص کا آواز بلند کرنا اور پھر اپنی آواز کی شناخت کرانا بہت بڑی بات ہے۔ حضرت

نسیم نے امروہہ جیسی چھوٹی سی بستی میں جنم لیا۔ وہیں کی فضاؤں میں احساس کی دنیا کو بیدار کیا۔ وہیں عزم وعمل اور مسلسل جدوجہد کے فیصلے کیے اور وہیں اپنے اسلاف کی علمی فکر کو قبول کیا۔ وہیں دنیائے ادب میں بھرپور انداز سے داخل ہونے کا تاریخی اور اہم فیصلہ کیا۔ وہیں یہ فیصلہ کیا کہ نسیم کو نہ صرف اپنے ہم عصروں کو بلکہ نئی نسل کے جدید ذہنوں کو بھی فتح کرنا ہے اور یہ فیصلہ کیا کہ اسکول اور کالجوں کے احاطوں میں اپنی آواز پہنچانی ہے اور یہ فیصلے کر کے یہ مرد باہمت گھر سے نکلا مگر اس وقت تک امروہہ جیسی علمی بستی میں نوجوان نسیم کے چرچے ہونے لگے تھے...... ہم حضرت نسیم امروہوی کو صرف شاعر کہہ کر انصاف نہ کریں گے وہ ایک ایسی ہفت پہلو شخصیت تھے جن کی شخصیت کا ہر پہلو نیا اور چونکا دینے والا نظر آتا تھا۔ اس لیے شاید انہوں نے غزل کو ہی زندگی کا مقصد قرار نہیں دیا بلکہ ہر اس موضوع پر قلم اٹھایا جس سے ذہنوں کی گرد کو صاف کیا جائے اور فکر میں نکھار پیدا ہو۔ (۴۵)''

مندرجہ بالا موضوعات وعنوانات کا بغور مطالعہ کیجیے اور درج ذیل کتب کی اس ضمنی فہرست کو ایک مرتبہ اور دیکھیے اور پھر میرے اس سوال کا جواب دیجیے کہ کیا عصر حاضر میں اتنا بھرپور اور وقیع کام کوئی ایک شخص تنہا پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے؟؟

نسیم امروہوی کی تصنیفات وتالیفات کی حتمی تعداد کا تعین تقریباً ناممکن ہے۔ تاہم راقم الحروف نے ممکنہ ذرائع کی مدد سے یہ فہرست مرتب کی ہے (دیکھیے حاشیہ نمبر ۲۵)۔ راقم الحروف نے ایک اہتمام یہ بھی کیا ہے کہ نسیم امروہوی کی دستیاب تخلیقات کو موضوعی اعتبار سے تقسیم کر دیا ہے۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قاری اپنی پسند کی کتاب کو موضوع کے حوالے سے بھی تلاش کر سکتا ہے۔ ذیل میں نسیم امروہوی کی نمائندہ تصنیفات وتالیفات کی ایک فہرست پیش خدمت ہے:

---

(۴۵) سید تقی الحسن ''نسیم امروہوی کی علمی شخصیت کے بعض پہلو'' مشمولہ ارمغان نسیم' کراچی انجمن سادات امروہہ' ۱۹۹۱ء' ص ۱۶۷

ا۔ شاعری

(ا) مرثیہ :

۱۔ مراثی نسیم (جلد اول)

۲۔ مراثی نسیم (جلد دوم)

۳۔ مراثی نسیم (جلد سوم مع خود نوشت سوانح حیات) (۴۶)

(ب) شخصی مرثیے :

۱۔ رثائے نجم العلماء (شمس العلماء مولانا نجم الحسن کا مرثیہ)

۲۔ دانا صرۃ (شمس العلماء ناصرۃ الملۃ کا مرثیہ)

۳۔ رثاء محسن الحکیم (محسن الحکیم طباطبائی مرحوم کا مرثیہ)

۴۔ رثائے ترابی (علامہ رشید ترابی کا مرثیہ)

۵۔ مرثیہ آلِ رضا (سید آل رضا لکھنوی کا مرثیہ)

۶۔ مرثیہ جوش (حضرت جوش ملیح آبادی کا مرثیہ)

۷۔ مرثیہ سید الملت (علامہ سید سعید حسین کا مرثیہ)

۸۔ مرثیہ یاور عباس (یاور عباس کی یاد میں مرثیہ) (۴۷)

---

(۴۶) راقم الحروف نے یہاں ان مرثیوں کی فہرست عمداً پیش نہیں کی جو علیحدہ کتابی شکل یا مراثی کے انتخاب میں شائع ہوئے۔

(۴۷) نسیم امروہوی کی شخصی مرثیہ گوئی کی مدح سرائی کرنے والوں میں سید وقار عظیم اور ڈاکٹر ہلال نقوی بھی شامل ہیں۔

(i) سید وقار عظیم، "نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری" مشمولہ عرفان نسیم، کراچی: انجمن سادات امروہہ، ۱۹۷۴ء، ص ۹۱

(ii) ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، کراچی: محمدی ٹرسٹ، ۱۹۹۴ء، ص ۵۳۵

(ج) منظومات :

۱۔ سازِ حریت (اتحاد و اصلاحِ رسوم و ادب)

۲۔ فلسفۂ غم (جائزۂ نفس)

۳۔ برق و باراں (مطالعۂ پاکستان مع پس منظر)

۴۔ استاد کا پیغام...... شاگردوں کے نام (طلباء کے حقوق و فرائض)

۵۔ گلزارِ نسیم (بچوں کی منظومات' جلد ۱ تا ۵)

۲۔ لسانیات

(ا) لغات و فرہنگ :

۱۔ نسیم اللغات

۲۔ رئیس اللغات

۳۔ فرہنگِ نسیم

۴۔ اُردو لغت (بہ تعاون رفقاء' جلد ۱ تا ۱۰)

۵۔ فرہنگ اقبال (اُردو)

۶۔ فرہنگ اقبال (فارسی)

(ب) قواعد و انشاء

۱۔ تسہیل القواعد (جلد ۱ تا ۴)

۲۔ قواعد و انشائے اُردو (جلد ۱ تا ۸)

(ج) عروض و بلاغت:

۱۔ معراج العروض (عروض و قافیہ)

۲۔ حدائق البلاغت' تلخیص (معانی' عروض' قافیہ)

۳۔ نسیم البلاغت (معانی' عروض' قافیہ)

۴۔ معیار الاشعار طوسی، تلخیص (عروض و قافیہ)

۳۔ دینیات و اسلامیات

۱۔ تفسیر و ترجمہ پارۂ عم (اردو اور سندھی میں)

۲۔ نماز اور دیگر عبادات

۳۔ ترجمہ مناسکِ حج

۴۔ ترجمہ توضیح المسائل (فتاوئ سرکار خوئی مدظلہ)

۵۔ ترجمہ و تحشیہ صحیفہ کاملہ (دعائیں امام زین العابدینؑ)

۶۔ دینیات کی کتاب (جلد ۱ تا ۵ سندھی میں اصولِ دین)

۴۔ ادبی نثری کاوشیں

(ا) افسانہ اور ڈراما

۱۔ چراغِ زندگی (افسانے)

۲۔ رشوت ستانی (افسانہ)

۳۔ ملاپ (ڈرامہ)

(ب) آپ بیتی:

۱۔ خودنوشت سوانح حیات (منسلکہ مراثی نسیم جلد سوم)

۵۔ نفسیات

۱۔ دوست بنو دوست بناؤ (نفسیات)

۶۔ تاریخ نویسی

۱۔ تاریخ خیر پور (تاریخ)

۷۔ انتقاد

۱۔ کچل سرمست کی اُردو شاعری (تنقید)

نسیم امروہوی کی تخلیقات کو ہم درج ذیل تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(ا) نسیم امروہوی کی وہ تصنیفات و تالیفات جو ان کی زندگی میں شائع ہو گئیں۔

(ب) نسیم امروہوی کی وہ تخلیقات جو ان کی رحلت کے بعد زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔

(ج) نسیم امروہوی کی وہ تصنیفات و تالیفات جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ نسیم امروہوی کی تمام مطبوعہ شعری اور نثری تخلیقات کو جمع کر کے علیحدہ علیحدہ کلیاتِ نثر و شعر کی صورت میں شائع کیا جائے۔ اس کے بعد ان کی تمام غیر مطبوعہ تخلیقات کو ''باقیاتِ نسیم امروہوی'' کے نام سے طبع کیا جائے۔ اگر یہ تمام کام کسی ایک فرد سے ممکن نہ ہو تو کوئی ادارہ تشکیل دے کر بھی یہ کام مختلف النوع افراد سے کرایا جا سکتا ہے۔ ایک بات بہر حال طے ہے کہ اگر ہم نے نسیم امروہوی کی تمام تخلیقات کی تدوین کا اہتمام نہ کیا تو آنے والا وقت ہمیں معاف نہیں کرے گا۔ آیئے آپ بھی میرے ساتھ اس سوال کا کھوج لگایئے کہ آج جو کام افراد اور ادارے مل جل کر مدون نہیں کر پا رہے ہیں وہ ایک شخص نسیم امروہوی نے کس طرح تنہا تخلیق و ترتیب دیا ہوگا......؟؟؟

⌘⌘⌘

قیصرِ اقلیمِ مرثیہ...... قیصر بارہوی

(۱)

لکھنؤ برصغیر کی تہذیب و ثقافت کا سب سے بڑا مرکز تھا' یہی سبب ہے کہ جملہ فنونِ لطیفہ یہاں اوجِ کمال تک پہنچے۔ نثر ہو یا شاعری' یہاں کے تخلیق کاروں نے ہر میدان میں اپنی صناعانہ تخلیقی ہنرمندیوں کا ثبوت دیا۔ فن کے اظہار کے لئے نئے نئے راستے تلاش کیے جانے لگے۔ (۱) خارجیت اور ڈرامائی عناصر کے امتزاج سے لکھنؤ میں ایک منفرد شعری فضا تشکیل پانے لگی۔ (۲) اسی صورتِ حال میں خارجیت' ڈرامائی عناصر اور واقعۂ کربلا کے مثلث نے صنفِ مرثیہ کا تخلیق نامہ مرتب کیا۔ برصغیر کی سرزمین کا طرزِ احساس اور تہذیبی اثرات نیز عرب کے تاریخی واقعات و عوامل انیس و دبیر کے مرثیوں میں یکجا ہو کر فن کی انتہائی بلندیوں کو چھونے لگے۔ ان دونوں حضرات نے مرثیے کے تخلیقی امکانات کو وسیع کیا (۳) اور اپنے بہترین افکار کو اپنے متنوع اسالیب میں پیش کر کے ہر عہد کے شعراء کو متاثر کیا۔ (۴) تا اینکہ یہ سلسلہ آج

---

(۱) صفدر حسین' سید' ڈاکٹر' مرثیہ بعد انیس' لاہور' سنگ میل پبلی کیشنز' ۱۹۷۱ء' ص ۲۳۔

(۲) عابد علی عابدؔ (دیباچہ)' موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ' لاہور' مجلس ترقی ادب' س۔ن' ص ۶۔

(۳) احتشام حسین (مقدمہ)' مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر' لکھنؤ' نسیم بکڈپو' ۱۹۵۹ء' ص ۷

(۴) شجاعت علی سندیلوی' تعارف مرثیہ' الہ آباد' ادارہ انیس اردو' ۱۹۵۹ء' ص ۴۴۔

بھی جاری ہے۔ انیس و دبیر نے برصغیر کے تہذیبی عناصر کو جس طرح اپنے مرثیوں میں محفوظ کیا تھا' اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ان کے مرثیوں کے مطالعے سے ہم آج بھی برصغیر کی اسلامی تہذیب و ثقافت کا کھوج لگا سکتے ہیں۔ (۵)

بیسویں صدی کا سورج نئے نظریات و میلانات لے کر طلوع ہوا اور خصوصاً مغربی اصناف کے حوالے سے اُردو اصناف میں جدید افکار و نظریات کی ضرورت کا احساس پیدا ہونے لگا۔ مغربی تہذیب نے اپنی رنگارنگی کی وجہ سے اہلِ مشرق کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ سوچ اور فکر کے مروجہ معیارات تبدیل ہونے لگے۔ پرانے پیمانے بوسیدہ قرار دیئے گئے اور اب نئے شعری پیمانوں میں جدید شراب کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ شعر و ادب کا تعلق فرد سے زیادہ معاشرے سے جوڑا جانے لگا اور اجتماعی لب و لہجہ کو اہمیت ملی۔ (۶) نتیجتاً قومی اور ملی شاعری کو عروج حاصل ہوا اور مذہبی مرثیوں کی جگہ قومی اور شخصی مرثیوں نے لے لی' اقبالؔ' نظم طباطبائی' صفی لکھنوی' ریاض خیر آبادی' اثر لکھنوی اور چکبست لکھنوی وغیرہ نے قومی اور ملی مرثیوں کے ذریعے ملت کو بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ (۷) اس طرح مرثیے کا رشتہ قومی شاعری سے جڑ گیا۔ بعض ناقدین نے اس منظر نامے کے حوالے سے سطحی بنیاد پر یہ فیصلہ صادر کر دیا ہے کہ اس عہد میں ''مذہبی مرثیہ'' کو زوال آ گیا تھا (۸) مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ (۹) اگر آپ بنظر غائر دیکھیں تو قومی اور ملی مرثیے بھی دراصل اسی روایتی مرثیے کا ایک جدید رُوپ ہیں۔ اب اس حوالے سے صرف دو بند ملاحظہ فرمائیے اور مذہبی مرثیے کا اثر شخصی اور ملی مرثیہ پر ملاحظہ کیجیے۔

---

(۵) سجاد باقر رضوی' ڈاکٹر' معروضات' لاہور' پولیمر پبلی کیشنز' ۱۹۸۹ء' ص ۳۷۔

(۶) احراز نقوی' ڈاکٹر' جدید فن مرثیہ نگاری' مرتبہ: وحید الحسن ہاشمی' لاہور' مکتبہ تعمیر ادب' ۱۹۶۷ء' ص ۲۱۲

(۷) محمد رضا کاظمی' جدید اُردو مرثیہ' کراچی' مکتبہ ادب ۱۹۸۱ء' ص ۱۳۔

(۸) شجاعت علی سندیلوی' تعارف مرثیہ' الہ آباد' ادارہ انیس اُردو' ۱۹۵۹ء' ص ۷۰

(۹) اسد اریب' ڈاکٹر' اُردو مرثیے کی سرگزشت' لاہور: کاروانِ ادب' ۱۹۸۹ء' ص ۸۴۔۸۹

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبت مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

(علامہ اقبالؔ)

یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا دلوں میں آ کے یہ ارمان جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ''ہوم رول'' کے بدلے

(چکبستؔ لکھنوی)

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پوری دنیا میں عموماً اور مختلف اسباب کی بناء پر ہندوستان میں خصوصاً اجتماعی شعور بیدار ہو رہا تھا۔ ایسے لائحہ عمل مرتب کئے جا رہے تھے، جن سے معاشرتی سطح پر انقلابی تبدیلیاں لائی جا سکیں۔ (۱۰) اس حوالے سے مظلوم دیسی عوام کے اوپر کئے گئے مظالم کو مختلف سطحوں پر پیش کر کے سامراجی استبداد اور ظالمانہ حیثیت کو خوب اُبھارا جا رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز کے بعد عوام الناس میں ایک انقلابی رجحان پیدا کرنے کے لئے واقعہ کربلا اور حضرت امام حسین علیہ السلام کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا جانے لگا تھا۔ (۱۱) اس رویے کو مرثیہ گو شعراء بھی محسوس کر رہے تھے۔ دولہا صاحب عروج کے مرثیے کا یہ شعر اس عہد کے بدلتے ہوئے رجحانات و میلانات کی نمائندگی کرتا ہے۔

---

(۱۰) حامد حسن قادری، پروفیسر، مختصر تاریخ مرثیہ گوئی، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۴ء، ص ۱۰۰

(۱۱) شجاعت علی سندیلوی، تعارف مرثیہ، الہ آباد، ادارہ انیس اردو، ۱۹۵۹ء، ص ۸۶

ظلمت کدے میں ہوں پہ تجلی پسند ہوں
میں ہوں عروج کیوں نہ ترقی پسند ہوں

اس سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورتِ حال کا اُردو مرثیے کی ہیئت پر تو زیادہ اثر نہ ہو سکا لیکن موضوعات اور مواد کے اعتبار سے اس میں دُور رس تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ خاص طور پر شہادتِ امام حسین علیہ السلام کے بعد کے حالات و واقعات کو بطورِ خاص مرثیوں میں جگہ دی جانے لگی اور پیغامِ امام عالی مقام کی تشہیر ہی اس کا بنیادی موضوع قرار پایا۔ (۱۲) اس سلسلے میں آلِ رضا، نجم آفندی، نسیم امروہوی، جمیل مظہری، علی سردار جعفری اور جوش ملیح آبادی نے جس طرح مرثیے کو مقصدی لے عطا کی اور اس صنف کو جدید عصری تقاضوں کے عین مطابق ڈھالنے کی کوشش کی، اس کی جتنی بھی مدح کی جائے کم ہے۔ آلِ رضا اور جمیل مظہری نے مرثیے کے مزاج و مذاق میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔ (۱۳) جوش نے انفرادی طور پر مرثیے کو رلانے کے بجائے جگانے کا ہتھیار بنایا۔ نسیم امروہوی نے زبان و بیان کی نزاکتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مرثیے میں ہیئت کے کامیاب تجربے کیے۔ (۱۴) اس طرح ان قد آور مرثیہ نگاروں کی کاوشوں کے نتیجے میں مرثیے کو ایک مرتبہ پھر عروج حاصل ہوا اور فنی و فکری ہر لحاظ سے یہ صنف دوسرے وقیع اصناف کے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ ان معروف مرثیہ نگاروں کے درج ذیل بندوں کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ اس زمانے میں مرثیہ کس طرح اپنے اندر عصری شعور کے سبب تبدیلی پیدا کر رہا تھا۔

اہلِ زمیں کی چاند ستاروں پہ ہے نظر — ممکن ہے کامیاب رہے چاند کا سفر
ہیں اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کے بشر — مردانِ حق پرست کا جانا ہوا اگر

---

(۱۲) ضمیر اختر نقوی (مرتب)، جوش کے مرثیے، کراچی، ادارۂ فیضِ ادب، ۱۹۸۰ء، ص ۲۲

(۱۳) کرار حسین، پروفیسر (پیش لفظ) مراثی آلِ رضا، کراچی، خراسان اسلامک ریسرچ سنٹر، ۱۹۸۱ء، ص م

(۱۴) اسد اریب، ڈاکٹر، اردو مرثیے کی سرگزشت، لاہور، کاروانِ ادب، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۱

عباسؑ نامور کا علم لے کے جائیں گے
ہم چاند پر حسینؑ کا غم لے کے جائیں گے

(نجم آفندی)

اے قوم وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ   اسلام ہے پھر تیر حوادث کا نشانہ
کیوں چپ ہے اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ   تاریخ میں رہ جائے گا مردوں کا فسانہ
مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو
لازم ہے کہ ہر فرد حسینؑ ابنِ علیؑ ہو

(جوشؔ ملیح آبادی)

حضرت نے کہا کہ رونے والو!   اب چپ رہو دل ذرا سنبھالو
اشکوں کا وفور ہو تو ٹالو   ہمت سے یہ بارِ غم اٹھا لو
پیغامِ مشیت آ گیا ہے
ہنگامِ وصیت آ گیا ہے

(نسیمؔ امروہوی)

ان جدید مرثیہ نگاروں کا لگایا ہوا تخم ثمردار ہوا اور بہت سے ایسے مرثیہ نگار ظاہر ہوئے جنہوں نے اپنے افکار جمیل کے ذریعے اس صنف کو مالا مال کیا۔ یہی سبب ہے کہ اس دور میں ہر قابلِ قدر شاعر نے صنفِ مرثیہ میں طبع آزمائی کی۔ ان شعراء میں قمرؔ جلالوی، شوکتؔ تھانوی، علامہ محسنؔ اعظم گڑھی، ڈاکٹر یاور عباسؔ، راجہؔ صاحب محمود آباد، عزمؔ جونپوری، رئیسؔ امروہوی، راغبؔ مراد آبادی، ڈاکٹر صفدرؔ حسین، کرارؔ نوری اور فیض احمد فیضؔ کے اسمائے گرامی بطور خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

موجودہ دور ذہنی وفکری انتشار کا دور ہے۔ جب معاشرے میں منتشر قوتیں فروغ پا رہی ہوں تو انسان اپنے اندر سمٹنا شروع کر دیتا ہے۔ چیزوں میں اختصار کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے اور اصنافِ شعر بھی مختصر سے مختصر ترین ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ

معاشی مسائل، سماجی حالات اور اندرونی بے چیدگیاں بھی انسان کو بے کل کر دیتی ہیں۔اب قارئین ان اصناف ادب وشعر کو اہمیت دیتے ہیں، جو ان کے عصری مسائل سے ہم آہنگ ہوں اور ان کے مسائل کا تسلی بخش حل پیش کر سکیں۔مرثیہ بھی ان عمرانی حالات سے دوچار ہوا مگر اپنے مزاج کے سبب اس صنف نے جلد ہی عمرانی تقاضوں کو سمجھا اور اپنے اندر تبدیلیوں کی اجازت دے دی۔(۱۵) نتیجتاً موجودہ مرثیہ نگاروں نے مرثیے میں جدید نفسیاتی، سماجی اور سیاسی مسائل کو نہ صرف یہ کہ پیش کیا بلکہ ان کے حل کے لئے نسخے بھی تجویز فرمائے۔موجودہ دور میں صبا اکبر آبادی، شاہد نقوی، سہیل بنارسی، شائق زیدی، سردار نقوی، ظہور جارچوی، وحید الحسن ہاشمی، سیف زلفی، عبدالرؤف عروج، افسر عباس زیدی، ظفر شارب، اثر ترابی، حسن عسکری کاظمی، اثر جلیلی، سید فیضی، ہلال نقوی، امید فاضلی، قسیم امروہوی، اسیر فیض آبادی، شہید حسن زیدی، میر رضی میر، عارف امام، احمد نوید، کوثر امروہوی، عرفی ہاشمی وغیرہ کے مرثیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ان شعراء نے فنی اور فکری سطح پر مرثیے کو عہد جدید سے پیوست کر دیا ہے۔بیسویں صدی کے آخر میں جس شاعر نے مرثیے میں فکر انگیز اور اجتہادی تبدیلیاں کیں اور اسے مقبول خاص و عام بنایا (۱۶) وہ قیصر بارہوی تھے۔انہوں نے مرثیے کو واقعۂ کربلا کی خیرہ کر دینے والی روشنی میں ایک عالی شان فتح کا نقارہ بنا دیا ہے۔

کربلا جس کی بلندی ہے وہ مینارہ ہے
مرثیہ سب سے بڑی فتح کا نقارہ ہے

(۲)

قیصر بارہوی مختلف النوع اصناف پر دسترس رکھنے والے شاعر ہیں۔انہوں نے مروجہ معروف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور اپنی جدت طبع کے رنگا رنگ جوہر دکھائے۔ان

---

(۱۵) صفدر حسین، سید، ڈاکٹر، مرثیہ بعد انیس، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۱ء، ص ۱۷۴

(۱۶) ہلال نقوی، ڈاکٹر (مقدمہ) لہو لہو کہکشاں، کراچی، ادارہ تقدیس قلم، ۱۹۸۹ء، ص ۲۹

کی غزلوں، قصیدوں اور منقبتوں کے مطالعے سے ان کی ذہنی کشادگی، حساس طبیعت اور الفاظ پر ان کی قدرت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے نوحوں، سلاموں اور مرثیوں کے مطالعے سے یہ بات آشکار ہو جاتی ہے کہ وہ داخلی کیفیات کے اظہار کے ساتھ ساتھ خارجی معاملات کے بیان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ کربلا کے تاریخی واقعہ کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھنا اور محسوس کرنا اور پھر ان محسوسات کو مختلف النوع صورتوں میں پیش کرنا دراصل اک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا عمل ہے۔ قیصؔر بارہوی کی یوں تو تمام شاعری ان کے جذبات واحساسات کی آئینہ دار ہے۔ تاہم ان کے مرثیوں میں داخلی اور خارجی دونوں کرب ٹھاٹھیں مار رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مرثیوں میں غزل کی داخلی اور حزنیہ کیفیات بھی اُبھرتی ہیں اور قصیدے کا ظاہری شان وشکوہ بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔

قیصؔر بارہوی نے ۱۹۴۲ء میں دیارِ سخن میں قدم رکھا۔ ابتداً مشقِ سخن کے لئے غزل کو منتخب کیا۔ (۱۷) کچھ عرصہ طبع آزمائی کرنے کے بعد سلام اور قصائد کی صنف کی طرف متوجہ ہوئے اور اس گلستان میں رنگا رنگ پھول کھلائے۔ جب کلام میں فنی پختگی آ گئی تو صنفِ مرثیہ کی جانب متوجہ ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں حضرت عباسؑ علم بردار کی شان میں ۷۷ بندوں پر مشتمل ایک مرثیہ لکھنؤ کی فضائے شاعری سے متاثر ہو کر، خوب بنا سنوار کر کہا۔ اہلِ علم اور صاحبانِ فن نے اس کی خوب قدر کی اور انہیں مسلسل مرثیہ گوئی کا مشورہ دیا۔ صنفِ مرثیہ کا لگایا ہوا یہ تخم ایسا بارآور ثابت ہوا کہ ایک چھتنا ور شجر کی صورت اختیار کر گیا اور اب تو مرثیہ قیصؔر بارہوی کی شناخت بن چکا ہے۔ (۱۸)

حضرت قیصؔر بارہوی کی حیات میں راقم الحروف نے پروفیسر ہارون قادر کی معاونت سے موصوف کے مرثیوں کی ایک فہرست مرتب کی تھی جو ایک سو دو مرثیوں پر مشتمل

---

(۱۷) قیصؔر بارہوی۔ امتزاج (غزلیں)، لاہور، الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص

(۱۸) عاصی کرنالی، (تاثرات) عظیم مرثیے، لاہور، حلقۂ شعرائے اہلِ بیت، ۱۹۷۷ء، ص ۱۶

تھی ۔ راقم الحروف کی مرتبہ یہ فہرست کئی مضامین و مقالات میں طبع ہوئی ۔ (۱۹) مقام افسوس و حیرت ہے کہ راقم کوکوشش کے باوجود قیصر بارہوی کے ایک سو دو مرثیے دستیاب نہیں ہو سکے۔ فی الحال اس بارے میں لب کشائی قبل از وقت ہے۔ اب ذیل میں قیصر بارہوی کے مطبوعہ مرثیوں کے مجموعوں کا خاکہ پیش خدمت ہے۔

(۱) شباب فطرت

(مطبوعہ: سرگودھا مکتبہ تمکین ۱۹۶۹ء)

مشمولہ مرثیے

۱) تو اعتبارِ نفس کا جوہر ہے اے حسینؑ

۲) کس باوفا کے نام سے نام وفا ہے آج

۳) انسان رہنمائے حقیقت تلاش کر

۴) پھر آ گیا ہونٹوں پہ دھواں آتشِ غم سے

۵) معراج عقل و فکر ہے سودائے کربلا

۶) شبیرؑ کائنات کی عظمت کا نام ہے

۷) انسانیت کو ماتمِ شبیرؑ چاہیے

اس کتاب کے بارے میں پروفیسر شاہین ہارون رقمطراز ہیں:۔

''...... شباب فطرت کے مطالعہ سے چند خاص باتیں مترشح ہوتی ہیں ۔شباب فطرت کے تمام مرثیے بظاہر تو اسی مسدس کے سانچے میں ہیں جو میر انیس کے اسلوبِ اظہار کی معروف روایتی حیثیت رکھتے ہیں لیکن مرثیوں کا

---

(۱۹) (i) شبیہ الحسن' ڈاکٹر' ترجیحات' لاہور' اظہار سنز' ۱۹۹۸ء ص ۱۰۳

(ii) قیصر بارہوی' معتبر مرثیے' لاہور' قیصر بارہوی پبلی کیشنز' ۱۹۹۸ء

(iii) قیصر بارہوی' منتخب مرثیے' لاہور' قیصر بارہوی گولڈن جوبلی آرگنائزیشن' ۱۹۹۱ء

(iv) شبیہ الحسن (مدیر)' ماہنامہ شام و سحر' لاہور' مئی جون ۱۹۹۰ء

موضوعاتی مواد میر انیس کے مرثیوں کی نقل محض نہیں ہے...... قیصر بارہوی جس عنوان کے تحت مرثیہ تصنیف کرتے ہیں مرثیے کی پوری فضا میں اسی کا معنوی تاثر قائم کرنے میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں''۔(۲۰)

(۲) عظیم مرثیے

(مطبوعہ: لاہور حلقہ شعرائے اہلبیتؑ ۱۹۷۷ء)

مشمولہ مرثیے

۱) پھر خیمۂ نگاہ سے تازہ دھواں اٹھا

۲) لطف حیات میری پریشانیوں میں ہے

۳) انسان کی نگاہ میں آبِ حیات ہے

۴) رازِ بقا ہے خدمتِ آلِ رسولؐ میں

۵) میری زباں پہ علمِ علیؑ کا بیان ہے

۶) زنجیرِ تخیل میں گرفتار ہیں آنسو

۷) شمع توحید فروزاں ہوئی زندانوں میں

۸) نماز سے بشریت عروج پاتی ہے

۹) زینبؑ کے نام سے ہے بقائے حسینیتؑ

۱۰) دشتِ جہاں میں کون شکارِ اجل نہیں

۱۱) فکر سے پیار کی تصویر بناتا ہوں میں

۱۲) حیراں ہوں کیا فضائلِ زینبؑ رقم کروں

''عظیم مرثیے'' کے حوالے سے پروفیسر عبدالکریم خالد رقم طراز ہیں:

''......قیصر بارہوی کی کتاب ''عظیم مرثیے'' میں شامل مراثی کا مطالعہ قیصر

---

(۲۰) شاہین ہارون پروفیسر، شباب فطرت ایک مطالعہ، ماہنامہ ''شام و سحر'' لاہور، جون ۱۹۹۰ء، (قیصر بارہوی نمبر)، ص ۹۳

بارہوی کی اس شعری کائنات کو منکشف کرتا ہے جس کی تخلیق انسانی شریانوں کے اندر دوڑنے پھرنے والے اس لہو سے ہوتی ہے جو لفظوں کی صورت میں آنکھ کے کناروں سے جلوہ گر ہوتا ہے اور جس چیز سے مس ہوتا ہے اسے خون کر دیتا ہے۔ یہ مرثیے جس خوبصورت انداز میں انسانی جذبوں' انسانی رشتوں اور مختلف کیفیتوں کی تجسیم کر کے اسے نگاہوں کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں وہ صاحبِ نظر کو مبتلائے حیرت کرنے کے لیے کافی ہے"۔(۲۱)

(۳) منفرد مرثیے

(مطبوعہ لاہور حلقہ شعرائے اہلبیتؑ پاکستان ۱۹۹۰ء)

مشمولہ مرثیے

۱) ظلمتیں پھولتی پھلتی ہیں خدا خیر کرے
۲) مظلومیت شعور کے خنجر کی دھار ہے
۳) انسان کو عظیم بناتی ہے کربلا
۴) عالمِ غیب سے ملتے ہیں مضامین سخن
۵) اے اہلِ فکر کعبۂ دل کی اذاں سنو
۶) مسافرانِ عدم کا سفر ارے توبہ
۷) شہرِ تاریخ سے مسموم ہوا آتی ہے
۸) کیا چاہتا ہے آج کا انساں یہ سوچیے
۹) دل ہے تو زندگی کے چمن میں بہار ہے
۱۰) امنِ عالم کی ضمانت ہے نظامِ اسلام
۱۱) جدید عہدِ سخن کا نظام لایا ہوں

---

(۲۱) عبدالکریم خالد پروفیسر' عظیم مرثیے۔ ایک مطالعہ' ماہنامہ "شام وسحر" لاہور' (قیصر بارہوی نمبر)' جون ۱۹۹۰ء' ص ۹۷

۱۲) کیا کیا چراغ اہل بصیرت جلا گئے

''منفرد مرثیے'' کے حوالے سے سید نقاش ہاشمی رقم طراز ہیں:۔

''...... قیصر بارہوی کے تمام مرثیوں کو پڑھ جائیے۔ ایک بات آپ واضح طور پر محسوس کریں گے کہ قیصر صاحب ''ادب برائے مقصدیت'' کے قائل ہیں۔ ان کے ہاں حضرت امام حسینؑ ایک فرد نہیں بلکہ ایک تحریک ہیں۔ یہ تحریک خیر کی تحریک ہے۔ قیصر صاحب نے ہر جگہ کوشش کی ہے کہ خیر کی تحریک کا سبق کربلا سے لیا جائے اور عصر حاضر میں اسے دہرایا جائے۔'' (۲۲)

(۴) منتخب مرثیے (مرتبہ ڈاکٹر سید شبیہ الحسن)

(مطبوعہ لاہور قیصر بارہوی گولڈن جوبلی ۱۹۹۱ء)

مشمولہ مرثیے

۱) مدح ابو طالبؑ میں ہے انداز بیاں اور

۲) ابھرا ہے لوحِ فکر پہ اک لازوال نام

۳) عروجِ عالم نسواں ہے ماجرائے سخن

۴) عشق حسینؑ میں جو گزرتا ہے دوستو

۵) عباسؑ نامدار کو جوش نبرد ہے

۶) یارب مری زباں کو سخن لاجواب دے

۷) حسینؑ لاشۂ اکبرؑ تلاش کرتے ہیں

۸) ہفت اقلیم سے بہتر ہے مقدر میرا

۹) دوستو! انسان کے اندر بھی اک انسان ہے

۱۰) دنیا میں نیا باب سخن کھول رہا ہوں

---

(۲۲) نقاش ہاشمی منفرد مرثیے۔ ایک مطالعہ، ماہنامہ ''شام وسحر'' لاہور (قیصر بارہوی نمبر) جون ۱۹۹۰ء ص ۱۰۲

''منتخب مرثیے'' کے حوالے سے پروفیسر حسن عسکری کاظمی رقم طراز ہیں:

''......شاعر حسینیت جناب قیصر بارہوی ان خوش نصیب مرثیہ نگاروں میں شامل ہیں جنہیں زندگی میں صاحبانِ علم و فضل نے مسند عزت پر بٹھایا' ادبی حلقوں میں پذیرائی ملی اور ان کی تخلیقی کاوشوں پر ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں''۔ (۲۳)

(۵) معتبر مرثیے (مرتبہ: ڈاکٹر سید شبیہ الحسن)

(مطبوعہ لاہور قیصر بارہوی پبلی کیشنز: ۱۹۹۸ء)

مشمولہ مرثیے

۱) فکر مذہب ہے تو مذہب کی حقیقت سمجھو

۲) تربیت سے آدمی کے ذہن کی تعمیر ہے

۳) ماہِ محرم آئینۂ انقلاب ہے

۴) خدا کے شہر سے گزرا جو کاروانِ خیال

۵) قرآن کے ہونٹوں پہ جو فریاد ہے سن لو

۶) رکھیے کتابِ سیرتِ زہراؑ نگاہ میں

۷) زوجِ ابو طالبؑ کا شرف حسنِ شرف ہے

۸) انساں کی آبرو ہے عزاداریِ حسینؑ

۹) میں شاعرِ دربارِ حسینؑ ابن علی ہوں

۱۰) اے جبرئیل فکر مدینہ دکھا مجھے

۱۱) منظر میں آبروئے گلستاں گلاب ہے

''معتبر مرثیے'' کے بارے میں ڈاکٹر مظفر عباس رقم طراز ہیں:۔

---

(۲۳) حسن عسکری کاظمی' پروفیسر' منتخب مرثیے' (حرف سپاس)' لاہور' قیصر بارہوی گولڈن جوبلی آرگنائزیشن' ۱۹۹۱ء' ص ۷

''......قیصر بارہوی اردو کے رثائی ادب میں روایت انیس کے امین ہیں۔ روایت انیس اپنے اندر دو پہلو رکھتی ہے۔ مرثیہ نگاری اور مرثیہ خوانی۔ قیصر بارہوی نے ان دونوں پہلوؤں کو ہمارے دور میں زندہ رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے اور وہ اس میں یقیناً کامیاب رہے ہیں۔ انہوں نے روح عصر کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جہاں مرثیہ نگاری کی روایت میں جدت کی راہیں نکالیں وہاں مرثیہ خوانی کی روایت کو بھی جدید دور کے تقاضوں کے عین مطابق زندہ رکھا۔ اس لیے وہ ہمارے دور کے مرثیہ نگاروں کی صف اول میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔'' (۲۴)

(۶) معراج بشر

(مطبوعہ: لاہور امدادی اکیڈمی ۱۹۷۵ء)

مشمولہ مرثیہ

۱) نماز سے بشریت عروج پاتی ہے

''معراج بشر'' کے بارے میں پروفیسر شمیم انوار الحق رقمطراز ہیں:

''......معراج بشر کو قیصر بارہوی کے فکر و فن کا نقطۂ عروج قرار دیا جاسکتا ہے بلکہ یہ کہنا بھی درست لگتا ہے کہ عقیدت اور ارادت کے خانوں میں ان کے جذبوں کی تمام سچائیاں بھی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ جس کیفیت میں ڈوب کر معراج بشر جیسا مرثیہ تصنیف کر گئے اس میں ان کی یہ دلی تمنا بھی بروئے کار دکھائی دیتی ہے کہ ملت اسلامیہ نماز کی حقیقت سے آشنا ہو کر سنت حسینؑ کی اس روایت پر کاربند ہو جو انقطاع روح و بدن کے وقت بھی عظمت بندگی کے اظہار کا وسیلہ جان کر سجدۂ حسینؑ کی تقلید کا وہ منصب اپنائے جسے ہم استقرار حق کے سوا کچھ اور نہیں کہہ سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ

---

(۲۴) مظفر عباس 'معتبر مرثیے' (فلیپ) لاہور 'قیصر بارہوی پبلی کیشنز' ۱۹۹۸ء 'ص فلیپ

''معراج بشر'' جہاں اپنے مصنف کو حسنِ قبول کے ہار پہنائے گی وہیں ملت اسلامیہ کی جسد بے روح کو بھی روح آشنا کر دے گی۔'' (۲۵)

(۷) آیاتِ آمنہؓ (مرتبہ: شبیہ الحسن)

(مطبوعہ: لاہور سفینہ پبلی کیشنز: ۱۹۸۸ء)

مشمولہ مرثیہ

۱) ابھرا ہے لوحِ فکر پہ اک لازوال نام

''آیات آمنہ'' کے بارے میں مظہر نیازی رقمطراز ہیں:۔

''......آیات آمنہ کی علمی وادبی منزلت خواہ کچھ بھی ہو اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ حضرت قیصر بارہوی نے نہایت خوش عقیدتی سے اپنے خونِ جگر میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر یہ کارنامہ سرانجام دے کر اہل حق وانصاف طبقہ سے بے پناہ داد و تحسین سمیٹنے کا اہتمام کیا ہے اور نہایت عجز و انکساری سے اپنی عقیدتوں کے نوشگفتہ پھول قارئین کی جھولیوں میں ڈال کر اپنی روحانی تسکین کا سدا بہار گلشن لٹایا ہے۔ قیصر بارہوی کا یہ شاہکار مرثیہ دل و دماغ اور قلب و روح کو تا ابد تازگی دیتا رہے گا۔'' (۲۶)

(۸) مرثیہ

(مطبوعہ: لاہور رضا سنز پرنٹرز' جنوری ۱۹۹۷ء)

مشمولہ مرثیہ

۱) آیئے خانۂ معبود کی تحریر پڑھیں

زیر مطالعہ مرثیہ کے حوالے سے سید وحید الحسن ہاشمی رقمطراز ہیں:

''......قیصر مرحوم اپنی مرثیہ گوئی کو کلام انیس کا صدقہ قرار دیتے تھے لیکن اگر

---

(۲۵) شمیم انوار الحق ''معراج بشر۔ ایک مطالعہ'' ماہنامہ ''شام وسحر'' لاہور' جون ۱۹۹۰ء' ص ۹۹

(۲۶) مظہر نیازی ''آیات آمنہؓ۔ ایک مطالعہ'' ماہنامہ ''شام وسحر'' لاہور' جون ۱۹۹۰ء' ص ۹۹

بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ان کے کلام پر مرزا دبیر اور جوش ملیح آبادی کے طرز کی چھاپ ہے"۔(۲۷)

(یاد رہے کہ قیصر بارہوی کے وہ مراثی اس فہرست میں شامل نہیں جو انتخاب مراثی میں شائع ہوئے ہیں۔)

جدید اردو مرثیے کے معتبر شاعر حضرت قیصر بارہوی ۲۵ دسمبر ۱۹۹۶ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔ ان کی المناک رحلت سے صنف مرثیہ کا ایک روشن آفتاب غروب ہو گیا۔ قیصر بارہوی نے زندگی بھر اپنے خون جگر سے مرثیے کا چراغ روشن رکھا اور اس کی لو مدہم نہ ہونے دی۔ وہ جب تک زندہ رہے انہوں نے مرثیے کے فروغ کے لئے اپنی جملہ صلاحیتیں صرف کیں اور مرثیے کو دوسری معروف اصناف کے مقابل لا کھڑا کیا۔ انہوں نے اس صنف کو جدید رجحانات و میلانات کا علمبردار بنا کر پیش کیا اور اسے میدان کربلا کی فتح کا نقارہ بنا دیا۔ یہی سبب ہے کہ آپ کی رحلت سے جہاں پورا پاکستان اشک فشاں ہے وہاں صنف مرثیہ کا چہرہ بھی اداس ہو گیا ہے۔(۲۸)

قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری جدت و کلاسیکت کا حسین امتزاج تھی۔ انہوں نے یوں تو ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی تھی لیکن صنف مرثیہ میں ان کے طبعی جوہر کھل کر ہمارے سامنے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیصر بارہوی کے مرثیوں میں دیگر اصناف سخن کی خوشبو بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ خاص طور پر غزل کا رچاؤ اور قصیدہ کا طنطنہ انتہائی حسین امتزاج کے ساتھ ان کے مرثیوں پر جلوہ افروز ہوا۔ اس سلسلے میں پروفیسر حسن عسکری کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

> "قیصر بارہوی کا نام مرثیہ گوئی کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ بحیثیت مرثیہ نگار پاکستان کا وقار بن کر اکیسویں صدی پر اپنے اثرات مرتب کریں

---

(۲۷) وحید الحسن ہاشمی سید "قیصر بارہوی" ماں کی گود سے قبر کی آغوش تک "مرثیہ" لاہور، رضا سنز پرنٹرز، ۱۹۹۷، ص ۴

(۲۸) محمد ہارون قادر، قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری، لاہور، الحبیب پبلیکیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۰

گے ان کا اسلوب اظہار ہم عصر مرثیہ نگاروں میں سب سے الگ اور طرز ادا
جداگانہ تھی۔ ان کے ہاں محاکات منظر نگاری اور جزئیات نگاری عہد موجود
سے مناسبت رکھتی ہے۔ وہ ہواؤں اور فضاؤں سے گفتگو کرتے اور
ریگزاروں سے ہم کلام ہونے کا ہنر جانتے ہیں۔ قیصر بارہوی زمان و مکان
کی وسعتوں سے ماورا ایسا مقام بھی ہمارے مشاہدے میں لانے پر قدرت
رکھتے ہیں جسے وجدان کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ قدرت بیان کے
حوالے سے وہ کسی بھی مشکل کو خاطر میں نہیں لاتے بلکہ اظہار کی سنگلاخ
وادی میں پا بہ جولاں گزرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں اور اپنے قاری کو ہم
رکاب لے کر آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ مرثیے میں انسانی نفسیات
کی باریکیوں کو شعریت کا جامہ پہنا کر داد وصول کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔
انہیں لفظ برتنے اور معنویت میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کا سلیقہ آتا
ہے۔'' (۲۹)

قیصر بارہوی نے جدید اردو مرثیے کو سنجیدہ فکری موضوعات کے ساتھ ساتھ اسالیب
کے نئے ذائقوں سے بھی آشنا کیا۔ قیصر بارہوی نے اپنے مرثیوں کو نت نئے موضوعات سے
سجایا اور ان موضوعات میں اپنے جوش تخیل سے جان ڈال دی۔ انہوں نے موضوع کے
انتخاب اور اس کی ترتیب و تشکیل پر اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں۔ وہ مرثیے کی تخلیق سے
قبل موضوع کے تمام رُخوں کا احاطہ کرتے اور کمزور پہلوؤں کو بھی اپنے شاداب اسلوب سے
توانا کر دیتے تھے۔ جدید اردو مرثیے کے ایک ناقد ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنے مقالے میں یہ
حیرت انگیز بات تحریر کی ہے کہ:

''قیصر صاحب نے راقم السطور کو ایک بار دوران گفتگو بتایا تھا کہ وہ مرثیہ سے
قبل کوئی خاکہ اپنے ذہن میں نہیں بناتے۔ ڈاکٹر خاکی نے بھی یہی بات لکھی
ہے...... پہلے سے کوئی خاکہ تعمیر نہ کرنا اور مرثیے کو موضوع کی پابندی کے

---

(۲۹) حسن عسکری کاظمی، روزنامہ ''مساوات'' ۳۰ دسمبر ۱۹۹۶ء

ساتھ لکھنے کا عزم اس فکر میں بڑا تضاد ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ موضوع تشنہ رہ جاتا ہے اور اس میں ایک بے ربطی اور تنظیم خیال کا فقدان محسوس ہونے لگتا ہے۔ قیصر صاحب کیونکہ بنیادی طور پر شاعری کا ذہن رکھتے ہیں اور ان کے مصرعوں میں شعریت زیادہ ہوتی ہے چنانچہ شعریت کا یہی لباس موضوع کی بعض دوسری کمزوریوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔" (۳۰)

ڈاکٹر صاحب کے پیش کردہ اقتباس سے درج ذیل نکات ہمارے سامنے آتے ہیں۔

(ا) قیصر بارہوی مرثیے سے قبل کوئی ابتدائی خاکہ تشکیل نہیں دیتے۔

(ب) قیصر بارہوی کے مرثیوں میں موضوع تشنہ رہ جاتا ہے۔

(ج) قیصر بارہوی کے مرثیوں میں بے ربطی کا احساس ہوتا ہے۔

(د) قیصر بارہوی کے مرثیوں میں تنظیم خیال کا فقدان ملتا ہے۔

(ر) قیصر بارہوی کی شعریت کے نتیجے میں ان کی موضوعاتی خامیوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے قیصر بارہوی کے فن پر درج بالا اعتراضات وارد کرتے ہوئے اپنی نجی گفتگو کو بنیاد بنایا ہے جو تحقیقی اعتبار سے ناقص ہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنے قول کی تائید کے لئے ڈاکٹر مسعود رضا خاکی کا نامکمل اقتباس بھی پیش کیا ہے جو تحقیقی اصولوں کے سراسر خلاف ہے اور خود خاکی صاحب کا پیش کردہ نامکمل اقتباس بھی موصوف کے خیال کی تردید کر رہا ہے۔ اس مختصر مقالے میں ان اعتراضات کا بھرپور تجزیہ کرنا ممکن نہیں تاہم افسوسناک بات یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے قول کی صداقت کے لئے قیصر بارہوی کے ان مرثیوں کی نشاندہی نہیں کی جو موضوع کے اعتبار سے تشنہ محسوس ہوتے ہوں یا ان میں بے ربطی و تنظیم خیال کا فقدان دکھائی دیتا ہے۔ راقم الحروف کو قیصر بارہوی کے ساتھ بیس برس سے زیادہ عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قیصر بارہوی نہ صرف یہ

---

(۳۰) ہلال نقوی' ڈاکٹر' بیسویں صدی اور جدید مرثیہ' کراچی محمدی ٹرسٹ' ۱۹۹۴ء ص ۶۸۵

کہ اپنے مرثیے کی تشکیل سے قبل ایک جزوی خاکہ مرتب کرتے تھے بلکہ اس موضوع کے مختلف رُخوں کا مطالعہ کرنے کے لئے اردو اور انگریزی کتب سے استفادہ بھی کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ہم عصروں اور شاگردوں کو تخلیق مرثیہ سے قبل موضوع پر غور وفکر کی دعوت دیتے تھے۔ یہاں مجھے محض ڈاکٹر صاحب کے قول کی تکذیب کرنا ہی مقصود نہیں ہے بلکہ میں ایک بڑے مغالطہ کی نشاندہی بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں ڈاکٹر صاحب کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ درج ذیل مرثیوں کا مطالعہ فرمائیں اور اس سوال کا جواب دیں کہ کیا یہ مرثیے مکمل خاکہ بنائے بغیر تشکیل دیئے جاسکتے ہیں......؟؟

۱۔ مرثیہ جناب فضہؓ	۲۔ مرثیہ آیات آمنہؓ
۳۔ مرثیہ نماز دل	۴۔ مرثیہ علم غیب
۵۔ مرثیہ حسینؑ اور انتخاب	۶۔ مرثیہ فضیلات حج
۷۔ مرثیہ معراج نفس	۸۔ مرثیہ شاہد محضر جبریلؑ
۹۔ مرثیہ فاطمہ بنت اسدؑ	۱۰۔ مرثیہ جناب بلالؓ
۱۱۔ مرثیہ ضرورت مذہب	۱۲۔ مرثیہ وحدت مذہب
۱۳۔ مرثیہ نسیم امروہوی ”	۱۴۔ مرثیہ مولانا جوہر ”

قیصر بارہوی ایک ساحرانہ شخصیت کے مالک تھے ان کی شخصیت کا جاہ وجلال ان کی شاعری میں بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ (۳۱) قیصر بارہوی کا تخیل انتہائی ندرت کا مظہر ہے اور شعری تراکیب ولفظیات زبان وبیان پر ان کے عبور کو ظاہر کرتی ہیں۔ قیصر بارہوی نے جس ماحول اور حالات میں صنف مرثیہ کو فروغ دینے کا بیڑا اٹھایا وہ علما سے زیادہ ذاکرین کے زیر اثر تھا۔ یہی سبب ہے کہ طبعی مناسبت اور عصری ضرورت کے تحت قیصر بارہوی نے مرثیہ کی خواندگی کے لئے تحت اللفظ اور ترنم کے درمیان کا راستہ تخلیق کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ کی خواندگی کا یہ انداز ان کی پر تجمل اور بیباکانہ شخصیت کے زیر اثر وجود میں آیا ہے۔ قیصر بارہوی مرثیہ پڑھتے

---

(۳۱) اجمل نیازی ڈاکٹر' غزل اور مرثیے کا امتزاج' ماہنامہ ”شام وسحر“ لاہور' جون ۱۹۹۰ء ص ۳۰

ہوئے محض حاضرین کو سحر میں لانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کے اشعار کا جادو سامعین کے دل و دماغ پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ (۳۲) بعض ناقدین اور مرثیہ نگار اس غلط فہمی کا بھی شکار ہو گئے ہیں کہ قیصر بارہوی کی شہرت و عظمت ان کی شاعری کے بجائے ان کے لحن کے سبب ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ہلال نقوی صاحب کی یہ رائے ملاحظہ فرمایئے:

''وہ لحن میں مرثیہ پڑھتے ہیں۔ مجلسی اعتبار سے اس کا بہت اثر قائم ہوتا ہے جس طرح اچھی پڑھت مرثیے کے معیار کو (مجلس کی حد تک) بلند کر دیتی ہے اسی طرح قیصر صاحب کا لحن بھی تخلیق میں چار چاند لگا دیتا ہے...... قیصر صاحب کی خوانندگی کا طرز جس کی بنیاد لحن پر ہے اس کی اثر انگیزی سے انکار نہیں لیکن اگر ادبی اعتبار سے دیکھا جائے تو لحن کا یہی اثر سامع کو شعر کی حقیقی اور باطنی کیفیت کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ فکر و فن اور ادبی معیارات کی کسوٹی پر جب شعر کو پرکھنا ہوگا تو لحن اور ترنم سے ہٹ کر بات کرنا ہوگی......
ان کے فن مرثیہ گوئی کی جو ادبی جہتیں ہیں ان کے ادراک کے لئے ضروری ہے کہ ان کے مرثیے کو کاغذ پر بھی مطالعہ کیا جائے تاکہ اپنے عہد کے ایک معروف و مشہور مرثیہ نگار کے ادبی پائے کا بھی صحیح اندازہ ہو سکے۔ اس طرح وہ محاسن شعری بھی صحیح طور پر سامنے آسکیں گے جو لحن کی سحر انگیزی میں دب جاتے ہیں۔'' (۳۳)

ڈاکٹر ہلال نقوی صاحب نے درج بالا اقتباسات میں قیصر بارہوی کے فن پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کی تلخیص یہ ہے:

۱۔ قیصر بارہوی لحن میں مرثیہ پڑھتے ہیں اسی وجہ سے ان کی مجلسیں پر تاثیر ہوتی ہیں۔

۲۔ قیصر بارہوی کی اچھی پڑھت سے مرثیہ میں وقتی طور پر ''معیار'' کا احساس بڑھتا ہے اور تخلیق کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

---

(۳۲) حسن عسکری کاظمی' شاعر حسینیت۔ ایک مطالعہ' ماہنامہ ''شام و سحر'' لاہور' جون ۱۹۹۰ء' ص ۶۶

(۳۳) ہلال نقوی' ڈاکٹر' بیسویں صدی اور جدید مرثیہ' کراچی' محمدی ٹرسٹ' ۱۹۹۴ء' ص ۶۸۶

۳۔ قیصر بارہوی کا پر اثر لحن سامع کو شعر کی حقیقی اور باطنی کیفیت کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا۔

۴۔ قیصر بارہوی کے مرثیوں کو لحن سے ہٹ کر مطبوعہ شکل میں دیکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کا حقیقی ادراک کیا جائے اور ان کا ادبی معیار متعین کیا جاسکے۔

۵۔ قیصر بارہوی کے لحن کی سحر انگیزی میں دب جانے والے شعری محاسن اسی وقت منظر عام پر آسکتے ہیں جب قیصر بارہوی کے مرثیے طباعت کی منزل میں داخل ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے درج بالا اعتراضات میں بعض انتہائی اہم نوعیت کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔قیصر بارہوی پر اٹھائے گئے ان اعتراضات سے میرے ذہن میں بعض سوالات ابھرتے ہیں مثلاً

۱۔ کیا ایک کمزور اور ناقص مرثیہ محض ترنم یا اندازِ خوانندگی کی بنا پر معتبر اور مقبول ہوسکتا ہے......؟؟؟

۲۔ کیا معتبر اور معیاری مرثیے کے لئے ضروری ہے کہ وہ تحت اللفظ میں پڑھا جائے......؟؟؟

۳۔ کیا سامع مجلس میں محض ترنم سے مرثیہ پڑھنے والوں سے متاثر ہوکر شعر کی باطنی کیفیت سے بیگانہ ہو جاتا ہے یا تحت اللفظ مرثیہ گو بھی سامع پر اپنی پڑھت سے سحر کر سکتے ہیں؟؟

۴۔ کیا اچھا سامع مرثیہ سنتے ہوئے ترنم میں اتنا محو ہوسکتا ہے کہ وہ شعری محاسن یا مرثیے کے فنی تقاضوں کو فراموش کردے؟؟

۵۔ کیا جن مرثیہ نگاروں کے تمام مرثیے مطبوعہ شکل میں موجود نہیں ہیں ان پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں اور کیا تاریخ مرثیہ میں ان کا مقام و مرتبہ متعین نہیں کیا جاسکتا؟؟

ظاہر ہے کہ یہ تمام سوالات فکری و فنی اعتبار سے انتہائی اہم ہیں اور قیصر بارہوی سے ہٹ کر ڈاکٹر صاحب کو ان سوالات کی طرف بھی توجہ چاہئے۔ جہاں تک قیصر بارہوی کا تعلق ہے ان

کی لحن کی ترنم ریزیوں کا ایک زمانہ معترف ہے اور تمام ناقدین اس امر پر اتفاق رکھتے ہیں کہ قیصر بارہوی کے فکری کلام کو ان کا ترنم مزید ابھارتا بلکہ نکھارتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے واضح کیا ہے کہ قیصر بارہوی کے مقام و مرتبہ کا تعین اسی وقت کیا جائے گا جب ان کے مرثیے مطبوعہ شکل میں منظر عام پر آئیں گے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب فروری ۱۹۹۴ء میں طبع ہوئی اور اس سن سے قبل قیصر بارہوی کے مرثیوں کے درج ذیل چار دیوان زیور طبع سے آراستہ ہو چکے تھے اور علیحدہ کتابی شکل میں شائع ہونے والے مرثیے ان کے علاوہ ہیں۔

۱۔	شباب فطرت	۱۹۶۹ء	کل مرثیے ۷
۲۔	عظیم مرثیے	۱۹۷۷ء	کل مرثیے ۱۲
۳۔	منفرد مرثیے	۱۹۹۰ء	کل مرثیے ۱۲
۴۔	منتخب مرثیے	۱۹۹۱ء	کل مرثیے ۱۰

ڈاکٹر صاحب نے ان مرثیوں کا نہ صرف یہ کہ مطالعہ فرمایا تھا بلکہ اپنی تصنیف میں ان کے حوالے بھی فراہم کیے ہیں اب میں ڈاکٹر صاحب سے یہ استفسار کروں گا کہ کیا یہ مرثیے مطبوعہ شکل میں کاغذ پر تحریر نہیں ہیں کہ ان کا شعری ادراک کر کے قیصر بارہوی کا ادبی مقام متعین کیا جاتا......؟؟

قیصر بارہوی نے فکری موضوعات کے ساتھ ساتھ اسالیب بیان کے لئے بھی نئی نئی راہیں تراشیں۔ یہی سبب ہے کہ صنف مرثیہ میں ان کی آواز صاف پہچانی جاسکتی ہے۔ قیصر بارہوی کے مرثیوں کی عظمت سے انکار ممکن نہیں ان کا جدید لب ولہجہ اور عصری افکار و نظریات سے ان کی شیفتگی انہیں آئندہ آنے والی صدیوں میں بھی زندہ رکھے گی۔ (۳۴) ان کے ایک مرثیے کے دو بند میرے اس موقف کی تائید کریں گے۔

---

(۳۴) آغا سہیل ڈاکٹر بارگاہ (فلیپ) لاہور قیصر بارہوی گولڈن جوبلی آرگنائزیشن ۱۹۹۳ء صفحہ آخر فلیپ

دنیا میں نیا باب سخن کھول رہا ہوں　حیراں ہوں خزانے وہ گہر تول رہا ہے
ذہنوں میں ستاروں کی چمک گھول رہا ہوں　جبریل سمجھتے ہیں جہاں بول رہا ہوں
سدرہ کے نگینے شجر دل پہ سجے ہیں
تخئیل کو سرخاب کے پر آج لگے ہیں

پروانہ جدت کو ملی جدت پرواز　جو دشمن جاں تھیں وہ ہوائیں ہوئیں دمساز
کہتی ہے فرشتوں سے طبیعت کی تگ و تاز　یہ سیر فلک ہے غم شبیرؑ کا اعجاز
تصویر ہنر کھینچ کے تہذیب ہنر سے
تحسین سخن پاؤں گا ارباب نظر سے

(مرثیہ شاہد محضر...... حضرت جبرئیلؑ)

(۳)

قیصر بارہوی عصر جدید کے ایک معتبر مرثیہ نگار ہیں۔ انہوں نے اپنے افکار و اسالیب سے صنفِ مرثیہ کو جو نئے رنگ اور ذائقے عطا کئے ہیں، وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ انہوں نے مرثیہ کی صنف کو جدید تقاضوں کی پیشکش کا ذریعہ (۳۵) بنایا اور اسے اپنے عہد کے مسائل سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ عطا کیا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مرثیوں میں آپ کو جدید عہد کے سیاسی و سماجی مسائل و معاملات بھی موجزن دکھائی دیں گے اور ان سے عہدہ برآء ہونے کے لئے مخلصانہ تجاویز بھی ملیں گی۔ یہ امر انتہائی مسرت انگیز اور قابل فخر ہے کہ صنف مرثیہ کو نایاب اور جدید مرثیوں سے مالا مال کرنے کے باوجود قیصر بارہوی عمر بھر...... نہایت خلوص کے ساتھ صنفِ مرثیہ کی آبیاری میں مصروف رہے ہیں۔

قیصر بارہوی کے مرثیوں کے مطالعے کے نتیجے میں جو بات سب سے پہلے ہماری

---

(۳۵) طارق عزیز، ڈاکٹر 'قیصر بارہوی اور جدید طرزِ احساس (آیاتِ آمنہؑ)' لاہور، سفینہ پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۶۰

نگاہ میں جگہ پاتی ہے، وہ ان کا جدید فکری نظام، منفرد اندازِ بیان اور پرتاثیر لب و لہجہ ہے۔(۳۶) اس سلسلے میں سب سے پہلے خود ان کا یہ دعویٰ ملاحظہ فرمائیے۔

جدید عہدِ سخن کا نظام لایا ہوں　　میں حرف و لفظ میں جدت کا جام لایا ہوں
جو منفرد ہے وہ طرزِ کلام لایا ہوں　　اک آفتاب اُجالوں کے نام لایا ہوں
جواہرات کے یہ آئینے مکمل ہیں
برائے سعیٔ عمل زاویے مکمل ہیں

(مرثیہ: کعبہ و نجف)

یہاں جدید نظامِ سخن سے وہ نظامِ فکر مراد نہیں ہے، جو غیر یقینی کیفیات اور ابہام کو جنم دیتا ہے یا جس کے نتیجے میں شاعری نثری پیرائے میں اپنا اظہار کرنے لگتی ہے بلکہ اس نظام اور طرزِ فکر سے مراد یہ ہے کہ تمام ادبی تحاریک سے وابستہ رہتے ہوئے اور اپنے تہذیبی سرمائے سے تعلق کو قائم رکھتے ہوئے کوئی نئی اور تازہ بات پیش کی جائے۔ اس حوالے سے قیصر بارہوی کا یہ بند ملاحظہ فرمائیے۔

پروانۂ جنت کو ملی جدتِ پرواز　　جو دشمنِ جاں تھیں وہ ہوائیں ہوئیں دمساز
کہتی ہے فرشتوں سے طبیعت کی تگ و تاز　　یہ سیرِ فلک ہے غمِ شبیرؑ کا اعجاز
تصویرِ ہنر کھینچ کے تہذیبِ ہنر سے
تحسینِ سخن پاؤں گا اربابِ نظر سے

(مرثیہ: جبرئیل۔ شاہد محضر)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جدید رجحانات سے آگہی اور عصری میلانات سے وابستگی کے باوجود قیصر بارہوی نے جدید اصنافِ سخن سے قطع نظر کر کے ایک قدیم صنفِ سخن یعنی مرثیے سے اپنا ناتا کیوں جوڑا ہے......؟؟ اس کا ایک واضح اور سیدھا سادا جواب تو یہ ہے کہ

---

(۳۶) حق نواز، پروفیسر، قیصر بارہوی۔ ایک منفرد مرثیہ نگار، ماہنامہ ''شام و سحر'' لاہور، جون ۱۹۹۰ء، ص ۶۳

جدید افکار کی پیشکش کے باوجود قیصر بارہوی کا مزاج کلاسیکی ہے اور اسی مزاج کے باوصف انہیں اپنے تہذیبی اصناف میں سے مرثیہ ترسیلِ خیالات کے لئے سب سے زیادہ موزوں مفید اور معتبر معلوم ہوا۔ (۳۷) دوسرا سبب مذہب سے ذہنی قربت اور تیسرا بنیادی اور کلیدی سبب ان کی اپنی زبان سے سنیئے :۔

عالم غیب سے ملتے ہیں مضامینِ سخن حسنِ باطن سے مرصع ہیں براہینِ سخن
رُوح کا آئینہ ہے جلوۂ تمکینِ سخن دل کے دو حرف ہیں سو رنگ سے آئینِ سخن
گفتگو گلشنِ تطہیر سے وابستہ ہے
مرثیہ جنتِ احساس کا گلدستہ ہے

(مرثیہ: غیب)

الفتِ آلِ محمدؐ کے سمندر کی قسم دفترِ نظم سفینہ ہے تو موجیں ہیں قلم
گردِ پاپوش سے زائد نہیں دُنیا کے ستم دستِ کردار میں ہے نادِ علیؑ کا پرچم
ناز کرتا ہوں اس اندازِ گل افشانی پر
فخر ہے باغِ رسالتؐ کی ثنا خوانی پر

(مرثیہ: امام موسیٰ کاظمؑ)

پڑھ لیجئے عبارت ایوانِ مرثیہ تزئینِ قصرِ علم ہیں ارکانِ مرثیہ
قائل ہوئے صفات نگارانِ مرثیہ صورت گرِ ادب ہیں نگارانِ مرثیہ
بے داغ زندگی کی طلب مرثیے میں ہے
انسانیت کا سارا ادب مرثیے میں ہے

(مرثیہ: بیادِ نسیم امروہوی)

قیصر بارہوی کے یہاں جدت دراصل واقعیت سے جنم لیتی ہے۔(۳۸) یہی سبب

(۳۷) انوار ظہوری سید ''اردو مرثیہ گوئی اور قیصر بارہوی'' ماہنامہ ''شام وسحر'' لاہور جون ۱۹۹۰ء ص ۵۸

(۳۸) عاصی کرنالی (تاثرات) 'عظیم مرثیے' لاہور' حلقۂ شعرائے اہلبیتؑ ۱۹۷۷ء ص ۸

ہے کہ ان کے مرثیوں میں جدیدیت تہذیبی روایت کے سائے میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ ان کے یہاں جدت محض لفظی تراکیب سے تشکیل نہیں پاتی اور نہ بھونڈے خیالات شدتِ جذبات کے ساتھ جلوہ گر ہو کر جدتِ طبع کا نام پاتے ہیں، بلکہ قیصر بارہوی تمام جدید افکار و نظریات کو ایک خاص تہذیبی پس منظر میں سمجھنے اور پرکھنے کے بعد پیش کرتے ہیں۔ (۳۹) ذیل میں ان کے مرثیوں سے منتخب کردہ چند بند ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ قیصر بارہوی نے نئی فکر کے سورج کا سفر کس طرح رقم کیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان جدتوں کو صنفِ مرثیہ سے کس طرح مربوط کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی دیکھیے کہ ان بندوں میں کیسے کیسے جدید رنگ اور ذائقے موجزن ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

کون روکے گا نئی فکر کے سورج کا سفر	شہر بستا ہے تو بنتی ہے نئی راہ گزر
ہر زمانے میں ہے ابلاغ کا انداز دگر	قیدیٔ وقت نہیں خونِ شہیداں کا اثر
حشر تک راہ تمدن کا سفر حاصل ہے
مرثیہ قافلۂ حال کا مستقبل ہے

....

وہ لکیریں بھی جو بے ربط نظر آتی ہیں	اک مصور کی نگاہوں میں جگہ پاتی ہیں
خواب مرجھاتے ہیں بیداریاں لہراتی ہیں	مشکلیں نادِ علیؑ سن کے گزر جاتی ہیں
ایک نقطے کو سمجھنا بڑی دانائی ہے
مرثیہ غیب کا معصوم تماشائی ہے

....

ان گنت فاصلے اس عالمِ رفتار میں ہیں	جتنی صدیاں ہیں وہ اس حلقۂ افکار میں ہیں
انقلابات جہاں پنجۂ کردار میں ہیں	جتنے جوہر ہیں اسی فکر کی تلوار میں ہیں

---

(۳۹) عبید اللہ خان، ڈاکٹر، قیصر بارہوی کا مرثیہ حضرت آمنہؑ (آیاتِ آمنہؑ)، لاہور، سفینہ پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۵۱

فرق ظالم پہ یہ تلوار بہت کاری ہے
مرثیہ جذبۂ مظلوم کی بیداری ہے

(مرثیہ: غیب)

کہنے کو آدمی ہے ستاروں کا ہم سفر کہنے کو آج برق کا سینہ ہے رہ گزر
فتح قمر سے، فاتحِ گردوں ہوا بشر کہنے کو اہل عقل نے کاٹے ہوا کے پر
لیکن بلندیوں میں بڑی پستیاں بھی ہیں
گھبرا رہی ہے رُوح وہ سرمستیاں بھی ہیں

(مرثیہ: عرفانِ امامت)

مظلومیت دراصل خدا آشنا مزاج مظلومیت سے لرزہ براندام سامراج
اس در کی مشتِ خاک میں دنیا کے تخت وتاج مظلومیت کو ملتا ہے کونین سے خراج
ہر معرکہ میں جبر نگاہی کی موت ہے
مظلومیت رعونتِ شاہی کی موت ہے

(مرثیہ: مظلومیت اور انسان)

دنیائے بندگی کا مکمل نصاب دل روئے زمیں پہ معدنِ ہر انقلاب دل
معصوم کے بدن میں خدا کی کتاب دل دو حرف میں ہے سارے جہاں کا جواب دل
فطرت نے ربط و ضبط کا محور بنا لیا
دل ہی تو ہے خدا نے جسے گھر بنا لیا

دل قلعۂ وجود میں قدرت کا آبشار سیراب جس سے روح کا بے مثل لالہ زار
وہ لالہ زار نام کا پیکر، عجب شعار جس کی ادا پہ عقل کا ہر ارتقا نثار
لائے جواب یہ کسی صانع میں دم نہیں
دل ہی وہ ظرف ہے جو سمندر سے کم نہیں

(مرثیہ: نمازِ دل)

....

کاوشِ طبع سُنیں حُسنِ طبیعت والے
جدتِ شوق ہے کیا دیکھ لیں جدت والے
سامنے آئیں زمانے کی سیاست والے
یہ عبارت لکھیں اسلام کی غیرت والے
سنگ ریزہ کبھی سورج نہیں کہلا سکتا
صبح پر شام کا الزام نہیں آ سکتا

(سید مسموم)

کیا چاہتا ہے آج کا انساں یہ سوچیے
کیا ہے علاج ذہنِ پریشاں یہ سوچیے
پہنچی کہاں پہ گردشِ دوراں یہ سوچیے
کیا کہہ رہی ہے نبضِ مسلماں یہ سوچیے
ہر سانس اضطراب ہے شُعلہ اساس ہے
پانی کے باوجود قیامت کی پیاس ہے

(عرفانِ امامت)

دریائے مہ و سال میں بہتے ہوئے حالات
اوراقِ تغیر پہ زمانے کی روایات
بکھرے ہوئے ذہنوں کے جنوں بستہ مسامات
ماحول کے ہونٹوں سے سناتے رہے یہ بات
اب روشنی غارِ حرا رُک نہیں سکتی
دنیا سے محمدؐ کی صدا رُک نہیں سکتی

(جناب فاطمہ بنت اسد)

سنتے تھے رات دن جو طلسمی کہانیاں
ان کے لبوں پہ آئی محرم کی داستاں
بے رحمیاں تھیں جن کے خیالوں کی پاسباں
اب سن رہے تھے وہ کسی مظلوم کی فغاں
شیشے طبیعتوں کے نئے رنگ پا گئے
کانٹوں میں تازہ پھولوں کے اوصاف آ گئے

(عزاداریٔ حسینؑ)

قیصر بارہوی بے شمار مرثیوں کے خالق ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک شاعر کسی تاریخی واقعے کو کتنی ہی رنگا رنگی اور تنوع کے ساتھ پیش کرے، اس میں بعض تشابہات کا پیدا ہو جانا بدیہی امر ہے، تاہم قیصر بارہوی کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے تکرارِ محض سے اپنا دامن حتی الوسع بچانے کی کوشش کی ہے۔ اس یکسانیت اور تکرار سے بچنے کے لئے انہوں نے یہ راستہ نکالا ہے کہ ان موضوعات پر رثائی ادب تخلیق کیا ہے جو اردو مرثیہ میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ موضوعات کا یہ تنوع انہیں دوسرے مرثیہ نگاروں سے نہ صرف یہ کہ ممتاز کر دیتا ہے بلکہ یہ ان کی انفرادیت، جدت اور وسعت مطالعہ کی بھی دلیل ہے۔ ذیل میں قیصرؔ بارہوی کے تخلیق شدہ منفرد مرثیوں کے اولیں مصرعے مع موضوعات و عنوانات پیشِ خدمت ہیں۔ ان عنوانات ہی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُردو میں ان موضوعات پر شاید ہی مکمل اور منضبط مرثیے لکھے گئے ہوں۔ آپ دیکھیئے کہ کس طرح ان منفرد مرثیوں میں موضوعات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن ہے، ملاحظہ فرمایئے:۔

انساں کی آبرو ہے عزاداریٔ حسینؑ	(عزاداریٔ حسینؑ)
خدا کے شہر سے گزرا جو کاروانِ خیال	(روزہ کی فضیلت)
پھر طائرِ خیال ہے شہرِ خلیلؑ میں	(فضیلتِ حج)
عالمِ غیب سے ملتے ہیں مضامینِ سخن	(علمِ غیب)
اے اہلِ فکر کعبۂ دل کی اذاں سنو	(کعبہ اور محافظانِ کعبہ)
جدید عہدِ سخن کا نظام لایا ہوں	(کربلا اور نجف)
دل ہے تو زندگی کے چمن میں بہار ہے	(نمازِ دل)
ظلمتیں پھولتی پھلتی ہیں خدا خیر کرے!	(آشوبِ عصر)
دنیا میں نیا بابِ سخن کھول رہا ہوں	(شاہدِ محضر ...... جبریلؑ)
دوستو! انسان کے اندر بھی اک انسان ہے	(حضرت بلالؓ)
نماز سے بشریت عروج پاتی ہے	(فضیلت نماز)

ابھرا ہے لوحِ فکر پہ اک لازوال نام (حضرت آمنہؓ)

....

قیصرؔ بارہوی کی سوچ کے زاویے آفاقی قدروں کے حامل ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ کربلا اور کربلا والوں کو ایک عالم گیر تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ شعر و ادب لائق صد تحسین اور قابلِ افتخار ہے جس میں کربلا کو کسی استعاراتی نظامِ فکر کے حوالے سے پیش کیا جائے۔ قیصرؔ بارہوی کے اس طرزِ احساس کے پسِ پشت ان کا یہ نظریہ کارفرما ہے کہ کربلا کا واقعہ محض ایک اتفاقی اور جذباتی سانحہ نہیں بلکہ درسِ عمل اور درسِ حیات ہے۔ اس سلسلے میں ان کا موقف نہایت واضح ہے کہ کربلا والوں کے طرزِ حیات کا پرچار کرنا دراصل اعلیٰ تر اخلاقی اقدار کا پرچار کرنا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر ملحوظ رہے کہ وہ افراد سے زیادہ اقدار کے پرچارک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ''پروپیگنڈے'' سے کوسوں دُور ہے۔ اس سلسلے میں چند بند ملاحظہ فرمائیں:

بے شک وہ حرف و لفظ ہیں مثلِ مہ و نجوم　　جو ذکرِ کربلا میں ہوئے دفترِ علوم
لاریب اس ادب نے مچائی ادب میں دُھوم　　جو فکرِ کربلا سے مزین ہے بالعموم
مقتل کی سرخیوں سے قلم زرنگار ہے
جس میں ہے کربلا وہ سخن پائیدار ہے

....

دیکھے ہیں ہم نے سارے جہاں کے سخن طراز　　انسانیت ہے جن کے بدن کی قبائے ناز
اس وحدتِ خیال میں لیکن یہ امتیاز　　ہر شہر جا نماز ہے اور کربلا نماز
ظالم سے نفرتوں کے تقاضے کہاں نہیں
مظلومیت کی فتح کے سجدے کہاں نہیں

....

شاعر کسی خیال کا ہو یا کوئی ادیب   واعظ کسی دیار کا ہو یا کوئی خطیب
تاریخ تولتا ہے جہاں کوئی خوش نصیب   اس طرح بات کرتا ہے احساس کا نقیب

اللہ رے سلسلہ ادب مشرقین کا
دنیا کی ہر زباں پہ ہے قبضہ حسینؑ کا

(مرثیہ: انسان اور کربلا)

....

واقعۂ کربلا عمودی اور اُفقی دونوں سطحوں پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اُفقی سطح پر کربلا کی علامت انسانی زندگی اور زندگی کے معاشرتی پہلوؤں سے اپنا تعلق ثابت کرتی ہے اور عمودی سطح پر یہ بندے کو خدا سے ملانے کا وسیلہ بنتی ہے۔ قیصؔر بارہوی اپنے مرثیوں کا مواد واقعۂ کربلا ہی سے حاصل کرتے ہیں مگر اس سلسلے میں وہ آفاقی صداقتوں اور عصری ضرورتوں کو نظرانداز نہیں ہونے دیتے۔ (۴۰) آپ قیصؔر بارہوی کے مرثیوں کا بنظر غائر مطالعہ کیجیے' آپ کو ان میں جگہ جگہ قومی اور ملی طرزِ احساس اُجاگر ملے گا۔ وہ ان مرثیوں کے ذریعے فقط عوام الناس کی اصلاح کے خواہش مند نہیں بلکہ معاشرے میں رستے ہوئے ناسوروں کا سراغ بھی لگاتے ہیں اور اسلام و کفر کی پنجہ آزمائی میں باطل قوتوں کے چہرے سے نقاب بھی اُلٹ دیتے ہیں' ذیل میں مختلف مرثیوں کے چند بندوں کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ قیصؔر بارہوی نے مرثیے کو کس طرح شہر آشوب میں اور شہر آشوب کو کس طرح آشوبِ عصر میں تبدیل کردیا ہے' ملاحظہ فرمایئے۔

ظلمتیں پھولتی پھلتی ہیں خدا خیر کرے   بجلیاں رنگ بدلتی ہیں خدا خیر کرے
گروشیں اور مچلتی ہیں خدا خیر کرے   بستیاں آگ اُگلتی ہیں خدا خیر کرے

محوِ حیرت ہوں کہاں بول رہی ہے دنیا
خونِ انساں سے دھواں تول رہی ہے دنیا

---

(۴۰) حاسی کرنالی (تاثرات) 'عظیم مرثیے' لاہور' حلقہ شعرائے اہلبیتؑ ۱۹۷۷ء ص ۹

یہ خریدے ہوئے ہاتھوں میں چمکتے خنجر   جسم گلیوں میں نظر آتے ہیں چوراہوں پہ سر
کوئی اوڑھے ہوئے سوتا ہے لہو کی چادر   بال کھولے کہیں روتی ہے کسی کی دختر
پاسِ مذہب نہیں، غیرت نہیں، ایمان نہیں
ایسا لگتا ہے بھرے شہر میں انسان نہیں

(مرثیہ: آشوبِ عصر)

کیا چاہتا ہے آج کا انساں یہ سوچیے   کیا ہے علاجِ ذہنِ پریشاں یہ سوچیے
پہنچی کہاں پہ گردشِ دوراں یہ سوچیے   کیا کہہ رہی ہے نبضِ مسلماں یہ سوچیے
ہر سانس اضطراب ہے شعلہ اساس ہے
پانی کے باوجود قیامت کی پیاس ہے

(مرثیہ: عرفانِ امامت)

قیصرؔ بارہوی اس سماجی انتشار و افتراق کا نہ صرف یہ کہ بغور مشاہدہ کرتے ہیں بلکہ وہ ان نفوس پر بھی کڑی نگاہ رکھتے ہیں، جن کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے اور وہ بظاہر مسیحِ دوراں اور بباطن گمراہ اور گم کردہ راہ ہوتے ہیں۔ قیصرؔ بارہوی ایسے منافقانہ ماحول اور ابتر صورتِ حال پر افسردہ ہو کر چلا اٹھتے ہیں۔

اک طرف حرمتِ انساں پہ ہزاروں مضموں   اک طرف زہرِ سیاست سے ہر انسان کا خوں
اک طرف چاند ستاروں پہ حکومت کا جنوں   اک طرف مقتلِ کردار کی تدبیر زبوں
لبِ خنداں سے شرافت کا لہو چاٹتے ہیں
کیا ادائیں ہیں گلے مل کے گلا کاٹتے ہیں

(مرثیہ: آشوبِ عصر)

کیا منصفانِ فکر نے سوچا کبھی ذرا   ملت ہے کیوں نفاق کی آفت میں مبتلا
کیا سچ نہیں یہ رنگِ طبیعت کا ماجرا   دل میں تو رام رام زباں پر خدا خدا

کہنے کو سب کے ہاتھ میں حبل المتین ہے
لیکن سوادِ غیر پہ کامل یقین ہے

(مرثیہ: نمازِ دل)

....

قیصرؔ بارہوی مسلمانوں کی اس ناگفتہ بہ صورتِ حال کا تجزیہ انتہائی دانش مندی سے کرتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ آج بھی اسلام دشمنی پر کمربستہ ہیں۔ وہ "مسلمانوں کو لڑاؤ اور ان پر ٹھاٹھ سے حکومت کرو" کی پالیسی پر آج بھی کاربند ہیں۔ ساری دنیا میں یہود و نصاریٰ مختلف حیلوں اور بہانوں سے مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال پھیلا رہے ہیں۔ مسلمان اپنی بداعمالیوں اور غیر دانش مندانہ حرکات کی وجہ سے اتنے فرومایہ، غیر فعال اور بے حس ہو گئے ہیں کہ نہ تو وہ ان سازشوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ اس دلدل سے باہر نکلنے کی کاوش کرتے ہیں۔ (۴۱) مسلمانوں کی اس بے عملی، بے غیرتی، بے حسی، انفعالیت اور زبوں حالی کو قیصر بارہوی نے جس حزنیہ لب و لہجہ میں بیان کیا ہے، وہ بجائے خود ملی مرثیے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خاص طور پر مغربی استعمار کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کا لب و لہجہ انتہائی تند و ترش ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ بھی چند بند ملاحظہ فرمائیں:

کہنا پڑے گا چھوڑ دی ہم نے رہِ وفا زندہ تھی جس سے قوم وہ کردار مٹ گیا
کہنا پڑے گا ہم ہیں اندھیروں کی انتہا قرآں کے دشمنوں کو سمجھتے ہیں ناخدا
توڑے عمل کے شیشے تعیش کے سنگ نے
لوٹا تمام باغ ہوائے فرنگ نے

....

فکرِ یہود و فکرِ نصاریٰ وہ شیش ناگ صدیوں کے تن بدن میں ہے جن کے پھنوں کا جھاگ
پھیلی ہے سرحدوں پہ جہاں خشک و تر کی آگ شعلے وہاں الاپ رہے ہیں انہی کا راگ

---

(۴۱) فخر الحق نوری، قیصر بارہوی کا ایک منفرد مرثیہ (آیاتِ آمنہ)، لاہور، سفینہ پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۶۵

اس راگ میں وہ شام ہے جس کی سحر نہیں
اسلام جل رہا ہے ہمیں کچھ خبر نہیں

(مرثیہ: آیاتِ آمنہؑ)

مغرب میں ڈوبتی ہوئی تہذیب کا اثر مشرق کی حرمتوں کو پھراتا ہے دربدر
اہلِ قلم نے غیرتِ احساس چھوڑ کر عشرت کے گیت گائے ہیں سورج کی لاش پر
شام و سحر کو عالمِ یک رنگ کر دیا
انسانیت کو دستِ تہہ سنگ کر دیا

(مرثیہ: عرفانِ امامت)

اس پر تشدد ذہیبت ناک اور خون آشام منظر کو دیکھ کر قیصر بارہوی کا تخیل کربلا کی طرف پرواز کر جاتا ہے اور وہ کربلا کے میدان میں اپنے لہو سے حق اور صداقت کی شمع جلانے والوں کو فخر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اگر اس کرب ناک معاشرتی صورتِ حال سے انسان کو کوئی چیز نجات دلا سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف کربلا ہے۔ اگر آج کا انسان اپنا کھویا ہوا شرف اور وقار حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اُسوۂ شبیریؑ پر عمل پیرا ہو کر آج بھی عظمتِ کردار کا مینارۂ نور بن سکتا ہے کیوں کہ:۔

انسان کو عظیم بناتی ہے کربلا تہذیب ردِ ظلم سکھاتی ہے کربلا
فطرت کو روشنی سے سجاتی ہے کربلا ذہنوں میں آفتاب اُگاتی ہے کربلا
منسوب ہو جو فکرِ حسینیؑ بیان سے
برسیں مہ و نجوم بشر کی زبان سے

(مرثیہ: انسان اور کربلا)

اسی بات کو یوں کہہ لیجئے کہ قیصر بارہوی عصرِ حاضر کے کرب کو کربلا کے وسیع تناظر میں دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ اس طرح ان کا ایک تہذیبی روایت سے رشتہ بھی قائم ہو جاتا ہے اور اس طرح درد و غم کی کثرت سے ان کی شاعری میں تاثیر کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے

ساتھ ساتھ ان کا موقف یہ بھی ہے کہ کربلا کے واقعے کے اثرات اتنے ہمہ گیر اور زود اثر ہیں کہ کوئی بھی قلم کار اس کے دائرہ اثر سے باہر نہیں نکل سکتا' کیونکہ بقول قیصر بارہوی ۔

چہرۂ وقت کے قاری ہیں وہی اہلِ قلم عدل و انصاف سے رکھتے ہیں جو لفظوں کا بھرم
عالمِ امن ہو یا منظرِ بازارِ ستم یہ صدا گونجتی ہے سب کے لبوں پر پیہم
جب کوئی درد کی تصویر نظر آتی ہے
کربلا لوحِ تصور پہ اُبھر آتی ہے

(مرثیہ: آشوبِ عصر)

قیصر بارہوی موجودہ عہد کو کربلا سے جوڑ کر ایک طرف تو انسانوں کے اندر جذبۂ شہادت پیدا کرتے ہیں اور دوسری طرف عوام الناس کو باطل قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں ۔ اس طرح وہ مجموعی طور پر انسانیت کی تکریم کا سبق دیتے نظر آتے ہیں ۔ اس سلسلے میں وہ دانشوروں' ادیبوں' شاعروں اور فنکاروں سے یہی التجا کرتے ہیں کہ وہ انسان کی عظمت و حرمت کی پاسداری کریں ۔ آج انسان جن مسائل و معاملات میں گھرا ہوا ہے' اگر اہلِ دانش و بینش توجہ کریں تو انسان آج بھی اپنا گم گشتہ وقار حاصل کر سکتا ہے ۔ قیصر بارہوی کی یہ سوچ انتہائی مخلصانہ' توجہ طلب اور قابلِ فخر ہے ۔ ان کے اسی ایک نکتہ سے ان کی مرثیہ نگاری کا وقار دوچند ہو جاتا ہے' ملاحظہ فرمائیں: ۔

حلقۂ شعر و ادب' انجمنِ اہلِ خطاب سیفِ تخیل سے اب چاہیے بھرپور جواب
پھیلتا جاتا ہے الحادِ سخن کا سیلاب آج ہر فکر میں درکار ہے وحدت کا نصاب
وقت کا آئینہ دنیا کو دکھانا ہو گا
قید سے حرمتِ انساں کو چھڑانا ہو گا

(مرثیہ: آشوبِ عصر)

قیصر بارہوی کے بعض مرثیوں میں آغاز تا انجام ایک حزنیہ کیفیت طاری رہتی ہے ۔ عام طور پر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ مرثیہ نگار سامعین پر رقت طاری کرنے کے لئے آخری پندرہ

میں بند بکا کے لئے مخصوص کر دیتے ہیں۔ قیصر بارہوی کا طریقۂ کار اس سے مختلف اور منفرد ہے۔ وہ بعض اوقات ابتداء ہی میں ایک ایسا سحر انگیز حزنیہ دائرہ کھینچ دیتے ہیں کہ قاری و سامع اس سے باہر نہیں نکلتا۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ جدید افکار و نظریات کی پیشکش کے باوجود جوشؔ کے برعکس قیصر بارہوی کے مرثیوں میں "مرثیت" کی کمی نہیں ہے۔ مرثیت کے اسی فقدان نے جوشؔ کے بعض مرثیوں کو "مسدس" کہلوادیا ہے۔ قیصر بارہوی کے یہاں حزنیہ ماحول کی رو پورے مرثیے میں سرایت کر جاتی ہے۔ ذیل میں دیئے ہوئے مرثیوں کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ کس طرح قیصر بارہوی نے آغاز ہی میں المیے کی کیفیت کا دائرہ کھینچ دیا ہے:۔

حسینؑ لاشہ اکبرؑ تلاش کرتے ہیں
یثرب میں لٹ کے آئی جو اولادِ مصطفیٰؐ
فاطمہؑ واقعۂ کرب و بلا سنتی ہیں
پھر آ گیا ہونٹوں پہ دھواں آتشِ غم سے
دل والو سنو! واقعۂ اشک فشانی
پھر خیمۂ نگاہ سے تازہ دھواں اٹھا
زنجیر تخیل میں گرفتار ہیں آنسو
زینبؑ کے نام سے ہے بقائے حسینیتؑ

قیصر بارہوی کے کلام میں یہ الم انگیز اور غمناک عناصر اس وقت اور بھی شدت اختیار کر لیتے ہیں، جب مرثیہ اپنے منطقی انجام کی جانب رواں دواں ہوتا ہے۔ ان لمحات میں تو قیصر بارہوی جذبات کا اظہار اتنی شدت سے کرتے ہیں کہ قاری کی آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔ قیصر بارہوی کے درد و غم سے مالا مال ان بندوں کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھئے کہ آہ و فغاں سے مملوان بندوں پر دبیر کی چھوٹ پڑتی دکھائی دیتی ہے ۔

مقتل میں ذبح ہو گیا فرزندِ بوترابؑ اصغرؑ کی یاد میں تو تڑپتی رہی رباب
زینبؑ کہاں ہو دیکھ لو نیزے پہ آفتاب فضہؑ دہائی دے کے پکاری بہ اضطراب

بستی اُجڑ گئی ہے مقدر اُلٹ گیا
چوما تھا جس گلے کو وہ خنجر سے کٹ گیا

(مرثیہ: انسان اور کربلا)

بھیا! کہو تو زلفِ مبارک سنوار دوں بھیا اگر غبار ہو رُخ پر صفا کروں
اب تو گلے کے زخم سے بہتا نہیں ہے خوں بھیا! بتاؤ اب تو میسر ہوا سکوں
پہلو میں اب چبھے ہوئے بھالے ہیں یا نہیں
بھیا! کسی نے تیر نکالے ہیں یا نہیں

(مرثیہ: مظلومیت اور اسلام)

کوئی مجھے بتائے یہ صدمے کسی نے پائے مارے طمانچے شمر نے، دُکھیا کسے سنائے
کانوں سے خون بہتا تھا بچی کسے بتائے کرتے میں آگ لگ گئی آئے کوئی بجھائے
کیا اب کسی کے سینے میں خوفِ خدا نہیں
بچی تڑپ رہی ہے کوئی پوچھتا نہیں

(مرثیہ: آیاتِ آمنہ)

قیصر بارہوی کا اسلوب انیسؔ و دبیرؔ کے اسالیب بیان کے امتزاج کا آئینہ دار ہے۔ ان کا تخیل بلند پرواز ہے اور اسی سبب سے ان کے یہاں دبیرؔ کا شان و شکوہ اور جاہ و جلال جلوہ گری کرتا ہے۔ انیسؔ سے بے پناہ متاثر ہونے کی وجہ سے ان کے اسلوب بیان میں بے ساختگی اور سلاست و روانی پیدا ہو گئی ہے۔ ان دونوں مختلف النوع اسالیب کے حسین امتزاج کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ قیصر بارہوی کے یہاں نہ تو دبیرؔ کا سا دشوار اور گنجلک اسلوب ظاہر ہوتا ہے اور نہ انیسؔ کی طرح سلاست و روانی کی وجہ سے اسلوب میں عوامی رنگ پیدا ہوا ہے۔ ذیل کے مرثیوں کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ ان پر دبیرؔ کے اسلوب بیان کا اثر کس کس طرح ظاہر ہوا ہے۔

کافورِ صبح جب شبِ عاشور ہو گئی
جب نقرئی قبا میں فلک جلوہ گر ہوا

جس دم نگار خانۂ قدرت کا در کھلا

زنجیرِ تخیل میں گرفتار ہیں آنسو

جب خیمۂ نگاہ سے تازہ دھواں اُٹھا

قیصر بارہوی کی مرثیہ نگاری پر دبیرؔ کے رنگِ شاعری کا اثر دو سطحوں پر ظاہر ہوا ہے۔ پہلی سطح پر تو وہ عملی افکار کی پیشکش کی وجہ سے دبیری رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور دوسری سطح پر ان کے ہاں دبیرؔ کی طرح لفظوں کا فنکارانہ اور عالمانہ استعمال دکھائی دیتا ہے۔ (۴۲) ذیل کے بند دیکھیے کہ کس طرح قیصر بارہوی نے افکار و اسالیب میں دبیرؔ کی شعوری یا لاشعوری پیروی کی ہے۔

"صورتِ خادمہ جاؤں گی مجھے لے چلیے　　ہاتھ فضہؔ کا بٹاؤں گی مجھے لے چلیے

میں کسی کو نہ ستاؤں گی مجھے لے چلیے　　منہ سکینہؔ کا دھلاؤں گی مجھے لے چلیے

جسے کہتے ہیں دوا، نام نہ لوں گی بابا

لوریاں آپ کے معصوم کو دوں گی بابا

(مرثیہ: غیب)

....

میں عہد کرتی ہوں ماں جائے کے لہو سن لے　　تجھے چھپا نہ سکیں گے یہ ظلم کے پردے

تری کہانیاں دھرا کے خشک ہونٹوں سے　　میں چھین لوں گی زمانے سے دل شکن لہجے

یہ غم نہیں ہے کہ اب سوگوار قیدی ہوں

بہن حسینؔ کی ہوں فاطمہؔ کی بیٹی ہوں

....

(مرثیہ: نقشِ علیؔ و بتولؔ)

میں پوچھتی ہوں کیا مرے بچے کا تھا قصور　　کیوں خون میں ڈبو دیا انسانیت کا نور

کیا جرم تھا جواب تو دے فوج پر غرور　　اک قطرہ آب کا مرے اصغرؔ سے دُور دُور

---

(۴۲) مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، اردو مرثیے میں مرزا دبیر کا مقام، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۷۲

کس طرح اپنا لختِ جگر دیکھتی ہوں میں
نیزے پہ شیر خوار کا سر دیکھتی ہوں میں"

(مرثیہ: آیاتِ آمنہؑ)

....

بولے علیؑ چلو مرے لختِ جگر چلو ‏ ‏ تاخیر اب نہ چاہیئے نورِ نظر چلو
دل بے قرار ہو گیا جلدی سے گھر چلو ‏ ‏ زینبؑ کہیں نکل نہ پڑے تیز تر چلو
عباسؑ سے کہو کہ وہ در پر نظر رکھے
ہم جلد آ رہے ہیں بہن کی خبر رکھے

....

قیصرؔ بارہوی کے ان مرثیوں میں شاید آپ کو رزمیہ عناصر، ساقی نامے، تلوار کے مدحیہ قصائد، گھوڑے کے محاسن، مناظرانہ مباحث اور فکری موعظت وغیرہ تو کثرت سے نہ مل سکیں۔ لیکن واقعۂ کربلا کی روشنی میں اعلیٰ تر اخلاقی اقدار کی ترجمانی ضرور ملے گی۔ قیصرؔ بارہوی کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے بیسویں صدی کی جدید روایات اور اپنی تہذیبی اور کلاسیکی روایات کے امتزاج سے صنفِ مرثیہ کو ایک نیا ذائقہ دیا اور ایک نئی راہ سجھائی ہے۔ (۴۳) اب کہا جا سکتا ہے صنفِ مرثیہ کے حوالے سے موجودہ دور قیصرؔ بارہوی کا دور ہے۔

اپنے مضمون کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ انیسؔ و دبیرؔ نے برصغیر کے تہذیبی اثرات اور واقعۂ کربلا کے ہمہ گیر اثرات کو نہایت فن کاری کے ساتھ ملا جلا کر اپنے مرثیوں میں محفوظ کر دیا تھا۔ اب اسی معروضے کی روشنی میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قیصرؔ بارہوی نے بھی پاکستانی طرزِ احساس اور کربلا کے اثرات کو ایک دوسرے میں جذب کر کے مرثیوں کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب اگر ہم چاہیں تو ان مرثیوں میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ پاکستانی اسلامی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں۔

---

(۴۳) عبید اللہ خان، ڈاکٹر، قیصر بارہوی کا مرثیہ حضرت آمنہؑ (آیاتِ آمنہؑ) لاہور، سفینہ پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۵۳

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں مزید اس طرح کی شاں دار، مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

ایک معتبر مرثیہ نگار......سید وحید الحسن ہاشمی

(۱)

شعروادب میں ایسے واقعات زیادہ اہم قرار پاتے ہیں جو انسان کی اجتماعی زندگی اور معاشرت پر براہ راست اثرانداز ہوتے ہیں۔ واقعۂ کربلا محض ایک تخیلی داستان نہیں بلکہ اس واقعے میں معاشرت کرنے کے اعلیٰ اقدار مل جائیں گے۔ یہی سبب ہے کہ دوسرے تاریخی واقعات کی بہ نسبت واقعۂ کربلا نے انسانی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ حق گوئی، مظلومیت اور تمرد کے خلاف جہاد کرنا، یہ ایسے اعلیٰ اقدار ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ معاشروں کو متاثر کیا بلکہ اس کے اثرات ادب و شعر پر بھی مرتسم ہوئے۔ (۱) یہی سبب ہے کہ اعلیٰ قدروں کی ترویج کے لئے کربلا کو استعارہ بنایا گیا (۲) اور ان استعاروں اور تلازموں

---

(۱) مجتبیٰ حسین، پروفیسر "مرثیہ اور عہد جدید" مشمولہ جدید مرثیہ نگاری از سید وحید الحسن ہاشمی، لاہور، مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۶۷ء، ص ۱۸۴

(۲) گوپی چند نارنگ، سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰

سے نہایت عمدہ اور کارگر شہ پارے تخلیق کئے گئے۔ (۳، ۴)

بالعموم یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ واقعۂ کربلا نے مختلف اصنافِ شعر و ادب کو متاثر کیا، بطور ثبوت غزل، داستان، افسانہ، مثنوی، ناول، نظم، ناولٹ اور دیگر اصناف میں سے چیدہ چیدہ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعۂ کربلا نے محض شعر و ادب ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ اُردو شاعری کو متعدد اصناف سے مالا مال بھی کیا۔ سلام، نوحہ اور مرثیہ کا بغور مطالعہ کیجئے اور اس سوال کا کھوج لگائیے کہ کیا واقعہ کربلا کے بغیر ان اصناف کا ظہور میں آنا ممکن تھا؟؟

صنفِ مرثیہ وہ ممتاز صنف ہے، جس کا خمیر اسی برصغیر میں تیار ہوا اور یہی وہ صنف ہے کہ جس میں اُردو کے بیشتر اصناف کے محاسن کا جوہر مل جاتا ہے۔ (۵) اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ مرثیے کی صنف کو برصغیر پاک و ہند سے جو خصوصیت ہے وہ کسی دوسری صنف کو حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح کہا جاسکتا ہے کہ سلام و نوحہ بھی صنفِ مرثیہ کی توسیع ہیں۔

مرثیہ، سلام اور نوحے کے اصناف ہر عہد میں اس لئے مقبولِ خاص و عام رہے کہ ان میں زندگی کی اعلیٰ قدریں پیش کی جاتی رہیں اور اسی سبب سے ان کے ذریعے اعلیٰ تر معاشرتی رویے ظاہر ہوئے۔ آج بھی مذکورہ اصناف میں واقعۂ کربلا کے حوالے سے زندگی بسر کرنے کے بہترین تصورات مل جائیں گے۔ (۶) واقعۂ کربلا کا یہ فیضان ہے کہ اس نے ایک سطح پر تو انسان کا تعلق خدا سے اور دوسری سطح پر انسان کا تعلق اعلیٰ تر معاشرتی اقدار سے جوڑ دیا ہے۔ عصرِ حاضر میں ایسے شعراء کی ایک کثیر تعداد موجود ہے، جو ان اصناف کے حوالے سے

---

(۳) محمد حسن، ڈاکٹر ''ادبی سماجیات کے نقطۂ نظر سے مرثیے کا مطالعہ'' سہ ماہی ''رثائی ادب'' کراچی، اپریل ۲۰۰۲ء، ص ۱۱

(۴) سلیم اختر، ڈاکٹر ''وحید الحسن ہاشمی کے مرثیے'' مشمولہ ''العطش'' (جلد سوم) لاہور، الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۲۳۵

(۵) خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، قدیم نظمیں، لاہور، بک ورلڈ، ۱۹۶۴ء، ص ۱۷۲

(۶) سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، معروضات، لاہور، پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ۳۷

معاشرے میں مثبت اقدار کو فروغ دینے میں مصروف ہیں۔ انھی میں ایک سید وحید الحسن ہاشمی بھی ہیں' جو تقریباً نصف صدی سے مذکورہ اصناف کی آبیاری خونِ جگر سے کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ کربلا کے واقعے کے مختلف پہلوؤں کو جس طرح اُجاگر کیا ہے' وہ قابلِ تحسین ہے چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ موصوف نے واقعۂ کربلا کے اعلیٰ اخلاقی اقدار کو معاشرے میں رائج کرنے کا قابلِ قدر فریضہ انجام دیا ہے اور اسی باعث ان کا کلام بقول ڈاکٹر محمد سعید معزالدین نوجوان نسل کے لیے قابلِ تقلید نمونہ اور مشعلِ راہ ہے۔ (۷)

آپ کا نامِ نامی اور اسمِ گرامی سید وحید الحسن ہے تاہم موصوف وحید الحسن ہاشمی کے قلمی نام سے مقبولِ عام و خاص ہیں۔ آپ ۱۹۳۰ء میں شیرازِ ہند جون پور میں پیدا ہوئے۔ (۸) آپ کے دادا مولوی میر انتظام علی جونپور میں فارسی قصیدے کے ایک مستند استاد تسلیم کیے جاتے تھے۔ آپ کے والد گرامی سید شبیر حسن صفا الہ آبادی (۱۸۸۳ء۔ ۱۹۷۵ء) فارسی' اُردو اور ہندی کے صاحبِ دیوان شاعر ہوئے۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن جونپور میں حاصل کی۔ ۱۹۴۴ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول جونپور سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کی سند آر۔ ایس۔ کے۔ ڈی انٹر کالج جونپور سے ۱۹۴۶ء میں حاصل کی۔ اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ بی۔ اے کا امتحان دے کر جولائی ۱۹۴۸ء میں کراچی تشریف لے آئے' یہاں ایک سرکاری ملازمت کرلی۔ اسی دوران ۱۹۴۸ء میں بی۔ اے کے امتحان کی سند بھی موصول ہوگئی۔ ۱۹۴۹ء میں لاہور تشریف لے آئے' اور پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔ اے اُردو میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۵۱ء میں ایم۔ اے اُردو کرنے کے بعد درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ ابتداً وطن

---

(۷) محمد سعید معزالدین' ڈاکٹر ''سید وحید الحسن ہاشمی۔ ایک دردمند شاعر'' ماہنامہ ''شام و سحر'' لاہور' دسمبر ۲۰۰۲ء' ص ۱۳

(۸) طاہر حسین کاظمی' ڈاکٹر' اُردو مرثیہ' میر انیس کے بعد' دہلی' ایرانین آرٹ پرنٹرز' ۱۹۹۷ء' ص ۳۸۵

اسلامیہ ہائی اسکول میں بطور معلم اپنے فرائض کی بجا آوری کرتے رہے۔ ازاں بعد نواب مظفر علی خان قزلباش کے قائم کردہ ''حسینیہ ہائی اسکول لاہور'' میں تیس برس تک صدر معلم یعنی پرنسپل کی حیثیت میں اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۵ء میں شدید علالت کے بعد آپ نے اپنا تبادلہ پاکستان ماڈل ہائی اسکول رحمٰن پورہ لاہور میں کرالیا اور یہیں سے ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہوئے۔ آج کل موصوف اپنا بیشتر وقت تصنیف و تالیف میں گزار رہے ہیں۔(۹)

سید وحید الحسن ہاشمی ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد صاحب طرز شاعر تھے۔ آپ کے بڑے بھائی سید محبوب الحسن حبیب شعر گوئی میں نہایت زود گو واقع ہوئے تھے اور اپنے زمانے کے معروف غزل گو شاعر علامہ آرزو لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے(۱۰) اس گھریلو فضا میں شعری ماحول سے متاثر ہو کر وحید الحسن ہاشمی نے بھی بارہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ اپنے بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ۱۹۴۵ء میں آپ نے اپنی پہلی باقاعدہ غزل علامہ آرزو کو اصلاح کے لئے پیش کی، جس کا مطلع تھا۔

نہ آنکھوں میں آنسو نہ لب پر خوشی ہے
عجب کشمکش میں مری زندگی ہے

علامہ آرزو لکھنوی نے اس غزل کے صرف ایک شعر پر معمولی اصلاح دی اور توصیفی الفاظ کے ساتھ غزل واپس کر دی۔ آرزو لکھنوی کی اصلاح ملاحظہ فرمائیں۔

اصل شعر:

مبارک مبارک شہیدِ محبت
کہ اس راہ میں موت بھی زندگی ہے

---

(۹) عبدالکریم خالد، پروفیسر ''تہذیب و ادب کی زندہ علامت'' ماہنامہ ''خواجگان'' لاہور، مارچ ۲۰۰۱ء، ص ۲۰

(۱۰) شبیہ الحسن، ڈاکٹر، کلیات حبیب، لاہور، الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰

اصلاح شدہ شعر:

مبارک مبارک شہیدِ محبت

کہ اس راہ میں موت ہی زندگی ہے (۱۱)

آپ نے رفتہ رفتہ اپنے کلام کے بل بوتے پر جونپور اور اس کے گرد و نواح میں اپنی شاعرانہ حیثیت کو منوانا شروع کر دیا تھا۔ ہندوستان کے جن مقتدر بزرگ شعراء سے انہیں نیازمندی حاصل رہی ان میں نوحؔ ناروی، جگرؔ مراد آبادی، شفیقؔ جونپوری، صفیؔ لکھنوی، یاس یگانہ چنگیزی، دل شاہجہانپوری، سیماب اکبر آبادی، نجم آفندی، سلام مچھلی شہری، وامق جونپوری اور فراق گورکھپوری کے اسمائے گرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

کراچی تشریف لانے کے بعد یہاں کی علمی و ادبی محفلوں میں آپ نہایت جوش و خروش سے حصہ لیتے رہے۔ استاد قمر جلالوی سے آپ کے نہایت دیرینہ مراسم تھے اور یہ سلسلہ لاہور آنے تک برقرار رہا۔ (۱۲)

شہر لاہور کی ادبی فضا اور شعری مذاق اگرچہ کراچی کے علمی اور ادبی ماحول سے قدرے مختلف ہے لیکن وحید الحسن ہاشمی کی اُفتادِ طبع نے یہاں خوب خوب جوہر دکھائے۔ آپ کی شاعری کا بیشتر حصہ لاہور کے ادبی ماحول کا منت پذیر ہے۔ یہاں جو شعراء آپ کے ہم جلیس اور ہم عصر رہے، ان میں قیوم نظرؔ، احسان دانشؔ، شہرتؔ بخاری، ناصرؔ کاظمی، ہوشؔ ترمذی، احمد ندیمؔ قاسمی، عابد علی عابدؔ، عارف عبدالمتین، سجاد باقر رضوی، طفیل دارا، نشترؔ جالندھری، رسا جالندھری، قمر میرٹھی، قتیل شفائی، قیصر بارہوی، سیف زلفی، مظفر وارثی، مرتضیٰ برلاس، حسن عسکری کاظمی، عاصم گیلانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

وحید الحسن ہاشمی علامہ سہیل بلگرامی کی استادانہ لیاقت اور شعری صلاحیتوں کے

---

(۱۱) ضمیر اختر نقوی، اردو مرثیہ پاکستان میں، کراچی، سید اینڈ سید، ۱۹۸۲ء، ص ۷۵۴

(۱۲) عبدالکریم خالد "تہذیب و ادب کی زندہ علامت"، ماہنامہ "خواجگان" لاہور، مارچ ۲۰۰۱ء، ص ۱۳

معرف اور معترف ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں آپ نے ان سے غزلوں پر اصلاح لینا شروع کی لیکن ۱۹۵۸ء میں علامہ موصوف رحلت فرما گئے تو آپ سید آلِ رضا لکھنوی سے اصلاح لینے لگے، جو آرزو لکھنوی کے شاگردِ رشید تھے۔ سید آلِ رضا کی وفات (۱۹۷۸ء) کے بعد موصوف نے اپنی افتادِ طبع پر بھروسہ اور مشقِ سخن پر تکیہ کیا، گویا ۱۹۷۸ء سے تلمیذ الرحمٰن ہیں۔

وحید الحسن ہاشمی نے نثر و نظم دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری نے انہیں کثیر الجہات شخصیت قرار دیا ہے۔ (۱۳) اصنافِ سخن کے لحاظ سے غزلیں بھی کہیں اور سلام و نوحہ بھی تصنیف کئے۔ مرثیے بھی لکھے اور قصائد و منظومات سے بھی شغف رکھا تاہم صنفِ مرثیہ اور سلام سے آپ کو خصوصیت ہے کہ آپ نے ان اصناف میں سماجی ضرورتوں اور عصری تقاضوں اور طبعی رجحان کے فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ نے انفرادی سطح سے تجاوز کر کے اجتماعی سطح پر عزائی ادب کے فروغ کے لئے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں، جس کے معترف و معرف جملہ اہلِ پاکستان ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں آپ نے جدید مختصر مرثیے کی ضرورت اور افادیت کا پہلی مرتبہ احساس دلایا اور اس طرح جدید مختصر مرثیے کی بنیاد رکھی جو ۱۹۷۰ء کے بعد ایک تحریک کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ عصرِ حاضر کے مرثیہ نگاروں کے فن میں آج بھی اس تحریک کے بہترین اثرات تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ (۱۴)

وحید الحسن ہاشمی ایک عرصے تک علم و ادب کی رزم گاہ کے شہسوار رہے ہیں اور اس میدان میں ان کے کارناموں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ تحقیقی حوالے سے علم و ادب کے فروغ کے لئے آپ نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں۔ مختلف رسائل کے آپ مدیر رہے۔ متعدد ادبی انجمنوں اور علمی حلقوں کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ آپ نے جن علمی و ادبی مجلسوں کی

---

(۱۳) محمد فخر الحق نوری، ڈاکٹر "سید وحید الحسن ہاشمی۔ ایک کثیر الجہات شخصیت" ماہنامہ "شام و سحر" لاہور، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۲۰

(۱۴) ہلال نقوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ، کراچی، محمدی ٹرسٹ، ۱۹۹۴ء، ص ۷۲۵

ادارت فرمائی ان میں ماہنامہ ''وطن'' لاہور (۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۲ء)۔ ماہنامہ ''پیامِ عمل'' لاہور (۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۷ء)۔ ماہنامہ ''تہذیب الاخلاق'' لاہور (۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء) ماہنامہ ''تنظیم الاسلام'' لاہور (۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۵ء) بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ حال ہی میں آپ نے ماہنامہ ''پیامِ عمل'' لاہور کے مدیر کی حیثیت سے اپنے فرائض دوبارہ سرانجام دینا شروع کیے ہیں۔
جن انجمنوں اور ادبی حلقوں کے آپ سیکرٹری رہ چکے ہیں' ان میں ایوانِ ادب لاہور' انجمن اُردو مصنفین لاہور' حلقہ مصنفین پاکستان' حلقہ شعرائے اہلِ بیت پاکستان' مجلس یادگار آزاد لاہور' مجلس یادگارِ انیس لاہور' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

وحید الحسن ہاشمی کی زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف میں گزرا ہے اور یہ سلسلہ اسی ذوق و شوق سے آج بھی جاری و ساری ہے۔ موصوف کی مطبوعہ تصنیفات و تالیفات درج ذیل ہیں۔

۱۔ الصراط	سلام و نوحہ	۱۹۴۸ء
۲۔ خون اور آنسو	سلام و نوحہ	۱۹۵۰ء
۳۔ بہتر (۷۲) پیاسے	سلام و نوحہ	۱۹۵۱ء
۴۔ اجرِ رسالتؐ	سلام و نوحہ	۱۹۵۲ء
۵۔ زبانِ مقتل	سلام و نوحہ	۱۹۵۶ء
۶۔ حیاتِ غم	سلام و نوحہ	۱۹۵۶ء
۷۔ تفسیرِ انقلاب	نظم	۱۹۵۸ء
۸۔ مباحث	ادبی مضامین (طلبہ کے لیے)	۱۹۶۰ء
۹۔ ''عظمت انسان'' اور جدید فن مرثیہ نگاری	آل رضا کے مرثیے...... ''عظمتِ انسان'' پر معروف ناقدین کے مقالات کا مجموعہ	۱۹۶۴ء
۱۰۔ سلامِ وفا	شعراء کے سلام	۱۹۶۹ء
۱۱۔ ناموسِ وفا	مرثیہ	۱۹۷۴ء

۱۲۔ خونِ تبسم	مرثیہ	۱۹۷۴ء
۱۳۔ شبِ عاشور	مرثیہ	۱۹۷۵ء
۱۴۔ خلقِ حسنؑ	مرثیہ	۱۹۷۶ء
۱۵۔ حسینؑ اور قربانی	مرثیہ	۱۹۷۷ء
۱۶۔ زندگی	مرثیہ	۱۹۷۸ء
۱۷۔ صبر	مرثیہ	۱۹۸۱ء
۱۸۔ سفیرِ آلِ محمدؐ	مرثیہ	۱۹۸۱ء
۱۹۔ ملیکۃ العرب	مرثیہ	۱۹۸۳ء
۲۰۔ چراغِ صحرا	مجموعۂ سلام	۱۹۸۵ء
۲۱۔ طاہرین	مجموعۂ منقبت	۱۹۸۸ء
۲۲۔ العطش (جلد اول)	مجموعۂ مراثی	۱۹۸۹ء
۲۳۔ شعراب	غزلیں	۱۹۹۳ء
۲۴۔ تنقیدی جہتیں	مضامین	۱۹۹۴ء
۲۵۔ العطش (جلد دوم)	مرثیے	۱۹۹۵ء
۲۶۔ معصومینؑ	منقبت	۱۹۹۶ء
۲۷۔ یاسینؑ	نعتیں	۱۹۹۶ء
۲۸۔ العطش (جلد سوم)	مرثیے	۱۹۹۶ء
۲۹۔ ہل من ناصر (جلد اول)	تنقید/مراثی	۲۰۰۰ء
۳۰۔ ہل من ناصر (جلد دوم)	تنقید/مراثی	۲۰۰۱ء
۳۱۔ اداریے	رسائل کے اداریے	۲۰۰۲ء
۳۲۔ آلِ رضا کے خطوط اور اصلاحیں	تحقیق	۲۰۰۴ء
۳۳۔ العطش	کلیاتِ مراثی	۲۰۰۴ء

(۲)

سید وحید الحسن ہاشمی نے یوں تو ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی (۱۵) لیکن ان کے جوہر مرثیہ میں کھل کر ہمارے سامنے آئے۔ ان کا کمال یہ نہیں کہ انہوں نے محض مرثیے تخلیق کر دیئے بلکہ ان کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے جدید مرثیے کی تحریک شروع کر کے بیسیوں مرثیہ نگار پیدا کیے۔ اب یہ بات بلا تردید کہی جا سکتی ہے کہ پنجاب میں اردو مرثیے کو زوال سے بچانے والوں میں وحید الحسن ہاشمی کا نام سرفہرست ہے (۱۶) اور وہ بقول ڈاکٹر عاصی کرنالی رثائی ادب کے عصری کارواں کی قیادت فرما رہے ہیں۔

سید وحید الحسن ہاشمی نے اڑتیس (۳۸) مرثیے تخلیق کیے اور یہ سلسلہ ہنوز اسی آب و تاب سے جاری ہے۔ ان کے مرثیوں کے تین بنیادی مجموعے (۱۷) ''العطش'' (جلد اول، جلد دوم اور جلد سوم) شائع ہو کر اربابِ دانش سے داد سمیٹ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے بیشتر مراثی علیحدہ علیحدہ کتابی شکل میں بھی طبع ہو چکے ہیں۔ (۱۸) اسی طرح مرثیوں کے مختلف

---

(۱۵) نواز حسن زیدی، ڈاکٹر ''وحید الحسن ہاشمی کی نثری جولانیاں''، ماہنامہ ''شام و سحر'' لاہور، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۲۱

(۱۶) عاصی کرنالی، ڈاکٹر ''ہل من ناصر (رائے)'' لاہور، مرثیہ نگاران پنجاب، ۲۰۰۲ء، ص ۹

(۱۷) (i) سید وحید الحسن ہاشمی، العطش (جلد اول)، لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

(ii) سید وحید الحسن ہاشمی، العطش (جلد دوم)، لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

(iii) سید وحید الحسن ہاشمی، العطش (جلد سوم)، لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

(۱۸) سید وحید الحسن ہاشمی کے علیحدہ کتابی شکل میں چھپنے والے مراثی درج ذیل ہیں:

(i) سید وحید الحسن ہاشمی، ناموسِ وفا، لاہور: آکسفورڈ پریس، ۱۹۷۴ء

(ii) سید وحید الحسن ہاشمی، خونِ تبسم، لاہور: مارچ ۱۹۷۴ء

(iii) سید وحید الحسن ہاشمی، شبِ عاشور، لاہور، نامی پریس، ۱۹۷۵ء

انتخاب میں بھی ان کے بعض مرثیے شائع ہو چکے ہیں۔(۱۹) ذیل میں سید وحید الحسن ہاشمی کے تمام مرثیوں کا اجمالی خاکہ پیش خدمت ہے۔ تاہم یہ بات قارئین کے پیش نظر رہے کہ اکتیسویں مرثیے سے لے کر اڑتیسویں مرثیے تک آٹھ مراثی ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔(۲۰)

پہلا مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ ناموسِ وفا

۲۔ سن تخلیق ۱۹۷۳ء

۳۔ کل بند ۴۵

۴۔ مطلع ع ماضی کا حال حال کے منظر میں دیکھیے

۵۔ موضوع حضرت زینبؑ کی سیرت کے نمایاں اوصاف اور کارنامے

(iv) سید وحید الحسن ہاشمی، 'خلق حسن' لاہور: ضیغم اسلام اکیڈمی، ۱۹۷۶ء

(v) سید وحید الحسن ہاشمی، 'حسین اور قربانی' لاہور: حلقۂ شعرائے اہلبیت، ۱۹۷۷ء

(vi) سید وحید الحسن ہاشمی، 'زندگی' لاہور: حلقۂ مصنفین پاکستان، ۱۹۷۸ء

(vii) سید وحید الحسن ہاشمی، 'صبر' لاہور: حلقہ اردو مصنفین پاکستان، ۱۹۷۹ء

(viii) سید وحید الحسن ہاشمی، 'سفیر آلِ محمدؐ' گوجرانوالہ : عباس اینڈ سنز، ۱۹۸۱ء

(ix) سید وحید الحسن ہاشمی، 'ملیکۃ العرب (حضرت خدیجۃ الکبریٰ)' لاہور: حلقۂ شعرائے اہلبیت پاکستان، ۱۹۸۲ء

(۱۹) سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیے درج ذیل انتخاب میں بھی شائع ہو چکے ہیں:

(i) سید وحید الحسن ہاشمی ''ہل من ناصر'' لاہور: مرثیہ نگاران پنجاب، ۲۰۰۰ء

(ii) آغا قمر حسنین (مرتب) ''لہو لہو کہکشاں'' کراچی: ادارہ تقدیس قلم، ۱۹۸۹ء

(iii) آغا قمر حسنین (مرتب) ''لہو لہو کہکشاں'' کراچی: ادارہ تقدیس قلم، ۱۹۹۰ء

(iv) آغا قمر حسنین (مرتب) ''لہو لہو کہکشاں'' کراچی: ادارہ تقدیس قلم، ۱۹۹۲ء

(۲۰) سید وحید الحسن ہاشمی کے تمام مرثیے ''العطش'' کی ایک جلد میں کلیات کی صورت میں زیر طبع ہیں۔ اس طرح ان کے تمام مرثیے یکجا ہو جائیں گے۔

دوسرا مرثیہ

۱۔	نام مرثیہ	خونِ تبسم
۲۔	سن تخلیق	۱۹۷۴ء
۳۔	کل بند	۴۶
۴۔	مطلع	ع عالم پہ ہے محیط محبت کی روشنی
۵۔	موضوع	حضرت علی اصغرؑ کی شہادت

تیسرا مرثیہ

۱۔	نام مرثیہ	شبِ عاشور
۲۔	سنِ تخلیق	۱۹۷۴ء
۳۔	کل بند	۴۰
۴۔	مطلع	ع انسان خالقِ دو جہاں کا کمال ہے
۵۔	موضوع	عاشور کی شب کی فضیلت اور اس کے اثرات

چوتھا مرثیہ

۱۔	نام مرثیہ	خلقِ حسنؑ
۲۔	سنِ تخلیق	۱۹۷۶ء
۳۔	کل بند	۴۲
۴۔	مطلع	ع اخلاق پر مدار شعورِ حیات ہے
۵۔	موضوع	حضرت امام حسنؑ کی سیرت کے نمایاں پہلو اور شہادت

پانچواں مرثیہ

۱۔	نام مرثیہ	حسینؑ اور قربانی
۲۔	سنِ تخلیق	۱۹۷۷ء

۳۔ کل بند ۵۰

۴۔ مطلع ع وہم وگماں کے دشت میں حیراں ہے آدمی

۵۔ موضوع عصرِ حاضر کے مسائل اور کربلا کے میدان میں حضرت ا[illegible]
حسینؑ کی قربانی

چھٹا مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ زندگی

۲۔ سنِ تخلیق ۱۹۷۸ء

۳۔ کل بند ۵۶

۴۔ مطلع ع وحدت جمالِ کل ہے تو مظہر ہے زندگی

۵۔ موضوع حضرت علی اکبرؑ کی سیرت کے گرانقدر پہلو اور شہادت

ساتواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ صبر

۲۔ سنِ تخلیق ۱۹۷۹ء

۳۔ کل بند ۵۶

۴۔ مطلع ع صبر کو لوگ مسیحائے جہاں کہتے ہیں

۵۔ موضوع صبر کی اہمیت وعظمت اور حضرت امام زین العابدینؑ [illegible]
مصائب وشہادت

آٹھواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ سفیرِ آلِ محمدؐ

۲۔ سنِ تخلیق ۱۹۸۰ء

۳۔ کل بند ۶۹

۴۔ مطلع — ع ذہن وطن کا آئینہ بردار ہے سفیر

۵۔ موضوع — سفیرِ آلِ محمدؐ حضرت مسلم بن عقیلؑ کی سفارت اور شہادت

نواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — ملیکۃ العرب

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۸۲ء

۳۔ کل بند — ۶۱

۴۔ مطلع — ع میزانِ روشنی میں زمانے کو تولیے

۵۔ موضوع — حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کی شخصیت اور کارنامے

مصائبِ حضرت زینبؑ

دسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — زنجیرِ سفر

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۸۷ء

۳۔ کل بند — ۵۶

۴۔ مطلع — ع تکمیلِ سفر کیجیے زنجیرِ سفر سے

۵۔ موضوع — حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی سیرت اور شہادت

گیارہواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — سرکارِ وفا

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۸۸ء

۳۔ کل بند — ۶۱

۴۔ مطلع — ع وفا ہے سلطنتِ حق نظام ہے عباسؑ

۵۔ موضوع — حضرت عباس علمبردار کی سیرت اور شہادت

بارہواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — اَنا اور خودداری

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۱ء

۳۔ کل بند — ۷۲

۴۔ مطلع — ع اس دور کا انسان گرفتارِ بلا ہے

۵۔ موضوع — عصر حاضر کی پریشان حالی اور مصائب زندانِ شام

تیرہواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — معرفتِ ذات

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۴ء

۳۔ کل بند — ۵۷

۴۔ مطلع — ع تلاشِ ذات میں سرگرم و سرگراں ہے بشر

۵۔ موضوع — ذات کی اہمیت، ضرورت اور افادیت، شامِ غریباں میں حضرت زینب کے بین

چودہواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — اُسوۂ بتول سلام اللہ علیہا

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۸۹ء

۳۔ کل بند — ۶۴

۴۔ مطلع — ع جی چاہتا ہے مدحِ پیمبرؐ کی بات ہو

۵۔ موضوع — حضرت فاطمہؑ کی سیرت کے محاسن اور مصائب حیات

پندرھواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — آرزوئے علی
۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۰ء
۳۔ کل بند — ۶۶
۴۔ مطلع — ع آرزوئے اسد اللہ رقم کرتا ہوں
۵۔ موضوع — حضرت بی بی اُم البنینؑ کے فضائل و مصائب

سولھواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — پردہ
۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۰ء
۳۔ کل بند — ۶۵
۴۔ مطلع — ع تزئین کائنات کے منظر عجیب ہیں
۵۔ موضوع — حجاب کی اہمیت اور وفات حضرت سکینہؑ

سترھواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — بچپن
۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۲ء
۳۔ کل بند — ۵۰
۴۔ مطلع — ع زیست کی منزلِ اول کا سفر ہے بچپن
۵۔ موضوع — بچپن کی اہمیت، شہادت حضرت علی اصغرؑ

اٹھارھواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — شباب
۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۳ء

۳۔ کل بند ۶۱

۴۔ مطلع ع شباب حسن کی رنگینیوں کا محور ہے

۵۔ موضوع جوانی کی اہمیت' شہادتِ حضرت علی اکبرؑ

انیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ پیری

۲۔ سنِ تخلیق ۱۹۹۴ء

۳۔ کل بند ۶۰

۴۔ مطلع ع خالق کی ثنا محورِ عقلِ بشری ہے

۵۔ موضوع بڑھاپے کی عظمت۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی حضرت علی اکبرؑ کی میت پر آمد

بیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ شخص اور شخصیت

۲۔ سنِ تخلیق ۱۹۹۴ء

۳۔ کل بند ۶۴

۴۔ مطلع ع شخصیت تکملۂ جذبۂ انسانی ہے

۵۔ موضوع شخصیت کی تشکیل و تکمیل کے مراحل' شہادت حضرت حرؒ

اکیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ آقائے ابوالقاسم خوئی

۲۔ سنِ تخلیق ۱۹۹۲ء

۳۔ کل بند ۴۸

۴۔ مطلع ع انسان کائنات کے خالق کا نور ہے

۵۔ موضوع — تذکرۂ آقائے خوئی۔ حضرت امام حسینؑ کی آخری رخصت

بائیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — جوہر وراثت

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۲ء

۳۔ کل بند — ۶۱

۴۔ مطلع — ع عمل حدیقۂ انسانیت کی خوشبو ہے

۵۔ موضوع — تذکرۂ علامہ مصطفیٰ جوہر۔ جناب سکینہؑ کے مصائب

تیئسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — ادب اور ادیب

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۵ء

۳۔ کل بند — ۵۵

۴۔ مطلع — ع شامل حلقۂ ارباب تمنا ہے ادیب

۵۔ موضوع — ادب اور ادیب کی معاشرتی وقعت اور تذکرۂ دربار شام

چوبیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — احتساب

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۷ء

۳۔ کل بند — ۶۰

۴۔ مطلع — ع دل حیات کا شفاف آئینہ ہے عمل

۵۔ موضوع — عمل کی اہمیت اور افادیت۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی آخری رخصت

پچیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — قوم و قومیت

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۶ء

۳۔ کل بند — ۶۲

۴۔ مطلع — ع تعارفِ شرف ذات عین فطرت ہے

۵۔ موضوع — قوم و قومیت کی تشکیل اور افادیت۔ امام حسینؑ کی آخری رخصت

چھبیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — کربلا کربلا

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۵ء

۳۔ کل بند — ۵۲

۴۔ مطلع — ع دل کا آئینہ مکدر ہے جگر زخمی ہے

۵۔ موضوع — عصرِ حاضر کی صورتِ حال۔ شہادتِ جنابِ علی اصغرؑ

ستائیواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — کشمکش

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۵ء

۳۔ کل بند — ۵۸

۴۔ مطلع — ع کشمکش ذہن کی اُلجھی ہوئی قوت کا ہے نام

۵۔ موضوع — انسانی ذہن اور کشمکش کی صورتیں ...... حضرت زینبؑ کے مصائب

اٹھائیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — قیادت

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۷ء

۳۔ کل بند — ۶۴

۴۔ مطلع — ع جس طرف دیکھیے دنیا میں عجب ہلچل ہے

۵۔ موضوع — قیادت کی ضرورت وافادیت۔ حضرت امام زین العابدینؑ کا سفر

انتیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — حقیقتِ موت

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۶ء

۳۔ کل بند — ۵۸

۴۔ مطلع — ع موت کو ظلم وستم کی داستاں کہتے ہیں لوگ

۵۔ موضوع — موت کی حقیقت۔ بی بی سکینہؑ کے مصائب

تیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — جوہرِ تقویٰ

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۴ء

۳۔ کل بند — ۶۰

۴۔ مطلع — ع آثار حرف کن کی کہانی عجیب ہے

۵۔ موضوع — مولانا مصطفیٰ جوہر کی خدمات۔ حضرت امام حسینؑ کے مصائب

اکتیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — آئین

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۹ء

۳۔ کل بند — ۵۰

۴۔ مطلع — ع وقت کے ماتھے پہ صحرائے الم کی دھول ہے

۵۔ موضوع — دنیا کے آئین (رخصتِ امام حسینؑ)

بتیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — احساس

۲۔ سنِ تخلیق — ۱۹۹۹ء

۳۔ کل بند — ۵۷

۴۔ مطلع — ع احساس ہر حیات بشر کی اساس ہے

۵۔ موضوع — حضرت عباسؑ کا احساس اور شہادت

تینتیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — زمانہ

۲۔ سنِ تخلیق — ۲۰۰۰ء

۳۔ کل بند — ۵۶

۴۔ مطلع — ع نمودِ کُن کی عطا ہے سفر زمانے کا

۵۔ موضوع — زمانے کی تخلیق (رخصت امام حسینؑ)

چونتیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ — احتجاج

۲۔ سنِ تخلیق — ۲۰۰۰ء

۳۔ کل بند ۵۲

۴۔ مطلع ع متاعِ ذہنِ بشر ہے وجودِ کلک قلم

۵۔ موضوع احتجاج کی کیفیت (امام حسینؑ کا احتجاج) جناب سکینہ کی زندان شام میں وفات

پینتیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ اعتماد

۲۔ سنِ تخلیق ۲۰۰۱ء

۳۔ کل بند ۶۰

۴۔ مطلع ع شرحِ صدائے کن ہے صدا اعتماد کی

۵۔ موضوع اعتماد کے اثرات (حضرت امام حسینؑ کا اعتماد) جناب عونؑ و محمدؑ کی شہادت

چھتیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ ارتقاء

۲۔ سنِ تخلیق ۲۰۰۱ء

۳۔ کل بند ۵۰

۴۔ مطلع ع ہر لمحۂ حیات پریشان ہے ان دنوں

۵۔ موضوع ارتقا کی تعریف (جناب سکینہ کا امام حسینؑ کی لاش پر جانا اور بین کرنا

سینتیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ ماحول

۲۔ سن تخلیق ۲۰۰۳ء

۳۔ کل بند ۵۶

۴۔ مطلع ع ماحول کا اثر جسدِ بحر و بر پہ ہے

۵۔ موضوع امام حسینؑ اور یزید کے ماحول کا تذکرہ (شامِ غریباں کے حالات)

اڑتیسواں مرثیہ

۱۔ نام مرثیہ جلوۂ سخن

۲۔ سنِ تخلیق ۲۰۰۳ء

۳۔ کل بند ۵۷

۴۔ مطلع ع وجودِ حق جو نہ ہوتا تو ہم کہاں ہوتے

۵۔ موضوع خدا کا ثبوت اور اس کا کرم (جناب سکینہ زندانِ شام میں)

سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کی درج بالا پیش کردہ فہرست سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہیں صنفِ مرثیہ سے بے پناہ لگاؤ ہے اور انہوں نے اس صنف کی آبیاری میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں۔ ذیل میں سید وحید الحسن ہاشمی کے اڑتیس مرثیوں کے بارے میں چند معروضات پیش خدمت ہیں:

۱۔ ناموسِ وفا

''ناموسِ وفا'' ایک مختصر مرثیہ ۱۹۷۳ء میں تخلیق ہو کر ۱۹۷۴ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ مذکورہ مرثیے کے بندوں کی کل تعداد چالیس تھی، لیکن بعد میں پانچ بندوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتاب ہذا میں ''ناموسِ وفا میری نظر میں'' کے عنوان سے وحید الحسن ہاشمی کا رقم کردہ دیباچہ بھی موجود ہے، جس میں فاضل مصنف نے اس کی ''وجۂ تصنیف، مقصدِ تصنیف اور چند گزارشات'' کے عنوان سے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ جدید مرثیہ کے حوالے سے مذکورہ دیباچہ قابلِ توجہ ہے اور اڑتالیس صفحات پر مشتمل کتاب ہذا کے ملنے کا پتہ ''۲۵۳۔ ایف، رحمٰن پورہ، اچھرہ لاہور'' درج کیا گیا ہے۔

''ناموسِ وفا'' نامی مرثیہ حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی ذات سے منسوب ہے۔ تمہید میں شاعر نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ہر شے فنا ہو جانے والی ہے لیکن وفا اور اہلِ وفا کو کبھی زوال نہیں آ سکتا۔ شاعر کے خیال میں اس دنیا کی تمام رونق اور معاشرے کے تمدن و تہذیب کا فروغ وفا کی وجہ سے ممکن ہے۔ شاعر نے وفا کی مختلف کیفیات اور کارناموں کے بیان کرنے کے بعد اپنے اصل موضوع سے رجوع کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وفا بجائے خود در اصل خدا' نبیؐ اور امامؑ کے جینے کی مظہر ہے۔ اس بنا پر ہر وہ ذات جس نے وفا سے اپنا رشتہ جوڑا ہے' شاعر کے نزدیک قابلِ قدر اور واجب التعظیم ہے۔ اس حوالے سے شاعر نے حضرت زینبؑ کو وفا کی بولتی تصویر قرار دیا ہے۔ معصومہ ثانی کی سیرت و کردار کے مختلف محاسن پیش کرنے کے بعد ثانی زہراؑ کے مصائب کا تذکرہ بڑے دل گداز اور حسرت ناک انداز میں کیا ہے۔ اس مرثیے میں وحید الحسن ہاشمی نے خاص طور پر حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے ایسے فکری کارنامے بیان کئے ہیں' جن کی طرف شعراء کی توجہ کم رہی ہے۔ شہادتِ حسین علیہ السلام کے بعد مقاصدِ شہادتِ حسینؑ کے اساسی پہلوؤں کی تشہیر جس طرح حضرت زینبؑ نے کی تھی' شاعر نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس مرثیے میں بین کے متوازی ایک فکری و شعوری رو بھی دوڑتی دکھائی دیتی ہے۔ مجموعی طور پر اس مختصر سے مرثیے میں شاعر نے فنی پہلوؤں سے زائد فکری پہلوؤں کی طرف توجہ دی ہے اور یہی اس جدید مرثیے کی کامیابی کی دلیل ہے۔

اس مرثیے کے حوالے سے ڈاکٹر میمونہ انصاری رقم طراز ہیں:

> ''......اس عظیم شخصیت پر ایسا ستھرا مرثیہ لکھنا جناب سید وحید الحسن ہاشمی جیسے فنِ مرثیہ کے رمز شناس ہی کا کام تھا۔ کیا زبان ہے کیا مضمون!! کچھ کہنا چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے''۔ (۲۱)

---

(۲۱) میمونہ انصاری' ڈاکٹر (رائے) ''العطش (جلد اول)'' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز' ۱۹۸۹ء' ص ۴۸

۲۔ خونِ تبسم

''خونِ تبسم'' بھی ایک مختصر مرثیہ ہے جو ۱۹۷۴ء میں کہا گیا اور اسی سال طبع ہوا۔ ''عرضِ مصنف'' کے عنوان سے وحید الحسن ہاشمی نے اپنے قارئین سے بھی اس مرثیے کے بارے میں مختصراً چند گزارشات کی ہیں' جو مصنف کے نقاطِ نظر کی توضیح وتشریح کے ضمن میں نہایت اہم ہیں۔

یہ مرثیہ کل چھیالیس بندوں اور اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب ہذا پر اشاعت کے سلسلے کی معلومات (ضابطہ) درج نہیں نیز اس کے آخر میں مصنف کی دیگر تصانیف کی ایک فہرست دی گئی ہے۔

''خونِ تبسم'' شہادتِ حضرت علی اصغرؑ کے حال میں کہا گیا مرثیہ ہے۔ اس میں شاعر نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ محبت کی روشنی سارے عالم پر محیط ہے اور ہر شے میں اس کی جلوہ گری دیکھی جا سکتی ہے۔ محبت کی ارفع شکل اللہ تعالیٰ سے قلبی تعلق کا قائم ہونا ہے۔ شاعر نے اپنے اصل مقصد کی طرف گریز کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے تاہم اس نے اپنے خاص بندوں سے محبت کرنے کا حکم دے کر اپنی محبت کا ایک وسیلہ فراہم کر دیا ہے۔ شاعر کے خیال میں یہ خاص بندے حضرت محمدؐ اور آلِ محمدؐ ہیں۔ یہی وہ پاکیزہ نفوس ہیں' جو اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے تحفظ کے لئے ہمہ وقت قربانی دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس کے بعد شاعر نے کربلا کے میدان میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی طرف سے ننھی سی جان کی سب سے بڑی قربانی کو موضوع بنایا ہے۔ میدانِ کربلا میں امام حسینؑ کا حضرت علی اصغرؑ کو لے کر جانا اور وہاں ظہور میں آنے والے واقعات کو شاعر نے جدید شعری علامات واشارات کی صورت میں جس طرح پیش کیا ہے' وہ قابلِ صد ہزار تحسین ہے۔ پورے مرثیے میں ایک فکری ربط اور تسلسل ملتا ہے جو اس مرثیے کی کامیابی کی بین دلیل ہے۔

اس مرثیے کے بارے میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا رقم طراز ہیں:

''...... جدید مرثیے میں جدت و انفرادیت کے ایسے ایسے نمونے مل جاتے ہیں جو عجب نہیں کہ اس فن کے قدیم اساتذہ کے لیے بھی باعث رشک ہوں۔ جدید مرثیے میں جناب وحید الحسن ہاشمی کا نام بعض دوسرے مرثیہ نگاروں سمیت عزت و احترام کا مستحق ہے۔ جناب ہاشمی کے مرثیوں میں کلاسیکی مرثیے کی پختگی کے ساتھ ساتھ جدت فن بھی موجود ہے۔ ان کا مختصر مرثیہ ''خونِ تبسم'' جناب علی اصغرؑ شہید کربلا کی شہادت پر لکھا گیا ہے۔ اس مرثیے میں وہی خلوص، کلاسیکی پختگی، روانی اور سلاست جلوہ گر ہے جو جدید مرثیے کی مقبولیت کا سبب بن چکی ہے''۔ (۲۲)

Prof. SHARIB RUDAULVI
COLLECTION

۳۔ شبِ عاشور

''شبِ عاشور'' مختصر مرثیہ ہے جو ۱۹۷۴ء میں تخلیق ہوا اور ۱۹۷۵ء میں طبع ہوا۔ ''اپنی زبان میں'' کے عنوان سے وحید الحسن ہاشمی نے دیباچے میں مختصر مرثیے کے فن کے بارے میں شواہد کے ساتھ چند تاریخی باتیں بیان کی ہیں اور زیرِ نظر مرثیے کے بارے میں بعض اہم نکات پیش کیے ہیں۔ یہ مرثیہ چالیس بندوں پر مشتمل ہے۔ نامی پریس لاہور سے مذکورہ مرثیہ پانچ سو کی تعداد میں شائع ہوا۔ کتاب کے آخر میں مصنف کی دیگر تصانیف کی ایک فہرست بھی فراہم کی گئی ہے۔

''شبِ عاشور'' اُردو مرثیے کی تاریخ میں غالباً عاشور کی شب کے موضوع پر لکھا جانے والا بہترین مرثیہ ہے۔ اس سے قبل شبِ عاشور کی فضیلت اور عظمت پر جدید مرثیہ نگاروں نے جستہ جستہ اشارے ضرور کیے ہیں، تاہم اس موضوع پر مبسوط اور مکمل مرثیہ راقم الحروف کی نظر سے اب تک نہیں گزرا۔ اس کے آغاز میں شاعر نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ انسان کائنات میں خالقِ دو جہاں کا کمال اور احسنِ تقویم ہے، لہٰذا تخلیقِ کائنات کے لئے وہی موجبِ افتخار ہے۔ شاعر نے ابتداً انسان کی فضیلت اور برتری آشکار کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ

---

(۲۲) محمد زکریا خواجہ ڈاکٹر (رائے) ''دم العطش (جلد اول)'' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۶۲

کیا ہے کہ اعلیٰ تر اقتدار کا حامل وہی شخص ہو سکتا ہے' جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات کی عمر بھر بجا آوری کرتا رہے اور ذاتی مفادات کو احکاماتِ الٰہی کے سامنے پسِ پشت ڈال دے۔ اس حوالے سے شاعر نے خدا اور رسولؐ کے دین کو بچانے' اللہ کی حاکمیت اعلیٰ قائم کرنے اور انسان پر انسان کی حاکمیت کو رد کرنے کی خاطر صحرا میں جان دینے والے حضرت امام حسین علیہ السلام کو بطورِ نمونہ پیش کیا ہے۔ آخر میں شاعر نے شبِ عاشور کی فضیلت' اہمیت اور اثرات کے حوالے سے بعض اہم نکات پیش کئے ہیں شاعر کے نزدیک شبِ عاشور دراصل التفاتِ خداوندی کی امین ہے۔ حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفقائے کار نے یہ رات محض عبادتِ خداوندی ہی میں بسر نہیں کی بلکہ عبودیت کی سنہری تاریخ بھی رقم کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ شاعر نے اس رات کو شبِ قدر کی آبرو قرار دیا ہے۔ آخر میں شاعر نے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی زبان سے المناک کلمات ادا کئے ہیں۔ اس مرثیے کی آخری بیت میں شاعر نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی ہے۔

ٹوٹے دلوں کو آس کا مرہم نہ دے سکی
یہ رات چند پھولوں کو شبنم نہ دے سکی

سید وحید الحسن ہاشمی کے اس مرثیے کی ناقدین نے بے حد مدح سرائی کی ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے اسے قابلِ توجہ مرثیہ قرار دیا ہے۔ (۲۳) اس مرثیے کے حوالے سے ڈاکٹر سرفراز حسین قاضی رقمطراز ہیں:

> ''......شب عاشور ایک منفرد مرثیہ ہے۔ جہاں ایک طرف دل کی گہرائیوں میں محبتوں کے چراغ روشن کرتا ہے تو دوسری طرف شعور کو ایسی روشنی عطا کرتا ہے کہ قاری جذبات سے نکل کر حقیقتوں کی دنیا میں آ جاتا ہے۔'' (۲۴)

---

(۲۳) ضمیر اختر نقوی' اردو مرثیہ پاکستان میں' کراچی: سید اینڈ سید' ۱۹۸۲ء' ص ۴۷۶

(۲۴) سرفراز حسین قاضی' ڈاکٹر (رائے) ''العطش (جلد اول)'' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز' ۱۹۸۹ء' ص ۷۵

۴۔ خُلقِ حسنؑ

"خلقِ حسنؑ" نامی مرثیہ ۱۹۷۶ء میں ضیغم اسلام اکیڈمی کمن آباد لاہور کی جانب سے "تصویرِ حسنؑ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر عسکری بن احمد نے اس کتاب میں ذکرِ حسنؑ کے نام سے علامہ ضیغم اسلام کا ایک مضمون اور شبیہِ خُلقِ عظیم کے عنوان سے اپنے معروضات بھی شامل کیے ہیں۔ چونسٹھ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مرثیے کے بندوں کی کل تعداد بیالیس ہے۔ بعد میں یہی مرثیہ مزید چار بندوں کے اضافے کے ساتھ پیش کیا گیا۔

"خلق حسنؑ" میں شاعر نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے حضرت امام حسن علیہ السلام کی سیرت و کردار کو موضوع بنایا ہے۔ خاص طور پر شاعر نے حضرت امام حسنؑ کے اخلاقِ حسنہ کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ مرثیے کے آغاز میں شاعر نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اخلاق کیحدود میں تمام کائنات سما جاتی ہے۔ اس کے بعد شاعر نے اخلاق کو مختلف جہتوں اور پرتوں کو آشکار کرتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی آلؑ کو خلقِ عظیم قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے خاص طور پر حضرت امام حسنؑ کو حضور اکرمؐ کے اخلاقِ عظیم کا ایک پرتو قرار دیا ہے اس کے بعد شاعر نے حضرت امام حسن علیہ السلام کی سیرت اور کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ان کے جملہ محاسن جدید شعری تلازمات کے ساتھ پیش کر دیئے ہیں۔ خاص طور پر شاعر نے حضرت امام حسنؑ کی صلح کو تتمۂ صلحِ رسولؐ قرار دیا ہے۔ اس مرثیے میں شاعر نے حضرت امام حسنؑ کے طرزِ عمل کے حوالے سے بعض اعتراضات کا بھی جائزہ لیا ہے تاہم اس مرثیے کی خوبی یہ ہے کہ معترض کے اعتراضات بڑی نفاست اور شائستگی سے عقلی استدلال کی سطح پر رد کئے گئے ہیں۔ اس مرثیے سے مجموعی طور پر شاعر کی فکری و فنی پختگی جھلکتی ہے۔

اس مرثیے کے حوالے سے سید سجاد رضوی رقم طراز ہیں:

"......حضرت امام حسن علیہ السلام کی شخصیت، سیرت، کردار، فضائل، عمل اور

مظلومی کے بارے میں اردو میں کچھ زیادہ نہیں لکھا گیا اور اردو مرثیے میں تقریباً میدان خالی ہے...... اس اعتبار سے وحید الحسن ہاشمی نے ایک اچھی روایت کا آغاز کیا ہے کہ انہوں نے پورا مرثیہ حضرت امام حسنؑ کے بارے میں قلمبند فرمایا ہے اور ''مختصر مرثیہ'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں حضرت امام حسنؑ کے خلق اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا نہایت مناسب طریقے سے تعارف کروایا گیا ہے۔'' (۲۵)

۵۔ حسینؑ اور قربانی

''حسینؑ اور قربانی'' کے عنوان سے جو مختصر مرثیہ اس وقت پیشِ نظر ہے اسے حلقۂ شعرائے اہلِ بیتؑ پاکستان کے تعاون سے ۱۹۷۷ء میں طبع کرایا گیا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ پروفیسر محمد اشرف نے تحریر کیا ہے، جس میں انہوں نے وحید الحسن ہاشمی کے فکروفن پر روشنی ڈالی ہے۔ نامی پریس لاہور سے شائع شدہ اس کتاب کے کل صفحات چھپن ہیں جب کہ مرثیہ ہذا پچاس بندوں پر مشتمل ہے۔

''حسین اور قربانی'' نامی مرثیے میں شاعر نے عصرِ حاضر کے بعض اہم اور قابلِ توجہ مسائل پیش کئے ہیں۔ شاعر کا خیال ہے کہ موجودہ زمانے کا ''آدمی'' مختلف اسباب کی بناء پر وہم وگماں کے دشت میں حیران وپریشان کھڑا ہے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس میں منافقت در آئی ہے اور اب وہ دین کا رہا ہے، نہ دنیا کا۔ اس کے مدمقابل شاعر نے کچھ ایسے نفوس کا بھی تذکرہ کیا ہے، جو خدا کے حقیقی شیدائی اور پرستار ہیں اور اس کے دین کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے ہمہ وقت تیار بیٹھے ہیں۔ شاعر کے نزدیک اہلِ بیتِ رسولؐ ہی وہ نفوسِ قدسیہ ہیں، جو اصل میں قربانیوں کا حُسن مجسم ہیں۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ اگرچہ دینِ حق کی خاطر قربانیاں دینے والوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے تاہم جس طرح حضرت امام حسین علیہ السلام نے کربلا کے میدان میں بے سروسامانی کے عالم میں اپنی قربانیوں کے

---

(۲۵) سید سجاد رضوی (رائے) ''العطش (جلد اول)'' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۹۰

نذرانے پیش کیے ہیں' اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ مرثیے کے آخر میں شاعر نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی عدیم المثال قربانی یعنی شہادتِ علی اصغرؑ کو موضوع بنایا ہے۔ حضرت امام حسینؑ کا دینِ حق کی خاطر پیش کیا جانے والا معصوم اور شیر خوار بچے کا یہ نذرانہ آج بھی اہلِ درد کی آنکھوں کو پرنم کرنے کا موجب بنتا ہے۔ خاص طور پر مرثیے کے آخری پندرہ بند اپنے اندر درد و الم کی ایک ایسی دنیا لئے ہوئے ہیں کہ ان کے مطالعے کے بعد بڑے سے بڑا سنگدل انسان بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شاعر نے اسی مرثیے میں انسانی سائیکی کو ملحوظ رکھ کر بڑے سلیقے سے کام لے کر حزنیہ ماحول پیدا کیا ہے۔ مجموعی طور پر اس مرثیے کو ہم ''آشوبِ عصر'' بھی قرار دے سکتے ہیں۔

اس مرثیے کے حوالے سے پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرنالی رقمطراز ہیں:

''...... حسین اور قربانی ایک ایسی عظیم الشان رثائی تخلیق ہے جو ہر عہد کی طرح عہدِ گزراں کے آدمی کے سامنے مشعلِ ہدایت روشن کرتی ہے اور اس کے فکر و عمل کا قبلہ درست کرتی ہے۔ میں اسے سید وحید الحسن ہاشمی کا ''منظوم منشورِ حیات'' قرار دیتا ہوں۔'' (۲۶)

۶۔ زندگی

''زندگی'' کے عنوان سے یہ مختصر مرثیہ ۱۹۷۸ء میں حلقۂ مصنفین پاکستان لاہور نے حلقۂ شعرائے اہلِ بیتؑ کے تعاون سے شائع کیا۔ اس مرثیے کے آغاز میں وحید الحسن ہاشمی نے جدید مرثیے کے لوازمات اور تقاضوں کے حوالے سے چند نکات پیش کیے ہیں' جو اپنے طور پر بعض فکری مباحث قائم کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ یہ مرثیہ چھپن بندوں پر مشتمل ہے۔ نامی پریس لاہور سے شائع شدہ مرثیہ پانچ سو کی تعداد میں شائع ہوا اور اس پر ملنے کا پتہ امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ انارکلی لاہور درج ہے۔

---

(۲۶) عاصی کرنالی' ڈاکٹر (رائے) ''العطش (جلد اول)'' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز' ۱۹۸۹ء' ص ۱۲۰

''زندگی'' نامی مرثیہ حضرت امام حسینؑ کے لختِ جگر، شبیہِ پیغمبرؐ حضرت علی اکبرؑ کی سیرت و کردار کے حوالے سے تخلیق ہوا۔ اس مرثیے میں شاعر نے ابتدا ً زندگی کے مختلف رنگ روپ پیش کئے۔ شاعر کا مؤقف ہے کہ زندگی جمالِ کل کا مظہر ہے۔ شاعر نے زندگی کے آغاز و ارتقاء کو مختلف تشبیہات، استعارات اور تلمیحات سے اُجاگر کیا ہے۔ شاعر نے مختلف انبیاءِ کرامؑ کی متنوع شخصیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نہایت خوبصورت طریقے سے زندگی کے سفر کو پیش کیا ہے۔ شاعر نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حضرت آدمؑ سے شروع ہونے والی زندگی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیکر میں نقطہ کمال کو پہنچی۔ حضورؐ کی رحلت کے بعد آمریت اور استعمار کے شیش ناگ اس زندگی کو ڈسنے کے لئے میدان میں نکل آئے۔ اس صورتِ حال میں زندگی کو بے یار و مددگار دیکھ کر حضرت امام حسین علیہ السلام محافظِ حیات کے رُوپ میں سامنے آئے، بقول شاعر۔

مغلوب پا کے حوصلۂ مشرقین کو
اب زندگی پکار رہی تھی حسینؑ کو

حضرت امام حسین علیہ السلام نے زندگی کی اس پکار پر لبیک کہا اور اپنے جوان بیٹے حضرت علی اکبرؑ کی سمت دیکھ کر کہا کہ ع

''سائل کو آج اپنی جوانی عطا کرو''

اس کے بعد شاعر نے حضرت علی اکبرؑ کی شخصیت اور کردار کے مختلف محاسن بیان کئے ہیں۔ مرثیے کے آخر میں شاعر نے واقعہ شہادتِ علی اکبرؑ کو نہایت دل گداز انداز میں پیش کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک وقیع مرثیہ ہے۔ اس کا سب سے نمایاں وصف اس کا اسلوب ہے، جس میں روانی اور تسلسل ہے۔ شاعر نے پورے مرثیے میں ایک فکری تسلسل قائم رکھنے کی جو شعوری کوشش کی ہے، وہی اس کا حُسن ہے۔ یہی سبب ہے کہ پورے مرثیے میں پہلے بند سے لے کر آخری بند تک فکر و فن کی دلکش ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔

اس مرثیے کے حوالے سے ڈاکٹر خیال امروہوی رقم طراز ہیں:

"......وحیدالحسن ہاشمی صاحب کا مرثیہ اس اعتبار سے واقعاً لائقِ مطالعہ ہے
کہ اس میں روایت کے ساتھ جذب و وجدان کو دخل ہے۔ زبان کی سلاست
اور روانی، قافیوں کی برجستگی اور واقعۂ کربلا میں حضرت علی اکبرؑ جیسے عظیم
جواں مرد کی کردار نگاری میں موصوف نے فکری اور لسانی خوب خوب جوہر
دکھائے ہیں اس مرثیے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نیا پن پایا جاتا
ہے۔" (۲۷)

۷۔ صبر

"صبر" نامی مرثیہ ۱۹۷۹ء میں کہا گیا اور حلقۂ اُردو مصنفین پاکستان لاہور نے حلقۂ شعرائے اہل بیت کے تعاون سے ۱۹۸۱ء میں لاہور سے پانچ سو کی تعداد میں شائع کیا۔ چونسٹھ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی ابتداء میں "مرثیہ اور روایت" کے عنوان سے مصنف وحیدالحسن ہاشمی نے ایک مبسوط دیباچہ تحریر کیا ہے، جس میں عصرِ حاضر اور جدید مرثیے کی ضرورت اور تقاضے کے موضوع پر بعض اہم نکات پیش کیے گئے ہیں۔ اس مرثیے کے بندوں کی کل تعداد چھپن ہے۔

"صبر" نامی مرثیے میں شاعر نے صبر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ شاعر نے ابتداء میں یہ نظریہ وضع کیا ہے کہ صبر مسیحائے جہاں ہے، لہٰذا اسے گردشِ دوراں کا کوئی خوف یا ڈر نہیں ہوتا۔ شاعر نے صبر کو اوصاف انبیاؑ سے منسلک قرار دیا ہے۔ شاعر کے نزدیک صبر بے شمار لذتیں رکھتا ہے، تاہم کم ظرف اصحاب صبر کی دولت سے تہی اور اس کی اہمیت سے عمر بھر ناآشنا بنتے ہیں۔ اس کے بعد شاعر نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ انبیاء کرامؑ نے اپنی زندگی کے کٹھن لمحات صبر کی بدولت کاٹے ہیں۔ شاعر کے خیال میں صبر کی اصل اور کامل منزل دامنِ ختم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ حضورؐ کے زمانے ہی سے "شر" نے صبر و خیر کے نظام کو تہہ و بالا

---

(۲۷) خیال امروہوی، ڈاکٹر (رائے) "العطش (جلد اول)" لاہور: الجیب پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء،
ص ۱۲۰

کرنے کی سازشیں شروع کر دی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت علیؑ نے ایک صابر کی حیثیت سے جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں' شاعر نے بڑی مہارت سے انہیں مرثیے کا حصہ بنایا ہے۔ آخر میں شاعر نے میدانِ کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے صبر کی قوت کے مختلف کارنامے پیش کئے ہیں۔ اس کے بعد صبر کے ایک اہم نمائندے کے طور پر شاعر نے سید سجاد حضرت امام زین العابدینؑ کے مصائب پیش کئے ہیں۔ مجموعی طور پر اس مرثیے میں شاعر نے موضوع کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ پورے مرثیے میں فکری ربط اور تسلسل دکھائی دیتا ہے۔

اس مرثیے کے حوالے سے پروفیسر عتیق احمد رقمطراز ہیں:

''...... جناب وحید الحسن ہاشمی بھی اس صف کے مرثیہ گو ہیں اور ان کی مرثیہ گوئی کا وصف بھاری بھرکم اور گونج دار الفاظ سے کڑک پیدا کرنے میں نہیں بلکہ سہل اور روزمرہ کی لکھت پڑھت کے الفاظ ہی کو برتنا ہے یہ ذرا مشکل فن ہے۔ اس لیے جب الفاظ نہ گونج رہے ہوں تو جذبے کی گونج قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ ہاشمی صاحب کے یہاں فن کا کمال یہی ہے کہ وہ کاغذ پر اپنے اسی سچے جذبے کی تپش میں اپنے قاری کے دل ودماغ کو گرماتے چلے جاتے ہیں۔'' (۲۸)

۸۔ سفیر آلِ محمدؐ

''سفیر آلِ محمدؐ'' نامی مرثیہ ۱۹۸۰ء میں مکمل ہوا اور ۱۹۸۱ء میں سید مظہر عباس نے اپنے برادرِ خرد سید ناصر عباس مرحوم کے چہلم کے موقع پر شائع کرایا۔ ابتدائی صفحات میں ناصر عباس مرحوم کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ مرثیہ انہتر بندوں پر مشتمل ہے۔ مرثیے سے قبل وحید الحسن ہاشمی کا ایک قطعہ ''بروفات سید ناصر عباس مرحوم'' بھی شامل کیا گیا ہے۔ چالیس صفحات پر مشتمل اس کتاب پر ایس۔ ایم۔ عباس اینڈ سنز نوشہرہ ورکاں ضلع

---

(۲۸) عتیق احمد' پروفیسر (رائے) ''العطش (جلد اول)'' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز' ۱۹۸۹ء' ص ۱۴۸

گوجرانوالہ کا پتہ درج ہے۔

''سفیر آلِ محمدؐ'' نامی مرثیے میں شاعر نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے سفیر حضرت مسلم بن عقیلؑ کے فضائل و مصائب بیان کیے ہیں۔ ابتداء میں شاعر نے سفیر کو ذہن وطن کا آئینہ بردار قرار دیا ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ سفارت کا منصب کوئی معمولی حیثیت نہیں رکھتا ہے بلکہ یہ منصب جلیل ایک نعمتِ خدا ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ خالقِ کائنات نے اس دنیا میں اپنے بے شمار سفیر بھیجے جنہوں نے اپنے کردار اور اعمال سے قلبِ انسانی کو خیر کی جانب موڑنے کی کوشش کی۔ سفیر آتے رہے اور حق کا یہ سفر جاری رہا' یہاں تک کہ عہدۂ سفارت حضرت عمرانؑ کے سپرد ہوا۔ آپ نے اس منصبِ جلیل کو وقار عطا کیا۔ انہوں نے ہر اس رویے اور طرزِ عمل کی بیخ کنی کی جو دین اسلام کے لئے مضر ثابت ہو سکتا تھا۔ شاعر نے گریز کرتے ہوئے حضرت مسلم بن عقیلؑ کو حضرت عمرانؑ کا نمائندہ خاص قرار دیا ہے۔ اس کے بعد شاعر نے حضرت مسلم بن عقیلؑ کی مدح و ستائش کی ہے۔ ان کے آباؤ اجداد کے کارنامے بیان کئے ہیں اور ان کے سوانح حیات شاعرانہ پیرائے میں بیان کئے ہیں۔ اس کے بعد شاعر نے مسلمؑ ذی جاہ کو سفیر حضرت امام حسینؑ کی حیثیت سے کوفے روانہ ہونے کا منظر نہایت دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ کوفے میں حضرت مسلم بن عقیلؑ کے کارناموں اور دشمنوں کی سازشوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور آخر میں ان کی ولولہ انگیز شہادت کو انتہائی دردناک انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ مرثیہ ایک ندرت رکھتا ہے کہ شاعر نے حضرت مسلم بن عقیل کے کردار کے نمایاں پہلوؤں کو اُجاگر کر کے پورے مرثیے کا تانا بانا بنا ہے۔

اس مرثیے کے بارے میں ڈاکٹر اجمل نیازی رقم طراز ہیں:

''......حضرت مسلم بن عقیلؑ کو سید وحید الحسن ہاشمی نے حضرت امام حسین علیہ السلام کا سفیر کہا ہے۔ پھر انہیں حسینؑ کے وکیل کا خطاب دیا ہے۔ ان دونوں القاب میں پوری تاریخ سمٹ آئی ہے۔ حضرت مسلم بن عقیلؑ کو اتنا بڑا اخراج تحسین شاید ہی اس سے پہلے پیش کیا گیا ہو۔ حضرت مسلم بن عقیلؑ

کے لیے سید وحید الحسن ہاشمی کے اشعار قصیدہ بھی ہیں اور مرثیہ بھی۔ (۲۹)''

۹۔ ملیکتہ العرب

''ملیکتہ العرب'' نامی مرثیہ ۱۹۸۲ء میں تخلیق ہوا اور ۱۹۸۳ء میں حلقہ شعرائے اہلِ بیتؑ پاکستان کے تعاون سے کتابی صورت میں سامنے آیا۔ اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر آغا مسعود رضا خاکی کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ موصوف نے سید وحید الحسن ہاشمی کے شخصی تعارف کے بعد ان کے مطبوعہ تخلیقات کی طرف توجہ دلائی ہے اور آخر میں اس مرثیے کے فکری اور فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مرثیہ کل اکسٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ ۷۲ (بہتر) صفحات پر مشتمل اس کتاب کا ہدیہ ''دعائے خیر'' ہے۔

''ملیکتہ العرب'' نامی مرثیے میں شاعر نے زوجۂ رسولؐ حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کی سوانح، سیرت، ماحول اور کارناموں کو موضوع بنایا ہے۔ اُردو زبان میں حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے حال میں لکھا جانے والا غالباً یہ پہلا مبسوط مرثیہ ہے۔ جس میں شاعر نے شروع سے آخر تک موضوع کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس مرثیے میں شاعر نے اولاً عقائد کے بعض بنیادی مسائل چھیڑے ہیں اور اس کے بعد نہایت پُر مغز اور مدلل انداز میں ان کی توضیح و تشریح کی ہے۔ شاعر نے مرثیے کے آغاز میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ منافقین نے اسلام کی اصل رُوح کو ختم کرنے کے لئے اسلام پر بغض و عناد کے جو تیر برسائے اس تیر کا ایک نشانہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ بھی بنیں۔

شاعر نے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کے حوالے سے پیدا ہونے والی بعض غلط فہمیوں کو بھی دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاعر کا موقف واضح ہے کہ حضرت خدیجہؑ کی آمد سے حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اطمینانِ قلب نصیب ہوا اور انہی کے سبب اس جہان میں نسلِ

---

(۲۹) محمد اجمل نیازی، ڈاکٹر (رائے) ''العطش (جلد اول)'' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۱۵۶

مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آج بھی موجود ہے۔ شاعر نے حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کا موازنہ حضرت مریمؑ ، حضرت سارہؑ اور حضرت ہاجرہؑ سے کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ فضیلت وسعادت میں حضرت خدیجہؑ سب سے افضل ومحترم ہیں۔ مرثیہ کے آخر میں شاعر نے حضرت زینبؑ کو ریاضِ خدیجہؑ کا ایک پھول قرار دیا ہے۔ حضرت زینبؑ نے بعد شہادتِ حسینؑ جس طرح سے مقاصد حسینؑ کی تبلیغ واشاعت کی ہے' وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آخر میں شاعر نے انتہائی الم ناک انداز میں شہادتِ حسین علیہ السلام کے بعد کے حالات قلم بند کیے ہیں اور خاص طور پر اس حوالے سے حضرت زینبؑ کا کردار پیش کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ مرثیہ دو جہتوں میں دیگر مرثیوں سے مختلف ہے۔ اولاً شاعر نے اس مرثیے میں عقائد کے بعض بنیادی سوالات اٹھا کر ان کے تشفی بخش جوابات دیے ہیں۔ ثانیاً اس میں شاعر نے نفسیاتی اور دھیما لہجہ چھوڑ کر بلند آہنگ اور دبنگ لہجہ اختیار کیا ہے۔ اس باعث سید وحید الحسن کے اس مرثیے کو ناقدین نے ان کے ندرت فکر کا نمونہ قرار دیا ہے۔ (۳۰) ڈاکٹر آغا سہیل اس مرثیے کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''...... ہاشمی صاحب محض متبع ہی نہیں مخترع بھی ہیں۔ زیر نظر مرثیہ ملیکۃ العرب جناب خدیجہ کے حال میں رقم ہوا ہے لیکن حضرت خدیجہ کے اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کے بیان سے متعلق ہے۔ ان کی عصمت اور عفت اور ان کے خانوادے کی جلالت قدر پر روشنی ڈالنے کے لیے ہاشمی صاحب نے تاریخی شواہد اور منطقی استدلال سے جو براہین کیے ہیں وہ مسکت ہی نہیں بلکہ برہان قاطع اور قاطع برہان کی دولت وثروت اور ان کی طہارت و پاکیزگی ان کی شخصی حیثیت کے تعین میں مددگار رہوئی۔'' (۳۱)

---

(۳۰) طاہر حسنین کاظمی' سید' ڈاکٹر' اردو مرثیہ میر انیس کے بعد' دہلی: ایرانین آرٹ پرنٹرز' ۱۹۹۷ء' ص ۳۸۶

(۳۱) آغا سہیل' ڈاکٹر (رائے) ''العطش (جلد اول)'' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز' ۱۹۸۹ء' ص ۱۷۶

١٠۔ زنجیرِ سفر

"زنجیرِ سفر" نامی مرثیہ ۱۹۸۷ء کی یادگار ہے۔ چھپن بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ پہلی مرتبہ العطش (جلد اول) میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

"زنجیرِ سفر" نامی مرثیہ سید سجاد حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے حال میں کہا گیا ہے۔ اس مرثیے میں شاعر نے شہادتِ حسین علیہ السلام کے بعد مقاصدِ شبیرؑ کی نشر و اشاعت کے لئے حضرت زین العابدینؑ کے سفر کو بعض منفرد تشبیہات و علامات کے ذریعے پیش کیا ہے:

"تکمیلِ سفر کیجئے زنجیرِ سفر سے"

کہہ کر شاعر نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اگر مقصد ارفع و اعلیٰ ہو تو مسافر کے عزم کو جابر کا ظلم و ستم نہیں روک سکتا۔ اس سلسلے میں شاعر نے سید سجادؑ کی مثال پیش کی ہے کہ جنہوں نے دینِ حق کی خاطر طرح طرح کے صدمات برداشت کیے۔ اس کے بعد شاعر نے اپنے ممدوح کی سیرت و کردار کے مختلف اوصافِ حمیدہ بیان کیے۔ اُردو شاعری میں غالباً پہلی مرتبہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کو عربی و عجمی تہذیب کے ملاپ کا بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ آخر میں شاعر نے جناب سید سجادؑ کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے کہ انہوں نے کس طرح حضرت امام حسین علیہ السلام کے پیغام کو عوام الناس تک پہنچایا اور اپنے صبر کے وار سے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیا۔ اس طرزِ عمل کا مقصد صرف یہ تھا کہ انسان کی فکر کسی نہ کسی طرح سے بیدار ہوتا کہ وہ کذب و صداقت کے مابین فرق و امتیاز قائم کر سکے۔ آخر میں شاعر نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے دورانِ سفر کے مصائب کا بیان انتہائی دردناک انداز میں کیا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مرثیہ وحید الحسن ہاشمی کے دیگر مرثیوں سے قطعاً مختلف اور منفرد ہے۔ غالباً یہ واحد مرثیہ ہے جس میں شاعر نے ابتداء ہی سے ایک المیہ صورتِ حال پیش کر کے پورے مرثیے میں غم و اندوہ کی لہر دوڑا دی ہے۔ یہی اس مرثیے کی خوبی ہے۔

اس مرثیے کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل احمد خاں رقم طراز ہیں:

"...... جناب سید وحید الحسن ہاشمی کی شاعرانہ شخصیت میں ان کی دینی حساسیت کا مقام مرکزی ہے۔ ان کی اسلوبیاتی وضعوں میں دبستان لکھنؤ کی مخصوص مہارت نمایاں ہیں۔ ان کی قدرت کلام قصیدہ نگاروں کی یاد دلاتی ہے اور مرثیے کے اساتذہ کے لہجوں کے جلال و جمال کو وہ اپنی پر شکوہ نواؤں میں ڈھالتے ہیں۔ مرثیے کے جدید رجحانات کے حوالے سے وہ اخلاقی اور اصلاحی لے کو بھی ابھارتے ہیں۔ ان کے زیر تبصرہ مرثیے میں ان کے اسلوب کی یہ بھی کیفیتیں نمایاں ہیں۔ (۳۲)"

۱۱۔ سرکارِ وفا

"سرکارِ وفا" نامی یہ مختصر مرثیہ ۱۹۸۸ء میں تخلیق ہوا اور آغا قمر حسنین نے ۱۹۸۹ء میں "لہو لہو کہکشاں" نامی کتاب میں دیگر مرثیوں کے ساتھ اسے بھی شائع کر دیا ہے۔ اس کتاب میں کراچی و لاہور کے سات مرثیہ گو شعراء کے مرثیے اور ۱۹ (انیس) سلام گو شعراء کے سلام شامل ہیں۔ "احوال واقعی" کے حوالے سے مرتب نے اس کتاب کی اشاعت کے بارے میں بعض باتیں بیان کی ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ہلال نقوی کا ایک مبسوط مقدمہ بھی اس کتاب میں شامل ہے، جس میں موصوف نے اپنی علمی بصیرت اور ذاتی نقطۂ نظر سے مرثیہ گو شعراء کا تعارف کرایا ہے اور جدید مرثیے کے بارے میں بعض معروضات پیش کیے ہیں۔ یہ کتاب ادارۂ تقدیسِ قلم کے تعاون سے کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

"سرکارِ وفا" نامی مرثیہ علمبر دارِ فوجِ حسینؑ حضرت عباسؑ کے حال میں رقم کیا گیا ہے۔ اس مرثیے میں حضرت عباسؑ کے فضائل و مصائب بلند آہنگی سے بیان کیے ہیں۔ شاعر نے آغاز ہی میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وفا سلطنتِ حق ہے اور اس کا نظام عباسؑ ہیں۔ شاعر کا خیال ہے کہ حضرت عباسؑ کی پوری زندگی حق و صداقت کی علمبردار تھی، کیوں کہ آپ کی پرورش و پرداخت خاص خانۂ زہراؑ میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد شاعر نے ان کے بچپن اور جوانی

---

(۳۲) سہیل احمد خان، ڈاکٹر (رائے) "العطش" لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۱۹۴

تک کے حالات اور کارنامے انتہائی اختصار سے بیان کئے ہیں۔ حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفقاء میدان کربلا میں اپنی اپنی قربانیاں پیش کر رہے تھے تو اس وقت حضرت عباسؑ کا جلال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ شاعر نے حضرت عباسؑ کے لحہ بہ لحہ بدلتے ہوئے تیور نہایت چابکدستی سے پیش کئے ہیں۔

آخر میں شاعر نے نہایت خوبصورتی سے حضرت عباسؑ کی مشروط جنگ اور ان کے حصولِ آب کا تذکرہ نہایت دردناک انداز میں کیا ہے۔ آخر میں شاعر نے حضرت عباسؑ کی شہادت کے بعد دل کو دہلا دینے والے بین پیش کئے ہیں۔ مجموعی طور پر حضرت عباسؑ کے حال میں لکھا جانے والا یہ مختصر مرثیہ ان کے صفات و کمالات کا ایک عمدہ اور نادر نمونہ ہے۔

سید وحید الحسن ہاشمی کے اس مرثیے کی ناقدین نے بہت تعریف کی ہے۔ ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی نے اس مرثیے کو سید وحید الحسن ہاشمی کی علمی بصیرت اور بالغ نظری کا نمونہ قرار دیا ہے۔ (۳۳) اس مرثیے کے بارے میں ڈاکٹر عبید اللہ خان کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

> ''......سید وحید الحسن ہاشمی نے الفاظ کے انتخاب میں بڑی فنکاری سے کام لیا ہے۔ چونکہ انہیں زبان پر پوری قدرت حاصل ہے اس لیے ہر ہر بند میں الفاظ کی مرصع کاری قدم قدم پر اپنے نقوش اس طرح ثبت کرتی چلی جاتی ہے کہ جنگ کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاری سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے بلکہ وہ خود بھی اس جنگ میں شریک ہے اور حضرت عباسؑ کی راہ کو اپنا کر اپنے لیے توشۂ آخرت تیار کر رہا ہے۔ (۳۴)''

سید وحید الحسن ہاشمی کے درج بالا گیارہ مرثیے العطش (جلد اول) میں شائع ہو چکے

---

(۳۳) طاہر حسین کاظمی، سید، ڈاکٹر، اردو مرثیہ میر انیس کے بعد، دہلی: ایرانین آرٹ پرنٹرز، ۱۹۹۷ء، ص ۳۸۶

(۳۴) عبید اللہ خان، ڈاکٹر (رائے) ''العطش''، لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۲۱۲

ہیں۔ راقم الحروف نے ان مرثیوں کی تسوید میں یہ اہتمام کیا تھا کہ ہر مرثیے پر کسی معتبر ناقد کی رائے پیش کی جائے۔ ابھی آپ نے ان ناقدین کی آراء کے جزوی اقتباسات پڑھے ہوں گے۔ اب چلتے چلتے اس العطش (جلد اول) کے بارے میں دو ناقدین کی آرا اور دیکھ لیجیے۔
جناب احمد ندیم قاسمی رقم طراز ہیں:

''......سید وحید الحسن ہاشمی ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ مرثیہ گوئی ان کے فن کا خاص میدان ہے اور دیگر متعلقہ اصناف شاعری نعت' سلام اور منقبت میں بھی وہ اپنے عصر کے شعراء میں ایک الگ اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ بہت کم شعراء نے عقیدے اور فن کو اتنے توازن اور تناسب سے شعر کی صورت دی ہوگی۔ ان کے کلام میں روانی' سلاست اور سادگی مستزاد صفات ہیں۔ ان کا فن جہاں بڑے بڑے اہل علم و دانش کی تحسین کا مستحق ہے وہیں عام پڑھا لکھا آدمی بھی ان کے کلام سے دل کی گہرائیوں تک متاثر ہو گا۔ ناقدین ادب نے بجا طور پر کہا ہے کہ انیس اور دبیر کے بعد فن مرثیہ کو زوال آ گیا میں نے ''بجا طور پر'' کے الفاظ اس لیے استعمال کیے ہیں کہ انیس و دبیر کے بعد سالہا سال تک ان کے پائے کی مرثیہ نگاری کا سراغ نہیں ملتا۔ البتہ بیسویں صدی میں جوش ملیح آبادی' آل رضا' نسیم امروہوی اور وحید الحسن ہاشمی کے سے مرثیہ نگاروں نے اپنی تخلیقات سے ناقدین ادب کے دعوے کی تنسیخ کر دی۔ مثال کے طور پر ہاشمی صاحب کے کلام کا مطالعہ کیجیے وہ پورے سانحۂ کربلا کو اس کے صحیح سیاق و سباق کے ساتھ' مگر دور جدید کے طرز احساس کی روشنی میں اتنے کمال سے فن کا پیرایہ عطا کرتے ہیں کہ اردو میں فن مرثیہ نگاری عروج کی ایک نئی سطح کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔'' (۳۵)

سید وحید الحسن کے مرثیوں کے اولین مجموعے ''العطش'' کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی رقم طراز ہیں:

---

(۳۵) احمد ندیم قاسمی ''العطش'' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز' ۱۹۸۹ء ص فلیپ

''.....سید وحید الحسن ہاشمی کا مجموعہ مراثی العطش کئی لحاظ سے اہم ہے۔ کلاسیکی روایت میں انفرادیت کا راستہ نکالنا جان جوکھوں کا کام ہے اور بڑے بڑے شاعر مرثیوں کی بندوں والی تکنیک میں اکثر اساتذہ کے مصرعوں کے مصرعے دہرانا شروع کر دیتے ہیں۔ حدود و قیود میں رہتے ہوئے اپنے لیے نیا راستہ نکالنا اور مرثیے کی زمین میں وسعت پیدا کرنا مشاق اور خلاق شاعر ہی کا کام ہے۔ وحید الحسن ہاشمی میں یہ دونوں صفات موجود ہیں۔ اس لیے ان کے مرثیوں میں انیس و دبیر کی شان و شوکت بھی ہے اور روانی و محاکاتی کا انداز بھی لیکن بزرگوں کے ''مال'' کو دہرانے کا وہ رویہ نہیں جو آج کل کے مرثیہ نگاروں کے ہاں عام ہو گیا ہے۔ کسی بندھی ٹکی پچویشن میں تر و تازگی قائم رکھنا بڑے سلیقے کی بات ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ انہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام اور دیگر شخصیات کو انسانی صفات سے الگ نہیں کیا اور عقیدے کے جوش میں وہ غلو کی منزل تک نہیں پہنچے۔ اردو مرثیے میں العطش ایک اہم اضافہ ہے۔'' (۳۶)

سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کا دوسرا مجموعہ العطش جلد دوم کے نام سے طبع ہوا۔ اس مجموعہ میں صاحب تصنیف نے حرف مدعا کے عنوان سے لکھا ہے کہ

''..... میں نے ان مرثیوں میں جہاں تک ہو سکا عام فہم الفاظ و تراکیب استعمال کی ہیں' اضافتوں کا استعمال بہ امر مجبوری ہوا ہے۔ میں نے صنائع اور بدائع سے بھی گریز کیا ہے کیوں کہ میں صنائع اور بدائع کو بشمول قافیہ و ردیف بدن نہیں بدن کا زیور سمجھتا ہوں۔ اب اگر کوئی اپنے قدرتی بدن کے حسن کو پوشیدہ کر کے فقط زیورات کی نمائش کرنا چاہتا ہے تو اس کی مرضی اس پر قدغن کوئی نہیں ہے''۔ (۳۷)

---

(۳۶) وحید قریشی' ڈاکٹر ''العطش'' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز' ۱۹۸۹ء ص فلیپ

(۳۷) وحید الحسن ہاشمی ''العطش (جلد دوم)'' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز' ۱۹۹۵ء ص ۲

العطش جلد دوم میں کل گیارہ مرثیے شامل ہیں۔ اس مجموعے میں ڈاکٹر آغا سہیل کا مقالہ بعنوان ''وحید الحسن ہاشمی اور جدید اردو مرثیہ'' اور ڈاکٹر مظفر عباس کا مقالہ بعنوان ''اردو مرثیے کے وحید العصر'' شامل ہیں۔ وحید الحسن ہاشمی کے زیر نظر مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر آغا سہیل رقمطراز ہیں:

''...... یہاں کے بے شمار جدید مرثیہ نگاروں میں وحید الحسن ہاشمی اس لیے نمایاں اور ممتاز ہیں کہ انہوں نے کلاسیکیت کے معتبر اسالیب سے دامن نہیں بچایا اور جدید رنگ کے معیار کو ملحوظ رکھ کر مرثیہ کہا یعنی اپنے زمانے کو اور اس کے تقاضوں کو اپنے مرثیے سے منہا نہیں کیا۔ ان کے مرثیوں میں عصری حسیت ان کے پیش رو جوش اور آل رضا کی طرح موجود ہے۔ اس سلسلے میں ان کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مراثی کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ (۳۸)''

سید وحید الحسن ہاشمی کے دوسرے مجموعہ مراثی کا استقبال کرتے ہوئے ڈاکٹر مظفر عباس نے موصوف کو اُردو مرثیے کا ''وحید العصر'' قرار دیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''...... وحید الحسن ہاشمی صاحب ہماری مذہبی شعری روایت کے اس قبیلے کے فرد ہیں جس نے قدیم روایت کے اندر سے اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے۔ ان کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر مرثیے کو اس حد تک جدید تقاضوں کے قریب لے آیا ہے کہ جدید سے جدید ذہن بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' (۳۹)

اب ذیل میں اس مجموعہ مراثی کے تمام مرثیوں کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں:

---

(۳۸) آغا سہیل، ڈاکٹر ''وحید الحسن ہاشمی اور جدید اردو مرثیہ'' مشمولہ ''العطش'' (جلد دوم) لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰

(۳۹) مظفر عباس، ڈاکٹر ''اُردو مرثیے کا وحید العصر'' مشمولہ ''العطش'' (جلد دوم) لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰

۱۲۔ انا اور خودداری

''انا اور خودداری'' نامی مرثیہ ۱۹۹۱ء میں معرضِ تخلیق میں آیا اور ۱۹۹۵ء میں ''العطش'' (حصہ دوم) میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ العطش حصہ دوم کو..... الحبیب پبلی کیشنز نے لاہور سے شائع کیا۔ یہ مرثیہ کل ۷۲ بندوں پر مشتمل ہے۔

''انا اور خودداری'' نامی اس مرثیے میں شاعر نے عصرِ حاضر کے ایک ایسے فرد کا نقشہ کھینچا ہے جو تشکیک و تیقن کے تصادم سے دوچار ہو کر گرفتارِ انا ہو گیا ہے۔ وہ اس وہم میں مبتلا ہے کہ بس اس کی ذات کائنات کی ہر چیز پر قدرت رکھتی ہے اور اسی وجہ سے زمین و خلاء اس کے قلمرو میں ہیں۔ شاعر احساس دلاتا ہے کہ دنیادار کی اَنا حق کو نہیں دبا سکتی۔ خودداری اَنا کے مقابلے میں ایک احسن جذبہ ہے۔ عقلمند وہ ہے جو اپنی انا کو ختم کر کے خدا کے احکامات کی پیروی کرے اور محمدؐ و آلِ محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے طرزِ فکر کو اپنائے۔

شاعر کا موقف یہ ہے کہ کربلا کے میدان میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے خانوادے نے طاغوتی طاقتوں کی انا کے بُت خودداری کی تلوار سے پاش پاش کیے اور اسی طرح شام کے بازاروں اور درباروں میں حضرت زینبؑ نے اپنی تقریروں اور خطبوں کے ذریعے حق و باطل میں حدِ فاصل قائم کی۔ شاعر نے زندانِ شام کا تذکرہ انتہائی الم انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ مرثیہ فنی اور فکری ہر دو اعتبار سے انتہائی قابلِ قدر اور وقیع ہے۔

۱۳۔ معرفتِ ذات

''معرفتِ ذات'' نامی مرثیہ ۱۹۹۴ء میں کہا گیا اور ۱۹۹۵ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ ۵۷ بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ ''العطش'' (جلد دوم) کی زینت بنا۔

''معرفتِ ذات'' نامی مرثیے میں شاعر نے تلاشِ ذات میں سرگرم و سرگرداں ایک ایسے بشر کی داستان بیان کی ہے، جس کا چراغ ضمیر بجھ چکا ہے اور وہ کشمکشِ ذات کے قفس میں اسیر ہو گیا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ عقلمند وہ ہے جو اپنے بدن پر ردائے ذات تاننے کے

بجائے حکم خدا کو پیشِ نگاہ رکھے۔ جب کوئی بشر احکامِ خدا کا تابع ہو جاتا ہے تو پوری کائنات اُس کے قدموں کی دھول بن جاتی ہے۔ شاعر․․․ یاس دلاتا ہے کہ محمدؐ و آلِ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے نفس کو بیچ کر رضائے حق خرید لی۔ یہی سبب ہے کہ اب وہ پوری کائنات کے دل کی دھڑکن بن گئے ہیں۔ شاعر احساس دلاتا ہے کہ میدانِ کربلا میں یزید کبر و نخوت کا نمونہ بن کر اُبھرا اور حضرت امام حسین علیہ السلام حق کی معرفت لے کر میدان میں آئے۔ یہی سبب ہے کہ میدانِ کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے سجدے نے ملوکیت کا غرور توڑ کر دنیا والوں کو معرفت کا شعور عطا کیا۔

آخر میں شاعر نے شہادتِ امام حسین علیہ السلام کے بعد خانوادۂ رسالتؐ پر ہونے والے مظالم کو دلگداز انداز میں بیان کیا ہے اور حضرت زینبؑ کے المناک مصائب پیش کئے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مختصر مرثیہ موضوعاتی اعتبار سے انتہائی قدر و منزلت کا حامل ہے۔

۱۴۔ اُسوۂ بتولؑ

''اُسوۂ بتولؑ'' نامی مرثیہ ۱۹۸۹ء میں تخلیق ہو کر ۱۹۹۵ء میں طبع ہوا اور ''العطش'' (حصہ دوم) میں شامل ہوا۔ ۶۴ بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ اپنی گوناگوں صفات کی بناء پر اہلِ دانش سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔

''اُسوۂ بتولؑ'' نامی مرثیے میں شاعر نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو اس کائنات کے لئے باعثِ رحمت قرار دیا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ گلستانِ رسالت کی معصوم کلی حضرت فاطمہؑ عالمِ نسواں کی نگہبان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنابِ بتول سلام اللہ علیہا کو جو عز و افتخار عطا کیا' وہ کسی دوسری خاتون کو نصیب نہ ہو سکا۔ شاعر کے نزدیک اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ حضرت فاطمہؑ نسلِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بقا کا نشان ہیں۔ شاعر کے نزدیک حضرت فاطمہؑ کی زندگی عالمِ نسواں کے لئے نمونۂ عمل ہے۔ آپؑ نے اپنے طرزِ حیات کے جو نقوش چھوڑے ہیں' عصرِ حاضر کی ہر پاک دامن بی بی اس پر چل کر اپنی دنیا و آخرت کو سنوار سکتی ہے۔

آخر میں شاعر نے اُن دردناک مصائب کا ذکر کیا ہے، جو حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو برداشت کرنا پڑے اور یہی مصائب ان کی موت پر منتج ہوئے۔ آخر میں شاعر نے چشم تخیل سے حضرت فاطمہؑ کو کربلا کے صحرا میں پریشاں حال دیکھا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تحریکِ آزادیٔ نسواں کے پس منظر میں یہ مرثیہ مسلمان خواتین کے لئے بطورِ خاص مشعلِ راہ ہے۔

۱۵۔ آرزوئے علیؑ

''آرزوئے علیؑ'' نامی مرثیہ ۱۹۹۰ء میں معرضِ تخلیق میں آیا اور ۱۹۹۵ء میں ''العطش'' (حصہ دوم) میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ یہ مرثیہ کل ۶۶ بندوں پر مشتمل ہے۔

''آرزوئے علیؑ'' نامی مرثیے میں شاعر نے آرزو کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ بقائے بشریت کا مدار آرزو پر ہے تاہم یہی خواہش نفس پرستی کا سبب بن جائے تو انسان شرف انسانیت سے بھی گر جاتا ہے۔ شاعر احساس دلاتا ہے کہ حضرت علیؑ نے رحلتِ فاطمہؑ کے بعد تحفظ اسلام کیلئے حضرت اُم البنینؑ سے عقدِ ثانی کی آرزو کی۔ اس آرزو کے اسرار ورموز سے شاعر نے کما حقہٗ پردہ اٹھانے کی سعی بلیغ کی ہے۔ شاعر واضح کرتا ہے کہ حضرت اُم البنینؑ حضرت فاطمہؑ کے دل کی دُعا، تزئین گلستانِ وفا اور معجزۂ دستِ بقا ہیں۔ آپ نے جس طرح حضرت عباسؑ علمبردار کی پرورش و پرداخت کی وہ سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

آخر میں شاعر نے واقعہ کربلا کے بعد اہلِ حرم کی واپسی کو غمناک انداز میں بیان کیا ہے اور حضرت اُم البنینؑ کے حسرت ناک بین پیش کئے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مرثیہ اپنے منفرد موضوع اور دلکش اسلوب کی وجہ سے قابل قدر قرار پاتا ہے۔

۱۶۔ پردہ

''پردہ'' نامی مرثیہ کا سنِ تخلیق تو ۱۹۹۰ء ہے تاہم یہ مرثیہ ۱۹۹۵ء میں العطش (جلد دوم) میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ ۶۵ بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ مجموعی اعتبار سے انتہائی اہم

قرار دیا جاسکتا ہے۔

''پردہ'' نامی مرثیہ میں شاعر نے پردہ کی ضرورت' اہمیت اور فضیلت پر روشنی ڈالی ہے۔ شاعر احساس دلاتا ہے کہ تزئینِ کائنات کے مناظر انتہائی عجیب ہوتے ہیں اور حق کے مظاہر پردے میں مستور ہیں۔ خالق کو حجاب کی گہرائیاں اتنی پسند ہیں کہ اُس نے پردے کو اپنی ذات سے منسوب کر دیا ہے۔ شاعر نے مختلف تشبیہات و استعارات کی مدد سے پردے کی جلوہ خیزیاں ظاہر کرنے کے بعد یہ موقف اختیار کیا ہے کہ عورتوں کے لئے پردے کا اہتمام ضروری ہے۔

آخر میں شاعر نے انتہائی ملال انگیز انداز میں کرب و بلا میں سیدانیوں کے سر سے چادریں چھین لینے کے واقعات بیان کئے ہیں۔ شاعر نے موقف اختیار کیا ہے کہ حضرت زینبؑ کے سر سے چادر تو چھین لی گئی لیکن یہی چادر اب کائنات کے سر پر سایہ فگن ہے۔ آخر میں شاعر نے انتہائی دردناک انداز میں حضرت سکینہؑ کی شہادت کے واقعات قلمبند کئے ہیں اور حضرت ربابؑ کے بین پیش کئے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مرثیہ اپنے تاثر کے اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

۱۷۔ بچپن

''بچپن'' نامی مرثیہ ۱۹۹۲ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا اور ۱۹۹۵ء میں العطش (جلد دوم) میں طبع ہوا۔ یہ مرثیہ ۵۰ بندوں کو محیط ہے اور ہر بند تسبیح کے دانے کی طرح ایک دوسرے سے پیوست ہے۔

''بچپن'' نامی مرثیے میں شاعر نے بچپن کو زیست کی منزل اول کا سفر قرار دیا ہے۔ شاعر کے نزدیک چشمِ ظاہر میں تو بچپن بالکل تہی دامن ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت بیں نگاہوں میں عزائم کا مخزن ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ بچپن ایک مجاہد سپاہی اور نوجوان پر بھی سبقت لے جاتا ہے کہ خالق اسے اپنی گواہی کے لئے خود طلب کرتا ہے۔ شاعر نے انتہائی دلچسپ اور پرلطف انداز میں بچپن کے مختلف رنگ روپ بیان کئے ہیں۔ شاعر نے حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر معصوم بچوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بات واضح کی

ہے کہ اس کائنات میں بے شمار ایسے بچے گزرے ہیں کہ جنہوں نے اللہ کی عظمت و سطوت کی گواہیاں دی ہیں۔ اس مرثیے کے آخر میں شاعر نے کرب و بلا کے میدان میں حق کی گواہی دینے والے ایک معصوم بچے جناب علی اصغر کا ذکر انتہائی رقت آمیز انداز میں کیا ہے۔ شاعر احساس دلاتا ہے کہ جناب علی اصغرؑ نے قضا کے سامنے اپنا ننھا سا گلا پیش کر کے انسان کو خدا کے سامنے جھکا دیا ہے اور حشر تک ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف اپنی بہترین گواہی پیش کر دی ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ایک خاص موضوع کے حوالے سے یہ مرثیہ اپنے اندر بے پناہ ربط رکھتا ہے اور اس بناء پر ناقدینِ ادب نے اس کی بے حد پذیرائی کی ہے۔

۱۸۔ شباب

''شباب'' نامی مرثیہ ۱۹۹۳ء میں مکمل ہوا اور ۱۹۹۵ء میں العطش (جلد دوم) میں شامل ہوا۔ یہ مرثیہ اکسٹھ بندوں پر محیط ہے اور شاعر نے کمال ہنرمندی سے تمام بندوں کو موضوع کے ساتھ منسلک رکھنے کا فریضہ انتہائی خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔

''شباب'' نامی مرثیے میں شاعر نے شباب کو آئینہ ارتقاء کا جوہر' وقت کے آنچل میں گل تر' اور حق کی رنگینیوں کا محور قرار دیا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ شباب حقیقت میں رحمتِ خداوندی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جو نفوس اس رحمت کی قدر کرتے ہیں' زمانہ ان کی قدر کرتا ہے اور جو لوگ شباب پرستی کی چاہ میں ڈوب جاتے ہیں' زمانہ اُنہیں جیتے جی فراموش کر دیتا ہے۔ شاعر نے اپنے موقف کی تائید میں ایسے جوانان خوش خصال کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے اپنی جوانیوں کو راہ خدا میں وقف کر دیا۔ اس سلسلے میں شاعر کی نگاہ بطور خاص حضرت علی اکبر علیہ السلام پر ٹھہرتی ہے۔ شاعر کو حضرت علی اکبرؑ کا روپ انتہائی نورانی دکھائی دیتا ہے۔ شاعر نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے نوجوان بیٹے حضرت علی اکبرؑ شبیہِ رسول کی عادات و اطوار پر روشنی ڈالی ہے۔ یہی بیٹا جب امام حسینؑ سے کربلا کے میدان میں دشمنوں سے جنگ کرنے کے لئے اجازت مانگتا ہے تو باپ کا دل بے تاب ہو جاتا ہے۔ اس موقعے پر شاعر نے باپ اور بیٹے کی نفسیاتی کیفیت کا جس چابکدستی سے مرقع کھینچا ہے' وہ قابلِ داد ہے۔

شاعر نے اس مرثیے میں جناب علی اکبرؑ کی اہل حرم سے رخصت کا حال نہایت دردانگیز طریقے سے بیان کیا ہے۔ خصوصی طور پر علی اکبرؑ اور بیمار حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی گفتگو بڑی کرب انگیز ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو مکالمہ نگاری پر پوری دسترس حاصل ہے۔ مقامِ افسوس یہ ہے کہ عین عالم شباب میں اس کڑیل جوان کو ریگزار کربلا پر شہید کر دیا گیا۔ شبیہِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دردناک شہادت کو شاعر نے انتہائی پُراثر انداز میں بیان کیا ہے۔

آخر میں شاعر نے شہادت جناب علی اکبر علیہ السلام کے نتیجے میں ہونے والے حزن و یاس کے مناظر بیان کئے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مرثیہ اپنے موضوع کے تمام رخوں کا بھرپور احاطہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔

۱۹۔ پیری

''پیری'' نامی مرثیہ ۱۹۹۴ء میں تخلیق ہوا اور ۱۹۹۵ء میں العطش (جلد دوم) میں طبع ہوا۔ ساٹھ بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ موضوع کے اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔ شاعر کا وصف یہ ہے کہ اس نے تمام بندوں میں ایک ربط قائم رکھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ابتداء سے لے کر انتہا تک موضوع کے مختلف رخوں پر روشنی پڑتی رہتی ہے۔

''پیری'' نامی مرثیے میں شاعر نے خالق کی ثناء کو محورِ عقل بشری قرار دیا ہے اور احساس دلایا ہے کہ ثنائے رب شب کی سیاہی میں بیاضِ سحری ہے۔ شاعر نے توحید کی عظمت بیان کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ انسانی ذہن تو کجا' انبیاؑ بھی توحید کی حد بندی نہیں کر سکتے۔ یہی سبب ہے کہ عقلِ انسانی میں بحرِ احد کا ساحل نہیں آ سکتا۔ شاعر کا موقف یہی ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں موجود ہیں۔ ان میں خلاقِ دو عالم کی سب سے بڑی نعمت پیری ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پیری اپنے کاندھوں پر تجزیۂ زیست کا پرچم اٹھائے ہوتی ہے اور عقل و دانش سے زخمی تمنا پر مرہم لگاتی ہے۔ شاعر نے کمال مہارت سے بچپن' جوانی اور پیری کا موازنہ کر کے پیری کو سب پر فوقیت دی ہے۔ شاعر نے کہنہ سال پیمبروںؑ کی مثالیں

دے کر ثابت کیا ہے کہ نگاہِ قدرت میں پیری کی بہت زیادہ قدر و منزلت ہے۔

آخر میں شاعر نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی پیرانہ سالی کو اعجازِ مشیت قرار دیا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ شبیرؑ کی پیری درِ فردوس کی مفتاح، شبِ عاشور کا مصباح اور مرضِ کفر کی اصلاح ہے۔ شاعر نے انتہائی دل سوز انداز میں کرب و بلا کے میدان میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی پیری کے مختلف مظاہر بیان کئے ہیں۔ شاعر نے اس منظر کی بطورِ خاص نہایت عمدہ تصویر کشی کی ہے، جس میں جناب علی اکبرؑ امام عالی مقام سے اذنِ وغا طلب کرتے ہیں۔

آخر میں شاعر نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو شہزادہ علی اکبرؑ کی لاش کی جانب سفر کرتے دکھایا ہے اور ان کیفیات کا اظہار لفظوں میں کیا ہے، جنہیں محسوس کرنا عام قاری کے بس کی بات نہیں ہے۔ مجموعی طور پر یہ مرثیہ شروع سے آخر تک ایک حزنیہ فضا رکھتا ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے موضوع کا دامن اپنے ہاتھ میں تھامے رکھا ہے۔

۲۰۔ شخص و شخصیت

''شخص و شخصیت'' نامی مرثیہ ۱۹۹۴ء میں مکمل ہو کر ۱۹۹۵ء میں العطش (جلد دوم) کی زینت بنا۔ یہ مرثیہ کل ۶۴ بندوں پر مشتمل ہے۔ شاعر نے انتہائی فنکاری اور مہارت کے ساتھ ان بندوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔

''شخص و شخصیت'' نامی مرثیہ میں شاعر نے شخصیت کو تکملۂ جذبۂ انسانی اور خاصۂ نعمتِ ربانی قرار دیا ہے۔ شاعر نے احساس دلایا ہے کہ عظیم شخصیت بنی نوعِ انسان کی خدمت کے لئے وقف ہوتی ہے۔ وہ فنکار کی عظمت کے لئے ہمہ وقت دل بچھاتی ہے اور قوموں کو کردار کی حرارت بخشتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسندِ ہستی پہ شخصیت شہنشاہی ہے۔ شاعر نے واضح کیا ہے کہ عظیم شخصیت فکرِ حق کی مدد سے کسی بھی شخص کی تقدیر بدل دیتی ہے۔ شاعر نے انتہائی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شخص اور شخصیت میں موجود فرق کی وضاحت نہایت سلیقے سے کی ہے۔ شاعر کے نزدیک شخصیت خوابِ حق آگاہ ہے اور شخص تعبیر۔ شخصیت فکر ہے اور شخص تاثیرِ فکر۔ شخصیت حاصلِ تقدیر ہے اور شخص تدبیر۔ شخصیت ذہنِ مصور ہے اور شخص تصویر ہے۔ شاعر

نے ان فلسفیانہ نکات کے بعد واضح کیا ہے کہ اس کائنات میں شخصیت کلمۂ حق اور شخص لب اظہار، شخصیت مرضیِ شبیر اور شخص خریدار، شخصیت عفو گنہ اور شخص حرؑ وفادار ہوتا ہے۔ یہ شعر پورے مرثیے کا رُخ تبدیل کرتا ہے۔

حرؑ جو اک شخص تھا دیوارِ الم سے لپٹا
شخصیت بن گیا ہے جب شہ کے قدم سے لپٹا

شاعر نے حضرت حرؑ کی شخصیت کے بے شمار رُخ اُجاگر کیے ہیں۔ خاص طور پر ان کے ذہن و قلب میں ہونے والی کشمکش کو نہایت فنکاری سے بیان کیا ہے۔ آخر میں شاعر نے کربلا کے میدان میں جناب حرؑ کی شہادت کو نہایت سلیقے سے بیان کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ مرثیہ شاعر کی فلسفیانہ سوچ کا غماز ہے۔

۲۱۔ آقائے ابوالقاسم خوئی

''آقائے ابوالقاسم خوئی'' نامی مرثیہ ۱۹۹۲ء میں کہا گیا اور ۱۹۹۵ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر العطش (جلد دوم) کی زینت بنا۔ یہ مرثیہ ۴۸ بندوں پر مشتمل ہے۔

اردو میں شخصی مرثیوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، تاہم اہل بیتؑ کی مداحی کرنے والے شعراء شخصی مرثیوں سے گریز کرتے رہے ہیں۔ اس حوالے سے میر انیسؔ کا یہ شعر زبان زدِ عوام و خاص ہے۔

غیر کی مدح کروں شہؑ کا ثنا خواں ہو کر
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماںؑ ہو کر

جناب نسیمؔ امروہوی نے جوشؔ کا مرثیہ کہہ کر شخصی مرثیوں کو ایک نیا رنگ دیا۔ اسی طرح جناب قیصرؔ بارہوی نے بھی شخصی مرثیے رقم کیے۔ وحید الحسن ہاشمی نے ایک مدت تک شخصی مرثیوں سے گریز کیا تاہم بعض وجوہ سے وہ اس روایت کو برقرار نہ رکھ سکے اور آیت اللہ آقائے ابوالقاسم خوئی کی عظیم شخصیت پر مرثیہ رقم کیا۔ اس اعتبار سے یہ وحید الحسن ہاشمی کا اولیں شخصی مرثیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

"آقائے ابوالقاسم خوئی" نامی مرثیہ میں شاعر نے انسان کو خالقِ کائنات کا نور قرار دیا ہے۔ یہی انسان ہر زمانے میں دلیلِ عظمتِ مسجود بنا۔ اللہ نے اسے منزلِ برکات کے لئے پیدا کیا اور اس کی زبان سے خود کلام کرنے لگا۔

شاعر کا موقف یہ ہے کہ اشرف المخلوقات انسان اپنے عمل کی بنیاد پر بلند رتبہ کا حامل قرار پاتا ہے۔ تاہم شاعر کے نزدیک عمل کے ساتھ اگر علم دین نہ ہو تو ہر عمل بے معرف ہے۔ یہی سبب ہے کہ عالم اس کائنات میں حُبِ اہلِ بیتؑ دل میں بسا کر سرفراز ہو جاتا ہے۔

اس استدلالی تمہید کے بعد شاعر نے نجف کے معروف عالم آیت اللہ ابوالقاسم خوئی کے فضائل بیان کئے ہیں اور مذہب کے لئے ان کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں شاعر نے کرب و بلا کے میدان میں حضرت امام حسینؑ کے سفرِ آخرت کا نقشہ انتہائی دل گداز انداز میں کھینچا ہے۔ یہ مرثیہ ربط و تسلسل کے اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔

۲۲۔ جوہرِ وراثت

"جوہرِ وراثت" نامی مرثیہ ۱۹۹۲ء میں تخلیق ہوا اور ۱۹۹۵ء میں العطش (جلد دوم) میں طبع ہوا۔ یہ مرثیہ ۶۱ بندوں پر مشتمل ہے اور ہر بند دوسرے کے ساتھ سلکِ دُر کی طرح منسلک ہے۔

"جوہرِ وراثت" نامی مرثیے میں شاعر نے عمل کی اہمیت، فضیلت اور ضرورت کو نہایت دلچسپ طریقے سے بیان کیا ہے۔ شاعر نے عمل کو حدیقۂ انسانیت کی خوشبو، نجات کے پیکر کا زورِ بازو اور فضائے ذہن میں دشتِ طلب کا آہو قرار دیا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ عمل کے بغیر انسان کی زندگی بے وقعت بلکہ ایک چلتا پھرتا لاشہ ہے۔ شاعر کے نزدیک اس کائنات میں ہر جگہ رنگِ عمل کی گلکاری اور ازل سے تابہ ابد عمل ہی کی عملداری ہے۔ یہی سبب ہے کہ شاعر نے عمل کی آخری معراج کربلائے حسینؑ قرار دی ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ اس کائنات میں بے شمار اعلیٰ حسب و نسب صاحبانِ علم و عمل گزرے ہیں۔ تاہم جناب مصطفیٰ جوہر کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی استقامتِ فکر سے علم و عمل کے ایسے چراغ

جلائے ہیں کہ آج بھی ان کی روشنی سے صاحبانِ شعور کے قلب منور ہیں۔

آخر میں شاعر نے کرب و بلا کے میدان میں حضرت سکینہؑ کے حزنیہ کلمات پیش کئے ہیں۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ مرثیہ شخصی ہونے کے باوجود شخصی مرثیہ محسوس نہیں ہوتا ہے۔

سید وحید الحسن ہاشمی کے آٹھ مختصر مرثیوں کا مجموعہ ''العطش'' (جلد سوم) کے نام سے راقم الحروف نے ۱۹۹۸ء میں شائع کرادیا۔ الحبیب پبلی کیشنز لاہور کی جانب سے شائع ہونے والے اس مجموعے کا اختصاص یہ ہے کہ اس میں انتظار حسین (وحید الحسن ہاشمی کے مرثیے کا فن) ڈاکٹر سلیم اختر (وحید الحسن ہاشمی کے مرثیے) اور ڈاکٹر حسن رضوی (وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں میں احساسِ تحیر) کے مقالات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ راقم الحروف نے ایک طویل مقدمہ تحریر کیا جبکہ احمد عقیل روبی نے فلیپ لکھ کر اس کتاب کی نوعیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

آیئے سب سے پہلے احمد عقیل روبی کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

> ''......سید وحید الحسن ہاشمی صاحب بلاشبہ مرثیے کی اس عظیم شعری اور تہذیبی روایت کے امین و محافظ ہیں جسے میر انیس نے خونِ جگر دے کر شعری عظمتوں سے روشناس کرایا۔ وحید صاحب نے اس روایت کو کم نہیں ہونے دیا بلکہ اس کے گرداگرد فکری، عصری اور شعری اسلوب کے حاشیے لگا کر اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے وحید صاحب کے یہ گیارہ مرثیے مرتب کر کے عہدِ حاضر اور مستقبل کے قارئین کو العطش (جلد سوم) کی شکل میں ایک ایسا چشمۂ سخن دے دیا ہے جس سے وہ اپنی علمی، فکری اور شعری پیاس بجھاتے رہیں گے۔ (۴۰)''

وحید الحسن ہاشمی کی مرثیہ نگاری اور اس مجموعے میں موجود مرثیوں کے حوالے سے انتظار حسین کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

> ''......وحید الحسن ہاشمی کے یہاں مرثیہ صرف مرثیے کی روایت سے پیدا نہیں

---

(۴۰) احمد عقیل روبی ''العطش'' (جلد سوم)، لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص فلیپ

ہوا ہے۔ اسے دوسری بڑی اصناف سے فیض پہنچتا ہے۔ قصیدے اور غزل سے تشبیب تو علانیہ ان کے مرثیے میں موجود ہے ویسے بھی ان کے ہاں جا بجا بیان کا جو شکوہ نظر آتا ہے اس میں بھی شاید قصیدے کا اثر کام کر رہا ہے۔ غزل سے انہوں نے بات کہنے کے ایمائی طریقے سیکھے ہیں اور مرثیے کے مضمون کو تغزل کے رنگ میں ڈھالنے کا فن حاصل کیا ہے۔ (۴۱)"

ڈاکٹر سلیم اختر نے اس مجموعے میں موجود مقالے میں سید وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کے ایک نئے پہلو کو اُجاگر کیا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے:

"...... جہاں تک وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کا تعلق ہے تو اگرچہ یہ بھی مرثیے کے تمام مخصوص لوازم سے آراستہ ملتے ہیں مگر پھر بھی یہ روایتی نہیں ہیں۔ ہاشمی صاحب نے ہر ممکن طریقے سے ان میں تخلیقی شخصیت کا اظہار کیا ہے جس کے باعث ان کے مرثیاں میں انفرادیت کا جوہر نمایاں نظر آتا ہے۔ (۴۲)"

ڈاکٹر حسن رضوی نے سید وحید الحسن کی رثائی خدمات کا اعتراف بھی کیا ہے اور احساس دلایا ہے کہ

"...... لاہور میں اس صنفِ سخن کو آگے بڑھانے میں جو کردار وحید الحسن ہاشمی نے ادا کیا ہے وہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ فہمی کی تاریخ کا ایک زندہ تابندہ باب ہے۔ انہوں نے جہاں اپنے مرثیوں میں انسانی فطرت' انسانی نفسیات کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے اور انسان اور کائنات کے رشتے کی تشخیص کرتے ہوئے محمدؐ و آلِ محمدؐ کو زندگی اور فطرت کی اعلیٰ اقدار کا منبع قرار دیا ہے وہاں

---

(۴۱) انتظار حسین "وحید الحسن ہاشمی کے مرثیے کا فن" مشمولہ "العطش" (جلد سوم) لاہور: الحبیب پبلی کیشنز' ۱۹۹۸ء' ص ۲۳۴

(۴۲) سلیم اختر' ڈاکٹر "وحید الحسن ہاشمی کے مرثیے" مشمولہ "العطش" (جلد سوم) لاہور: الحبیب پبلی کیشنز' ۱۹۹۸ء' ص ۲۳۶

انہوں نے جدید شعری تقاضوں کے حوالے سے نئے استعاروں، علامتوں، تشبیہوں اور محاکات کے پس منظر میں نئے تخلیقی پیش منظر اُجاگر کیے ہیں۔(۴۳)''

اب ذیل میں سید وحید الحسن ہاشمی کے تیسرے مجموعے ''العطش'' (جلد سوم) میں شامل مرثیوں کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں:

۲۳۔ ادب اور ادیب

''ادب اور ادیب'' نامی مرثیہ ۱۹۹۵ء میں تخلیق ہوا اور ۱۹۹۸ء میں العطش (جلد سوم) کی زینت بنا۔ ۵۵ بندوں کو محیط یہ مرثیہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔

''ادب اور ادیب'' نامی مرثیے میں مختلف زاویوں سے ادیبوں کے معیار اور ان کے مرتبے کا تعین کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ ادیب خلقتِ آدم کا نگہبان اور کشتِ بینش کے لئے ابرِ باراں ہے۔ اس کا قلم وقت کی رفتار کے ساتھ چلتا ہے اور اس کی تحریر سے افکار میں جان پڑ جاتی ہے۔ ان محاسن کے ساتھ شاعر نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ ادیب کہلانے کا مستحق نہیں جس کا جوہرِ فن بے آب ہو۔ ادیب کے گلزار میں بغض و تعصب کے شجر نہیں اُگتے۔ اس کی تسبیح میں صلح اور امن کے دانے ہوتے ہیں۔ تمام عمر وہ انہی دانوں سے اپنی تسبیح گوندھتا رہتا ہے۔ مدح میں اس کا قلم دعبلِ خزاعی اور ہجو میں رفیع سودا کے قلم کی مثل ہو جاتا ہے۔

شاعر نے حضرت علیؑ کو بے مثل ادیب اور نہج البلاغہ کو ادب کی بہترین کتاب تسلیم کیا ہے۔ اس کتاب سے زبان دانی کا لطف، لفظوں کی فراوانی کا علم اور توحید و رسالت کے اسرار و رموز کا مزہ ملتا ہے۔ نہج البلاغہ نثر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اگرچہ اس کتاب سے قبل قرآنِ کریم نثر ہی میں موجود تھا، مگر قرآن میں اجمال و اختصار ہے جبکہ نہج البلاغہ میں تفصیل اور تشریح ہے۔

---

(۴۳) حسن رضوی، ڈاکٹر ''وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں میں احساسِ تحیر'' مشمولہ ''العطش'' (جلد سوم)، لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۲۴۴

آخر میں شاعر نے بتایا ہے کہ خطیب سلونی کی بیٹی حضرت زینبؑ نے جابر اور قاہر بادشاہ کے سامنے نہایت فصیح و بلیغ خطبہ دیا، جس کی گونج سے ایوانِ ابنِ زیاد اور دربار یزید میں تلاطم آ گیا۔ مرثیے کا تسلسل بتاتا ہے کہ اس کا پلاٹ نہایت چابکدستی اور بڑے غور و فکر سے تشکیل دیا گیا ہے۔

۲۴۔ احتساب

''احتساب'' نامی مرثیہ ۱۹۹۷ء میں معرضِ تخلیق میں آیا اور ۱۹۹۸ء میں ''العطش'' (جلد سوم) میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ ساٹھ بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ اپنے اندر ایک فکری ربط رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ تمام بندوں میں ایک خاص طرح کا تسلسل موجزن ہے۔

''احتساب'' نامی مرثیہ میں شاعر نے عمل کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ عمل دلِ حیات کا شفاف آئینہ ہے اور تمام مخلوق اگر مسافر ہے تو عمل رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابتدائی بندوں میں شاعر نے عمل کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ ادب میں حمد و نعت اور مرثیہ عمل ہی کی وجہ سے جامۂ تخلیق پہنتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج ہو یا معجزات، ہدایات ہوں یا غزوات، سب کے سب عمل کی عملداری میں شمار ہوتے ہیں۔ کچھ اعمال نیک ہیں کچھ بد، اگر انسان اپنے اعمال کا احتساب کرتا رہے تو عمل محبوب ورنہ معتوب ہو جاتا ہے۔ جو لوگ خود احتسابی کرتے ہیں اسلام میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ شاعر نے دلیلِ قرآنی سے یہ بات بتائی ہے کہ خدا خود محتسب ہے۔ انسان کے کاندھوں پر دو فرشتے متعین ہیں، جو انسان کا احتساب کرتے رہتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے بڑے محتسب تھے۔ آپؐ کے بعد آپ کی اولاد نے عملِ احتساب جاری رکھا۔ کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ فکرِ اُمیہ کا جس نے نظامِ اسلام کو تہس نہس کر دیا تھا، احتساب کیا جائے تاکہ مسلمان صحیح اسلام سے دُور نہ ہوں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فوجِ یزید سے ایک رات کی مہلت بھی اسی لئے مانگی تھی کہ ہر شخص اپنا احتساب کر لے۔ جسے شہادت کی خواہش ہے وہ ٹھہرا رہے لیکن جو شہادت سے

گھبرا رہا ہے وہ چلا جائے۔ اس سے کوئی تعرض بھی نہ کیا جائے گا۔

یہ عمل احتساب مردوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ حضرت امام حسینؑ کی مستورات نے بھی اس عمل کو جاری رکھا۔ بہنوں کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی کمسن بچی نے بھی ضبطِ نفس کا ایسا مظاہرہ کیا کہ دنیا آج تک انگشت بدنداں ہے۔ پورے مرثیے میں زبان و بیان اور معنی و مفہوم کا ایسا تانا بانا بنا گیا ہے کہ شاعر کے علوئے تخیل کی داد دینا پڑتی ہے۔

۴۵۔ قوم و قومیت

''قوم و قومیت'' نامی مرثیہ ۱۹۹۶ء میں کہا گیا اور ۱۹۹۸ء میں ''العطش'' (جلد دوم) میں شائع ہوا۔ ۶۲ بندوں کے اس مرثیے میں شاعر نے فنی چابکدستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے موضوع پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

''قوم و قومیت'' نامی مرثیے میں شاعر نے انسانی ذات کے تعارف کو عین فطرت قرار دیا ہے۔ شاعر کے نزدیک اللہ تعالٰی نے تو اس کائنات کو اپنی معرفت کے لئے خلق کیا ہے۔

اس مرثیے میں شاعر نے یہ بتایا ہے کہ اکثر رہبرانِ قوم وطن سے قوم کی تشکیل کے قائل ہیں، مگر چونکہ دنیا میں مختلف اوطان ہیں اور وہ مختلف جغرافیائی خصوصیات کے حامل ہیں، اس لئے پوری انسانیت کیلئے ان کا تشکیل کردہ دستور ہر ملک میں رائج نہیں ہو سکتا، اسی طرح زبان، نسل اور خاندان سے بھی ایک قوم معرض وجود میں نہیں آ سکتی۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا میں بھیج کر ان کے ہاتھ میں ایک مکمل دستور دیا جو قرآن کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

شام میں یزید نے احکامِ خدا کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے قومیت کی بنیاد خاندان پر رکھی اور بنی ہاشم کی تمام خدمات صرف نظر کر دیں۔ رسولؐ خدا کے نواسے حضرت امام حسینؑ نے یزید کی اس فکر سے اختلاف کیا اور دنیا کے سامنے قوم اور قومیت کا حقیقی تصور پیش کرنے کیلئے میدانِ کربلا میں آ گئے۔ افواجِ شام نے آلِ محمدؐ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور حضرت امام حسینؑ سے یزید کی بیعت کرنے پر اصرار کیا، مگر حضرت امام حسینؑ نے موت قبول

کر لی لیکن یزیدی اسلام کو رد کر دیا۔ آخری بندوں میں شاعر نے واضح کیا ہے کہ مرنے سے قبل حضرت امام حسینؑ نے اپنے بڑے بیٹے حضرت زین العابدینؑ سے وصیت فرمائی کہ ہر ظلم اور ہر جور برداشت کر لینا لیکن یزیدیت کے پودے کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا۔ اس مرثیے کے تفاہیم پر نظر ڈالنے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ہاشمی صاحب معاشرتی اقدار اور سماجیات کے تمام گوشوں سے بطریقِ احسن واقف ہیں۔

۲۶۔ کربلا کربلا

''کربلا کربلا'' نامی مرثیہ ۱۹۹۵ء میں تخلیق ہو کر ۱۹۹۸ء میں طبع ہوا اور ''العطش'' (جلد دوم) کی زینت بنا۔ یہ مرثیہ ۵۲ بندوں پر مشتمل ہے۔

''کربلا کربلا'' نامی مرثیے میں شاعر نے عصرِ حاضر کے دل و جگر' کمر و نظر بلکہ مکمل بشر کو زخمی قرار دیا ہے۔ شاعر نے اس مرثیے کے ابتدائی بندوں میں معاشرے اور اس میں زندگی بسر کرنے والے انسانوں کی پست ہمتی اور کشاکش کا نقشہ نہایت خوبی اور چابکدستی سے کھینچا ہے۔ شاعر نے بتایا ہے کہ زمانہ حال کا انسان محبت اور اخوت سے دور ہو گیا ہے۔ اس پر خوف اور ہراس کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ معاشرے میں اہل علم کی تذلیل اور جہلا کی توقیر ہو رہی ہے۔ شاعر نے اس پستی کا سبب یہ بتایا ہے کہ نصاریٰ اور یہود نے پوری کاوش سے مسلمانوں کے خلاف اتحاد قائم کر لیا ہے۔ ملک کے غداروں کو جاہ و منصب دے کر خرید لیا گیا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کا خون بہا رہا ہے۔ جن بہادر اور خوددار اشخاص نے ان مغربی حیلہ گروں سے بغاوت کی انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اس کشمکش میں کربلا والوں کو یاد کرنا اور ان کے نقشِ قدم پر چلنا مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل ہے۔ شاعر نے کربلا کو ایک جیتا جاگتا معجزہ اور کربلا کے شہیدوں کو روشنی کا مینار کہا ہے۔

کربلا کے انہی شہیدوں میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا ایک ششماہا بچہ علی اصغر بھی تھا' جو کہنے کیلئے تو ایک بچہ تھا مگر اس کی شہادت نے تاریخِ کربلا کی کتاب کو روشن اور منور کر دیا۔ اس بچے کی جانبازی اور قوتِ برداشت کا تذکرہ شاعر نے نہایت احتیاط اور بلیغ انداز میں

کر کے اپنی قادر الکلامی کا لوہا منوا لیا ہے۔ آخر میں اس صغیر اور کمسن کی شہادت اور شہادت سے پیدا ہونے والے اثرات کا بڑے پر درد انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔

۲۷۔ کشمکش

''کشمکش'' نامی مرثیہ ۱۹۹۵ء میں کہا گیا اور العطش (جلد سوم) میں ۹۸ء میں شائع ہوا۔ یہ مرثیہ کل ۵۸ بندوں پر مشتمل ہے اور ہر بند دوسرے بند سے منسلک ہے۔

''کشمکش'' نامی مرثیے میں شاعر نے ذہن کی اُلجھی ہوئی قوت کو کشمکش قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کشمکش ایک نفسیاتی مضمون ہے، جس کی تشریح ماہرینِ نفسیات نے مختلف انداز میں کی ہے۔ شاعر نے مرثیے کے ابتدائی بندوں میں بتایا ہے کہ انسان کے دل میں کشمکش کیوں اور کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ متعدد وجوہات اور حوالہ جات کے ذریعے مرثیہ نگار نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کشمکش ہمیشہ ظالموں، بدخواہوں، جابروں اور کور چشموں کے قلوب میں جنم لیتی ہے جو پاک اور شفاف قلوب رکھنے والے انسان ہیں، وہ کبھی بھی کشمکش میں گرفتار نہیں ہوتے۔ چونکہ ان کے دلوں کا آئینہ صاف ہوتا ہے، اور ان کی نظروں کے سامنے یقین کامل کی منزل ہوتی ہے، اس لئے ان کا ہر فیصلہ اصولی اور اٹل ہوتا ہے۔

شاعر نے ایک ماہر نفسیات اور بالغ نظر شاعر کی حیثیت سے بڑے خوبصورت انداز میں مرثیے کے تسلسل کو برقرار رکھا اور یہ بتایا کہ کشمکش رکھنے والا کردار یزید تھا اور یقینِ کامل کے حامل حضرت امام حسین علیہ السلام تھے۔ بحیثیت امام نواسۂ رسول کا فرض تھا کہ کوفیوں اور شامیوں کے دلوں میں کشمکش جو فساد پیدا کر رہی ہے، دُور کر کے اصلاح حال کی کوشش کریں۔ اس مقام پر مرثیہ نگار نے یزیدی کردار کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے کہ الفاظ سے کشمکش کی فضا صاف نظر آتی ہے اور یہی شاعر کا کمال ہے۔

اختتامی بندوں میں حضرت امام حسینؑ اپنے منصوبے کو مکمل کرنے کیلئے اپنی بہن جناب زینبؑ اور اپنے بھائی حضرت عباسؑ کو لیکر کربلا جاتے ہیں اور اپنی قربانی پیش کر کے سرخرو ہو جاتے ہیں۔ مصائب میں شدت لانے کے لئے شاعر نے جناب زینبؑ کی ''غم نمر

ن ہے جو آپ نے حضرت عباسؑ کی لاش کے قریب فرمائی تھی۔ اس مقام پر بھی شاعر نے ایسے پُر درد اور زُود اثر الفاظ استعمال کیے ہیں، جن سے سخت دل والا بھی آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

۲۸۔ قیادت

''قیادت'' نامی مرثیہ ۱۹۹۷ء میں تخلیق ہوا اور ۱۹۹۸ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ''العطش'' (جلد سوم) کی زینت بنا۔ یہ مرثیہ ۶۷ بندوں پر مشتمل ہے۔

''قیادت'' نامی مرثیہ میں شاعر نے عصرِ حاضر کی بے کلی و بے حسی پر طنز کے تیر برسائے ہیں۔ شاعر نے انتہائی دردمندی کے ساتھ مرثیے کے ابتدائی بندوں میں حالاتِ حاضرہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ شاعر کے قول کے مطابق آج کا انسان مصائب میں گھرا ہوا ہے۔ اگرچہ طوفان سروں پر آ چکا ہے مگر انسان اس کی آمد سے بے خبر ہے۔ عقل و خرد کی شمع ظلمت کے گھیرے میں آ چکی ہے۔ ہوش و حواسِ انسانی اس قدر مختل ہو چکے ہیں کہ اب آدمی پھول کے بجائے خار کی تکریم کرنے لگا ہے۔ ہر طرف ظلم و شقاوت کا بازار گرم ہے۔ ظالم نے مظلوم کا لباس زیب تن کر لیا ہے اور عدالتی نظام اتنا غیر عدالتی ہو گیا ہے کہ منصف مقتول کو قاتل قرار دے کر اصل قاتل کو رہا کر دیتا ہے۔

شاعر نے اس تباہی اور تکدر کا سبب یہ بتایا ہے کہ معاشرے میں حقیقی قیادت کا فقدان ہے۔ اس وقت نام نہاد قومی قائدین موجود ہیں لیکن ان میں پیغمبرِ اسلام کی قیادت کے کوئی آثار نہیں، شاعر نے نہایت خوبی سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے خاندان کے افراد کو قیادت کے نمونے پیش کر کے ہمیں بتایا ہے کہ قیادت کیا ہوتی ہے اور قائدِ قوم کو کیسا ہونا چاہیے۔

شاعر نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو اس لیے بہترین قائد تسلیم کیا ہے کہ انہوں نے بڑے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ خواہ وہ شہید ہو جائیں، ان کے اعزہ اور احبا قتل ہو جائیں لیکن بدخواہ حکومت کی اصل کو آشکار کر دیا جائے۔ شہادتِ حسینؑ کے بعد قیادت کا یہ

گراں بہا باران کے بیٹے سید سجاد کے کاندھوں پر آ پڑا۔ اگرچہ وہ بیمار تھے اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے تاہم انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ہر ظلم سہہ کر شمعِ قیادت بجھنے نہ دیا۔

اس مرثیے میں شاعر نے حُسنِ ابلاغ کے نادر نمونے اور گوشے پیش کر کے وقارِ مرثیہ نگاری کو بلند تر کر دیا ہے۔

۲۹۔ حقیقتِ موت

''حقیقتِ موت'' نامی مرثیہ ۱۹۹۶ء میں معرضِ تخلیق میں آیا اور ۱۹۹۸ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ''العطش'' (جلد سوم) کی زینت بنا۔ ۵۸ بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

''حقیقتِ موت'' نامی مرثیے میں شاعر نے واضح کیا ہے کہ لوگ موت کو ظلم وستم کی داستان اور کتابِ زیست کا غمگین باب کہتے ہیں۔ شاعر نے اس مرثیے میں رُوح، نفس اور موت کے متعلق قرآن وحدیث اور ماہرینِ نفسیات کے تجزیوں کے پیشِ نظر گفتگو کی ہے۔ ابتدائی بندوں میں عام انسانی جذبات کا تذکرہ ہے جن کے مطابق موت ظلم وتعدی کی نشانی ہے جو ہنستی بستی بستیوں کو برباد کر دیتی ہے۔ ماؤں کی گود سے اولاد چھین لیتی ہے اور کتنی نوعروسوں کا جہیز چھین کر انہیں کفن پہنا دیتی ہے۔ مگر شاعر نے قرآنی دلائل دیکر یہ سمجھایا ہے کہ موت خوف کی علامت نہیں بلکہ انعاماتِ الٰہی میں شامل ہے۔ نیند بھی ایک خاص طرح کی موت ہے، جس میں انسانی نفس بدن سے دُور رہتا ہے لیکن رُوح جسمِ انسانی کی حفاظت کرتی رہتی ہے۔ اگر رشتۂ جان ٹوٹ جانے سے موت آ جاتی تو خدا شہدائے راہِ خدا کو زندہ کیوں کہتا۔

موت کی اصلیت بیان کرنے کے بعد شاعر نے کربلا کے افراد کے احساسات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اصحابِ حضرت امام حسینؑ شبِ عاشور اس لئے مطمئن تھے کہ ان کے دلوں سے موت کا خیال ہی محو ہو گیا تھا۔ حضرت امام حسینؑ شمع گل کر کے انہیں چلے جانے کو کہتے

رہے مگر انصار حسینی موت ہی کو زندگی سمجھ رہے تھے' اس لئے ایک ناصر بھی امام مظلوم کا ساتھ چھوڑ کر نہیں گیا۔

شاعر نے جوانوں' بچوں اور عورتوں کے دلوں کی کیفیات بھی بڑے قرینے سے پیش کی ہیں۔ اکبر و قاسم ہوں' زینب و کلثوم ہوں یا چار سالہ بچی سکینہ سب کے دلوں سے موت کا خیال ختم ہو گیا تھا۔ ان افراد کے موت کے متعلق تصورات کو شاعر نے بڑی فنکاری سے پیش کر کے ان کے کردار کی بلندی کو واضح کیا ہے۔

۳۰۔ جوہرِ تقویٰ

''جوہرِ تقویٰ'' نامی مرثیہ ۱۹۹۴ء میں کہا گیا اور ۱۹۹۸ء میں العطش (جلد سوم) میں شامل کیا گیا۔ ساٹھ بندوں پر مشتمل یہ مرثیہ شاعر کے شخصی مرثیوں کے ذیل میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

''جوہر تقویٰ'' نامی مرثیہ دراصل شخصی مرثیہ ہے۔ گزشتہ صفحات میں یہ بات باور کرائی گئی تھی کہ وحید الحسن ہاشمی کے ہاں شخصی مرثیے کہنے کی روایت بہت تاخیر سے ملتی ہے۔ تاہم یہ بات پیش نظر رہے کہ تاریخی اعتبار سے شخصی مرثیوں کی روایت بہت قدیم ہے اور تقریباً ہر زبان میں شخصی مرثیوں کا وجود ملتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے خود اپنے بیٹے ہابیل کا مرثیہ کہا۔ اُردو میں غالبؔ' حالیؔ اور اقبالؔ کے مرثیے بھی شخصی مرثیوں کے ذیل میں آتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اختتام تک شہدائے کربلا کے اس کثرت سے مرثیے کہے گئے کہ اب مرثیہ شہدائے کربلا سے مختص ہو گیا۔

لکھنؤ میں پہلا شخصی مرثیہ آل غفرانمآب کے متعلق کہا گیا۔ اسی وقت علماء نے یہ فیصلہ دیا کہ چونکہ علمائے حق نائبین امام کا درجہ رکھتے ہیں' اس لئے علمائے حق کا مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔ اسی دور میں نسیمؔ امروہوی مرحوم نے جناب ناصر الملت مرحوم' جناب نجم الملت مرحوم آقائے محسن حکیم جناب سعید الملت مرحوم جوشؔ و آل رضاؔ مرحومین کے مرثیے کہے۔ قیصرؔ بارہوی مرحوم نے نسیمؔ امروہوی مرحوم کا مرثیہ کہا۔

وحید الحسن ہاشمی نے یہ مرثیہ علامہ مصطفیٰ جوہر مرحوم کے متعلق کہا' جس میں مولانا مرحوم کے تقویٰ کا ذکر کیا ہے۔ ابتدائی بندوں میں انسان کے کارناموں کا تذکرہ ہے' لیکن انسان کی موجودہ پریشانی کا سبب تقوے سے گریز بتایا گیا ہے۔ دنیا کو بتایا گیا ہے کہ تقوے کا مرکز اصلی آلِ محمدؐ ہیں' جو لوگ محمد و آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افکار سے منسلک ہیں وہ بھی متقی ہیں۔ علامہ مرحوم مومن بھی تھے' متقی بھی۔ عزائے امام حسینؑ میں انہماک کی وجہ سے آپ کا قلب کربلا بن چکا تھا۔ غمِ حسین علیہ السلام میں روتے روتے آپ کی بینائی بھی خاکِ کربلا کی نذر ہو گئی۔ آخری بندوں میں آپ کی روضۂ امام پر امام مظلوم سے گفتگو نظم کی گئی ہے۔

۳۱۔ آئین (غیر مطبوعہ)

''آئین'' نامی مرثیہ یکم اپریل ۱۹۹۹ء میں شروع ہو کر ۱۲ مئی ۱۹۹۹ء کو مکمل ہوا۔ یہ مرثیہ ۵۰ بندوں پر محیط ہے اور ہنوز زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا ہے۔

سید وحید الحسن ہاشمی نے اس مرثیے کے آغاز میں عصرِ حاضر کے انسان کی بے کسی و بے بسی کو موضوع بنایا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ اب تو وقت کے ماتھے پر بھی صحرائے الم کی دھول اٹی ہوئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب وہ وحشتوں اور مصیبتوں سے گھبرا کر کسی پر سکون جگہ کا متمنی ہے۔ شاعر احساس دلاتا ہے کہ عصرِ حاضر کے انسان کی پریشاں حالی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انسان نے ''آئین'' سے اپنا رابطہ توڑ لیا ہے۔

یہ جو راہوں میں مہیا موت کا سامان ہے
یہ نہیں قہرِ خدا آئین کا فقدان ہے

شاعر آئین کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے ذہن کی نشوونما کا سلسلہ' دستِ فطرت کا تراشا ہوا راستہ' حفظ امن عامہ کا ضابطہ اور عصرِ حاضر کے ہر مرض کی دوا قرار دیتا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ جو شخص آئین فطرت توڑ دیتا ہے وہ خدا و رسولؐ اور عوام کی نگاہ میں حقیر ہو جاتا ہے۔ لوگ اسے آمر قرار دیتے ہیں اور وہ آمریت اور فرعونیت کا لبادہ اوڑھ کر دنیا و آخرت میں رسوا ہو جاتا ہے۔ شاعر کرب و بلا کے میدان میں امام عالی مقام کی تشریف

آوری کو آئین حق کی بالادستی کا ایک سبب قرار دیتا ہے۔ شاعر احساس دلاتا ہے کہ یزید اور اس کے ساتھی آئین خدا و رسولؐ کو تباہ کرنا چاہتے تھے لیکن امام عالی مقام نے ہر قسم کی سختی تو برداشت کر لی لیکن آمریت و تمرد کے سامنے سر نہیں جھکایا آخر میں شاعر نے امام حسین علیہ السلام اور سید سجادؑ کی آخری ملاقات کے دلخراش مناظر کی عکاسی کی ہے۔

۳۲۔ احساس (غیر مطبوعہ)

سید وحید الحسن ہاشمی کا غیر مطبوعہ مرثیہ ''احساس'' یکم مارچ ۱۹۹۹ء سے شروع ہو کر دوسری مئی ۱۹۹۹ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ یہ مرثیہ ستاون بندوں پر مشتمل ہے۔

شاعر نے احساس کو حیات بشر کی اساس، نقیب دل، خیال و خواب کے لشکر کا اوج، ملک تن میں علمدار فوج، اعصاب کی نماز کا امام، کلفتوں کی دھوپ کا سائبان، ذہن کی محراب کی اذان، جلوۂ رخ تابانِ زندگی، انسانیت کی آس، وفا شناس، آغوش ذہن میں بے حرف کی کتاب اور روشن ضمیر قرار دیا ہے۔ شاعر کا واضح موقف یہ ہے کہ

جب منحرف ہے دانۂ احساس دین سے
پھر تو یزیدیت ہی اُگے گی زمین سے

شاعر یقین دلاتا ہے کہ جب کسی فرد میں سے احساس گم ہو جاتا ہے تو وہ اپنے مقام و مرتبہ کو بھول کر احساس رکھنے والوں کو نقصان پہنچانے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ کربلا کے میدان میں امام عالی مقام اور ان کے بے مثل و بے مثال ساتھیوں نے احساس کی بقا کے لیے اپنی جان بھی قربان کرنے سے گریز نہ کیا۔ شاعر نے اس موقع پر بطور خاص حضرت عباس علمبردارؑ کی بے مثال قربانیوں کو موضوع بنایا ہے۔ آخر میں شاعر نے انتہائی ملال انگیز اسلوب میں حضرت عباس علمبردار کی شہادت پیش کی ہے۔ موضوع کے حوالے سے یہ شعر مرثیے کا مرکزی شعر قرار دیا جا سکتا ہے۔

سرداریاں یہ فرض کے احساس سے ملیں
احساس کو بلندیاں عباسؑ سے ملیں

۳۳۔ زمانہ (غیر مطبوعہ)

''زمانہ'' نامی مرثیے کا تخلیقی دورانیہ یکم مارچ ۲۰۰۲ء سے شروع ہوکر تیئس اپریل پر ختم ہو جاتا ہے۔ چھپن بندوں کو محیط یہ مرثیہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

سید وحید الحسن ہاشمی نے اس مرثیے میں زمانے کی تخلیق، اہمیت اور ارتقائی سفر پر بہت دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ نمود (کُن) کی عطا سے زمانے کا سفر شروع ہوتا ہے اور کمال یہ ہے کہ اس کی وسعت کا آج تک کوئی اندازہ نہیں کر سکا ہے۔ زمانے کی حقیقی معرفت کا کوئی دعویدار نہیں ہے۔

نہ اس کی کوئی زمیں ہے نہ آستانہ ہے
نظر کہیں نہیں آتا مگر زمانہ ہے

شاعر کا موقف یہ ہے کہ زمانہ زخمی دلوں کا مرہم، ارمغان طرب، شور ماتم، سوزِ شعلہ، بالیدگی شبنم، طاقت کا مرقع، خدا کے امر کی منفرد نشانی، سحرِ اوج خیالات کی نشانی، تہذیب زندگی کا نکھار اور پیکر جمال ہے۔ زمانے کو اہلِ دنیا وقت، دورِ مدام، گردش مدام، ماہ و سال، شام و سحر اور رات دن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ شاعر دوٹوک انداز میں واضح کرتا ہے کہ زمانہ صرف اور صرف امام زمانہ کا پابند ہوتا ہے اور ان کے اشارے کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھتا۔

جو حق کا خاص بلاوا تھا اک بشر کے لیے
زمانہ رُک گیا سرکارؐ کے سفر کے لیے

شاعر نے زمانے کی اہمیت اور کارگزاریوں کے مختلف رنگ روپ بیان کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ زمانے کی تخلیق کا اصل سبب کرب و بلا کے میدان میں اس کی قدر و منزلت میں اضافہ تھا۔ کربلا کے میدان میں زمانے کے جلو میں بلاؤں کا قافلہ آیا لیکن امام حسینؑ نے زمانے کا فسوں توڑ دیا اور زمانے نے امام عالی مقام کے قدموں کی خاک چھونے کا شرف حاصل کیا۔ شاعر نے آخر میں امام حسینؑ کے مصائب بڑے دلگداز انداز میں بیان کیے ہیں۔ خاص طور پر امام حسینؑ اور بی بی سکینہؑ کی گفتگو دلوں کو غم زدہ کر دیتی ہے۔ امام

عالی مقام کی شہادت کے مناظر ہمیں کرب و بلا کے میدان میں پہنچا دیتے ہیں۔ خاص طور پر تنہائی کے عالم میں امام عالی مقامؑ کا اپنے فرس سے یہ کہنا اہل دل کے لیے باعث صد الم ہے

مجھے خبر ہے کہ تجھ پر بھی پیاس طاری ہے
مگر فرس یہ مری آخری سواری ہے

۳۴۔ احتجاج (غیر مطبوعہ)

سید وحید الحسن ہاشمی کا یہ چونتیسواں مرثیہ تیس اپریل ۲۰۰۰ء کو شروع ہو کر دس مئی ۲۰۰۰ء کو ختم ہوا۔ یہ مرثیہ ۵۲ بندوں پر مشتمل ہے اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

سید وحید الحسن ہاشمی نے مرثیے کے آغاز میں ''فکر'' کی عظمت کے مختلف روپ اُجاگر کیے ہیں۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ وہ فکر انتہائی نڈر اور بے باک ہے۔ نظام دہر میں اس کا مشاہدہ دشوار ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج تک نہ تو کوئی اس کی تیزئ رفتار ناپ سکا ہے اور نہ کوئی اس کے بے درو دیوار مکان تک رسائی حاصل کر سکا۔

یہ فکر روز قدم بحر و بر پہ دھرتی ہے
نڈر ہے اتنی اکیلے سفر یہ کرتی ہے

شاعر کا موقف یہ ہے کہ یہی فکر جب انسان پر منفی اثر ڈالتی ہے تو اس کے نفس میں گمان کی چنگاری روشن ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال میں مخلوق ایسے شخص کی انانیت کا جواب دینے لگتی ہے اور اہل نظر اسے ''احتجاج'' کہتے ہیں۔ شاعر کے نزدیک احتجاج کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک احتجاج منفی ہوتا ہے جس میں حق بات کی نفی کی جاتی ہے تاہم یہ احتجاج خدا اور رسول کو کسی بھی صورت میں پسند نہیں ہے۔ احتجاج کی دوسری شکل یہ ہے کہ حق بات کے حصول کے لیے جہاں اور جیسے ممکن ہو احتجاج کیا جائے۔ شاعر کے نزدیک یہی سنتِ رسول اور یہی اسوۂ حسینؑ ہے۔ شاعر کے خیال میں امام حسینؑ کے احتجاج کا طریقہ حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے طریقوں کی طرح منفرد تھا۔ انہوں نے کرب و بلا کے میدان میں احتجاج کا جو رویہ اپنایا وہ لوحِ تاریخ پر آج بھی تاباں ہے۔ امام عالی مقام کے انوکھے احتجاج کو شاعر نے درج ذیل بند میں سمیٹ

دیا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

امامؑ نے یہ کیے احتجاج کے ساماں
پسر کا سینہ ہو زخم حیات کا درماں
سنبھالے بازوئے عباسؑ حق کا بارِ گراں
گلوئے اصغرِ ناداں ہو فتحِ دیں کا نشاں

بچائے زینبؑ مضطر حرم کو اُلجھن سے
ستم کی آگ سکینہ بجھائے دامن سے

مرثیے کے آخر میں شاعر نے حضرت امام حسینؑ کے عملی احتجاج کے روپ جہاد فی سبیل اللہ کی شکل میں اُجاگر کیے ہیں۔ امام عالی مقامؑ کی احتجاجی شہادت کے بعد احتجاج کا یہ سلسلہ زینبؑ و سکینہؑ نے شام کے دربار میں جاری رکھا۔ شاعر نے دلگداز انداز میں بی بی سکینہؑ کی شہادت کے اندوہناک منظر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر صاحب دل اشکبار ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس مرثیے کی آخری بیت ملاحظہ فرمائیے جس میں شاعر نے پورے مرثیے کا نفس مضمون بیان کر دیا ہے۔

خلافِ شر جو ہوا کل وہ آج بھی ہو گا
جہاں ہے ظلم وہیں احتجاج بھی ہو گا

۳۵۔ اعتماد (غیر مطبوعہ)

''اعتماد'' نامی مرثیہ ساٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ یہ مرثیہ چوبیس فروری ۲۰۰۱ء سے شروع ہو کر ۲۴ اپریل ۲۰۰۱ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ یہ مرثیہ ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا ہے۔

سید وحید الحسن ہاشمی کا اختصاص یہ ہے کہ وہ مختصر مرثیہ کی بنیاد کسی نادر موضوع پر رکھتے ہیں اور پھر اس موضوع پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔ زیرِ نظر مرثیہ کا بنیادی موضوع اعتماد ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ اعتماد وہ عظیم قوت ہے جس کی مدح سرائی کرنے والوں میں خود

خدا بھی شریک ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری زندگی میں اعتماد کا رتبہ بہت بڑا اور وقیع ہے اور اسی لیے شاعر نے اسے انسانیت کے باغ کا تازہ گلاب قرار دیا ہے۔ شاعر کے نزدیک ''اعتماد'' انسانیت کا جوہر قابل' دریائے عقل وفہم کا ساحل' راہ زیست کی منزل' کتاب زیست کی آیت' عمر رواں کی زندہ حقیقت' خودداری عمل کی علامت اور حق کی آہنی قوت ہے۔ شاعر کے نزدیک یہ اعتماد ہی کی قوت ہے جو انسان کو مافوق البشر بنا دیتی ہے اور جب یہی قوت انسان کے اندر سے ختم ہو جاتی ہے تو وہ دین و دنیا کہیں کا نہیں رہتا۔ شاعر نے درج ذیل بند میں ''اعتماد'' کا بھرپور طریقے سے تعارف کرایا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

آب و ہوائے علم میں پھلتا ہے اعتماد
انگلی پکڑ کے علم کی چلتا ہے اعتماد
پا کر متاع علم مچلتا ہے اعتماد
ہر نمودِ علم میں ڈھلتا ہے اعتماد
کتنی یہ اعتماد کی دنیا حسین ہے
آنکھوں میں نور علم ہے دل میں یقین ہے

شاعر کے نزدیک کرب و بلا اعتماد کی آخری منزل ہے اور اسی لق و دق صحرا میں کتاب اعتماد مکمل ہوئی۔ آخر میں شاعر نے بی بی زینب سلام اللہ علیہا کے دو صاحبزادوں حضرات عون و محمد کی پر اعتماد جنگ کے ہوشربا مناظر دکھائے ہیں اور ان کی شہادت کے بعد بی بی زینبؑ کے اندوہناک بین پیش کیے ہیں۔ آخر میں مرثیے کے حزنیہ رنگ نے ایک غم زدہ کیفیت پیدا کر دی ہے جو اس مرثیے کی جان ہے۔

۳۶۔ ارتقاء (غیر مطبوعہ)

سید وحید الحسن ہاشمی کا غیر مطبوعہ ۳۶ (چھتیسواں) مرثیہ ''ارتقا'' ۲۴۔ اپریل ۲۰۰۱ء کو شروع ہو کر ۲۰ مئی ۲۰۰۱ء کو پایہ تکمیل کو پہنچا۔

سید وحید الحسن ہاشمی نے اس مرثیے کا آغاز اس جلال انگیز صورت حال سے کیا ہے

کہ ان دنوں ہر لمحۂ حیات پریشاں' تہذیب عصر خود سے گریزاں' صحرا کا نام صحن گلستاں' حاکم کا حکم عین شریعت' رنگ جہالت مقبول عام' جہل سے پندار زخمی' زیست کا معیار کمتر' مغرور اپنے جہل پہ نازاں' سائل بخی کے فعل کا ناقد' شاعر ناواقفِ عروض' جابر ہر اختیار پر قابض اور حد یہ ہے کہ پورا ماحول صبر و شکر سے قاصر ہے۔ شاعر نے ارتقاء کی تعریف بڑے دلپذیر انداز میں کی ہے اور احساس دلایا ہے کہ اہل دنیا کے نزدیک انسان بڑی سرعت کے ساتھ ارتقا کی منازل طے کر رہا ہے۔ ایک بند آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

آلے میں علم و فن کی ہے خو ارتقا یہ ہے
شیشہ ہوا ہے زیب گلو ارتقا یہ ہے
بجلی سے شب ہے آئینہ رو ارتقا یہ ہے
پتھر میں جاگ اٹھی ہے نمو ارتقا یہ ہے

انسان قد کو اور بڑھانے کے واسطے
پر تولتا ہے عرش پہ جانے کے واسطے

شاعر احساس دلاتا ہے کہ اہل دنیا جس کو ارتقا کہہ رہے ہیں وہ عارضی ہے۔ یہ سطحی ارتقا نسل آدمؑ کے لیے نقصان دہ ہے۔ شاعر کے نزدیک معراج ارتقاء یہ ہے کہ بشر اپنی حقیقت سمجھے اور ان نفوس طاہرہ کی اقتدا کرے جو اس کائنات رنگ و بو پر اللہ تعالیٰ کے مظاہر ہیں۔ شاعر نے امام حسینؑ عالی مقام کی خدمات کو بڑے سلیقے اور پروقار انداز میں بیان کیا ہے اور احساس دلایا ہے کہ نجات بشر صرف اور صرف حسینؑ کی تقلید کے نتیجے میں ممکن ہے۔

بے چین کوئی کرتا ہے جب دل کے چین کو
بے ساختہ پکارتے ہیں سب حسینؑ کو

آخر میں شاعر نے کرب و بلا کے میدان میں امام عالی مقام کی شہادت کے بعد ہونے والے المناک اور دل گداز واقعات بیان کیے ہیں۔ خاص طور پر مقتل گاہ میں حضرت زینبؑ کے بین ہماری آنکھوں میں آنسو لانے کے لیے کافی ہیں۔

۳۷۔ ماحول

''ماحول'' نامی مرثیہ یکم دسمبر ۲۰۰۲ء سے شروع ہو کر ۱۶ جنوری ۲۰۰۳ء کو اختتام پذیر ہوا۔ ۵۶ بندوں پر مشتمل وحید الحسن ہاشمی کا یہ مرثیہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

سید وحید الحسن ہاشمی نے مرثیے کے آغاز میں ماحول کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ شاعر کے نزدیک ماحول کا اثر بحر و بر پر ہر جگہ ہے۔ ماحول کے وجود پر روشنی ڈالتے ہوئے شاعر رقمطراز ہے۔

اس کا وجود فکر و نظر کا ہے آئینہ
اس کی روش مزاجِ بشر کا ہے آئینہ
اس کا کمال دستِ ہنر کا ہے آئینہ
اس کا ظہور شام و سحر کا ہے آئینہ

ماحول خود طراز بھی ہے مستند بھی ہے
اس کا غلام ازل ہی نہیں ہے ابد بھی ہے

شاعر کا موقف یہ ہے کہ ماحول کے قفس میں زمانہ اسیر ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کا ماحول خراب ہے تو اس کی اولاد پر بھی اس کا منفی اثر پڑتا ہے۔ وہ ماحول کو منفی راہ پر چلانے کی سعی کرتا ہے۔ جب حالات ایسے شخص کی مدد کرتے ہیں تو وہ خدا کی عنایات کو بھی رد کر دیتا ہے۔ شاعر کے نزدیک اس طرز احساس کا سب سے بڑا نمائندہ یزید تھا۔ یزید نے اسلام کا چراغ بجھانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اس نے جھوٹی تاویلات اور روایات کا سہارا لے کر محمدؐ و آل محمدؐ کی خدمات کو جھٹلانے کا منصوبہ بنایا۔ امام حسینؑ نے یزید کے مذموم ارادوں کو بھانپ لیا لہٰذا اللہ و رسول کا یہ خصوصی نمائندہ ماحول کی کثافتیں دور کرنے کے لئے کرب و بلا کے میدان میں پہنچ گیا۔ شاعر کربلا کی حقیقت آشکار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اسلام کے جہاد میں شامل ہے کربلا
تختِ شہی کے مدمقابل ہے کربلا

کھل کر عدوئے چہرۂ باطل ہے کربلا
ہر دور کے یزید کی قاتل ہے کربلا

یہ منزلت عقیدۂ اہل عزا میں ہے
جنت میں جو سکوں ہے وہی کربلا میں ہے

کرب و بلا کے میدان میں جہاں ایک طرف امام عالی مقام اور ان کے عزیز و اقارب پر بے شمار ستم ڈھائے گئے وہاں اہلبیت رسولؐ کے مصائب بھی بے حد المناک ہیں۔ آخر میں شاعر نے حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی شہادت حسینؑ کے بعد بے کسی و بے بسی کو رقت انگیز پیرائے میں اُجاگر کیا ہے۔

۳۸۔ جلوۂ سخن

سید وحید الحسن ہاشمی کا اڑتیسواں مرثیہ ''جلوۂ سخن'' ۲۰ جنوری ۲۰۰۳ء سے شروع ہو کر ۱۲ اپریل ۲۰۰۳ء کو ختم ہو گیا۔ یہ مرثیہ ابھی تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔ اس کے کل بند ۷۵ ہیں۔

سید وحید الحسن ہاشمی نے اس مرثیے کا آغاز فلسفیانہ سطح کے استفسار سے کیا ہے کہ ''وجود حق جو نہ ہوتا تو ہم کہاں ہوتے''؟ اس سوال کے بعد شاعر نے اثبات خدا کے لیے کئی براہین وضع کیے ہیں۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ خالق کی رضا کے بغیر دہر کی تخلیق، سینۂ گیتی پہ فلک کی تشکیل دیدۂ انجم کی ضیا باریاں، سورج کی رعنائیاں، کلی کا نمو پذیر ہونا، ہواؤں کا اٹھلانا، پہاڑوں میں قوت قرار کا بیدار ہونا، شجروں کا قیام، ابر و باراں کو ذوق سفر، روز و شب کا ظہور، جبین مہر سے نور کا ظہور اور صحیفۂ ابدی کا نزول ممکن ہی نہیں۔ شاعر نے احساس دلایا ہے کہ خالق نے ''محسن'' کا لفظ کہہ کر اپنے ناطق ہونے کا اعلان کیا اور محمدؐ و آل محمدؐ اس کے نطق کے گواہ بن گئے۔ ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔

اسی کی کن کی صدا سے ہے ابتدائے سخن
سنا ازل کے حجابات نے صدائے سخن
بنی ازل ہی کے دن اک محل سرائے سخن

نبیؐ و آلِ نبیؑ ہو گئے خدائے سخن
سخن شناس بنے حق کے خیر خواہ بنے
ازل میں نطقِ خدا کے یہی گواہ بنے

شاعر نے سخن کے کئی رنگ روپ بیان کیے ہیں۔ جب یہی سخن شاعر میں در آیا تو غزل، قصیدہ، مثنوی اور نظم جیسی اصناف وجود میں آئیں تاہم شاعر کے نزدیک ان اصناف میں مرثیے کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ ہر عہد کے لوگ اس صنف کو پسند کرتے رہے ہیں۔ شاعر کے نزدیک اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس پر محمدؐ و آلِ محمدؑ کی رحمتوں اور برکتوں کا سایا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جناب فاطمہؑ خود شوق سے مرثیہ سنتی ہیں۔ شاعر کے نزدیک مرثیے کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ۔

اذانِ مرثیہ جس دم سنائی دیتی ہے
رگِ یزید سسکتی دکھائی دیتی ہے
مدد جو فن کو سپاہ رسائی دیتی ہے
ہر ایک صنف کی دنیا دہائی دیتی ہے
حروفِ غیر نسب کی روش مٹاتا ہے
یہ مرثیہ ہے جو کھوٹا کھرا بتاتا ہے

شاعر کا موقف یہ ہے کہ امام حسینؑ دنیا میں دینِ الٰہی کے علمدار ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب اس دین پر چاروں طرف سے اغیار نے حملہ کیا تو امام عالی مقام اپنے خاندان کے ساتھ کرب و بلا کے میدان میں تشریف لے آئے اور اس ریگزارِ کربلا پر اپنے لہو سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ نقش کر دیا۔ آخر میں شاعر نے امام عالی کی شہادت کے بعد اہلبیت عظام کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کو انتہائی درد انگیز اسلوب میں بیان کیا ہے۔ خاص طور پر جناب سکینہؑ کے بین اتنے رقت انگیز ہیں کہ قاری کے لیے آنسو ضبط کرنا محال ہو جاتا ہے۔ آپ بھی ایک بکائیہ بند ملاحظہ فرمایئے۔

قریب جا کے یہ ماں سے کہا کہ اے اماں
وہ چاند آپ کی آغوش کا چھپا ہے کہاں
کہیں نہ صدمۂ تنہائی سے ہو قلب تپاں
کسی سے کہیے کہ اصغر کو لے کے آئے یہاں

وہ تشنہ لب تھا جو گودی میں اپنے پاؤں گی
گلے کو چوم کے پانی اسے پلاؤں گی

....

(۳)

بیسویں صدی کے آغاز ہی میں مختلف تاریخی' سیاسی' سماجی اور معاشی اسباب کی بنا پر برصغیر پاک و ہند کے معاشرے میں شکست وریخت کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ اس حوالے سے پہلے ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی رائے ملاحظہ فرمایئے

> ''......انگریز حاکم ہندوستان کی محکوم اور ''وحشی'' رعایا کو زیادہ سے زیادہ ''متمدن'' بنانا چاہتے تھے تاکہ ان کا معیار زندگی اعلیٰ سطح پر آجائے اور نتیجۃً وہ ان اشیائے تجارت کی کھپت کر سکیں جو انگلستان کی ملوں میں تیار ہوتی ہیں۔'' (۴۴)

اس معاشرتی بے کلی اور ٹوٹ پھوٹ کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پورے معاشرے میں اب کیا ہو گا......؟؟؟ کے اندیشے پائے جانے لگے۔ اس صورت حال نے دوسرے دوائر کی طرح ادب کے دائرے کو بھی متاثر کیا۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق کے اجرا سے اپنے تئیں معاشرے کو سدھار لیا جبکہ حالی نے مسدس حالی لکھ کر تہذیب الاخلاق کی منظوم شرح کر کے سرسید سے حق دوستی ادا کر دیا۔ (۴۵) آپ اس دور کے شعر و ادب کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا

---

(۴۴) سجاد باقر رضوی' ڈاکٹر ''معروضات'' لاہور: پولیمر پبلی کیشنز' ۱۹۹۸ء' ص ۲۲

(۴۵) عبداللہ' سید' ڈاکٹر ''وجہی سے عبدالحق تک'' لاہور: خیابان ادب' ۱۹۷۷ء' (طبع دوم) ' ص ۱۱۵

ہے کہ گومگو اور پژمردہ صورت حال کے سبب سے شعر و ادب میں ایک طرف تو مایوسی' اضمحلال اور تھکن کا لہجہ ظاہر ہوا اور دوسرے رخ پر اس کے ردعمل میں ایک تند و تیز' گھمبیر اور دبنگ لہجہ معرضِ وجود میں آ گیا۔ ان دونوں لہجوں کا مطالعہ کیجیے تو یہ ایک ہی جیسے حالات کا نتیجہ ہوں گے۔ اس زمانے میں سیاسی اور معاشی صورت حال کی وجہ سے شعر و ادب میں بھی ایک زبردست مزاحمت اور احتجاج کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی (۴۶)۔ بیشتر اصناف اپنا اپنا چولا بدل رہے تھے۔ چنانچہ مرثیے نے بھی عصری مسائل کو جذب کیا۔ (۴۷) یہی سبب ہے کہ بیسویں صدی کے بیشتر مسائل آپ کو اس زمانے کے مرثیوں میں ضرور ملیں گے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ہلال نقوی کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیے:

> ''...... بیسویں صدی میں مرثیے کا نیا سفر برصغیر کے اس زوال پذیر معاشرے کی دہلیز سے شروع ہوتا ہے جس میں فیوڈل سسٹم کے نئے جال بنے جا رہے تھے اور انگریزوں کی حاکمیت اس خطے میں اپنے نظام فکر کے بیج بو رہی تھی۔ (۴۸)''

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ خوش بختی سے اس تحریک کو ابتداء ہی میں اکابر شعراء کا قلمی تعاون حاصل ہو گیا۔ اس تحریک کے دیگر بنیادی مقاصد کے علاوہ ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ شعر و ادب کو زندگی کے مسائل اور معاملات کی ترجمانی کرنا چاہیے تا کہ شعر و ادب عوام الناس میں فکری انقلاب کا ذریعہ بن سکے۔ اس طرزِ احساس نے ہر صنف میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت کا احساس پیدا کیا۔ اسی سوچ نے پہلی مرتبہ مرثیے میں بعض انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت کا احساس دلایا۔ لہٰذا اس سلسلے میں نجم آفندی' آلِ رضا' جوش ملیح آبادی'

---

(۴۶) اعجاز نقوی' ڈاکٹر ''انیس ایک مطالعہ'' لاہور: مکتبہ میری لائبریری' ۱۹۸۲ء' ص ۲۳

(۴۷) محمد حسن' ڈاکٹر ''ادبی سماجیات کے نقطۂ نظر سے مرثیے کا مطالعہ'' مشمولہ رثائی ادب' کراچی' اپریل ۲۰۰۲ء' ص ۲۳

(۴۸) ہلال نقوی' ڈاکٹر ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' کراچی محمدی ٹرسٹ' ۱۹۹۴ء' ص ۷

جمیل مظہری اور نسیم امروہوی نے اپنے اپنے مزاج' طبائع اور صلاحیتوں کے مطابق صنف مرثیہ میں فکری انقلابات برپا کیے۔(۴۹) اس سلسلے میں خاص طور پر آلِ رضا نے مرثیے کے مزاج و مذاق میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کرنے کی کوشش کی جب کہ جوش ملیح آبادی نے افکار کے ساتھ ساتھ مرثیے کے اسلوب میں بلند آہنگی' طنطنہ اور خطابت کا زور پیدا کیا جسے رثائی ادب میں قابلِ قدر اضافہ قرار دیا گیا۔(۵۰) اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ آلِ رضا اور جوش ملیح آبادی نے مرثیے کی صنف کو نئے ذائقوں سے روشناس کرایا اور مرثیے کو شہادتِ حسینؑ کے بکائیہ بیان کی تنگنائے سے نکال کر شہادتِ حسینؑ کے مقصدی اور افادی پہلوؤں کی طرف لگایا۔ مرثیے کی تاریخ میں یہ ایک ایسا فکری وفنی اجتہاد ہے جس نے مرثیہ نگاری کے فن میں ایک توانا جہت کا اضافہ کیا۔(۵۱)

عصرِ حاضر کے انحطاط پذیر معاشرے میں اخلاقی قدروں کی آبیاری کرنا جہاد سے کم نہیں ہے۔ مخرب اخلاق رسوم و رواج نے لوگوں کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیا ہے۔ افراد معاشرے اور معاشرہ فرد سے لاتعلق ہو کر رہ گیا ہے۔ اس صورتِ حال میں بھی کچھ ایسے حساس اور دردمند دل رکھنے والے تخلیق کار موجود ہیں جو اپنے خونِ جگر کی کاوشوں سے فرد' معاشرہ اور اخلاق کے مثلث کو مضبوط بنانے میں مصروف ہیں۔ ان چنیدہ افراد میں سید وحید الحسن ہاشمی بھی ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب کی آبیاری میں مصروف ہیں اور اپنی جملہ تخلیقات کو حق و صداقت کے فروغ کے لیے وقف کر چکے ہیں۔(۵۲)

سید وحید الحسن ہاشمی نے شعر و ادب کو اپنے نظریات کی ترسیل کا وسیلہ بنایا ہے۔ ادبی

---

(۴۹) نواز حسن زیدی' ڈاکٹر سید' نجم آفندی۔ فکر و فن' لاہور: الحسن پبلی کیشنز' ۲۰۰۰ء' ص ۲۸۹

(۵۰) عاشور کاظمی' سید' مرثیہ نظم کی اصناف میں' دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس' ۱۹۹۶ء' ص ۱۳

(۵۱) مسیح الزمان' پروفیسر ''اُردو مرثیے کے لافانی نقوش'' مشمولہ جدید فن مرثیہ نگاری (مرتبہ) سید وحید الحسن ہاشمی' لاہور: مکتبہ تعمیر ادب' ۱۹۶۷ء' ص ۳۳

(۵۲) عباس رضا' وحید عصر' لاہور: الحسن پبلی کیشنز' ۱۹۹۸ء' ص ۱۴

نوعیت کے مضامین لکھ کر انہوں نے فکری اعتبار سے تنقید کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ شاعری میں انہوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں تاہم ان کے فکری جوہر نعت' مرثیہ' منقبت اور سلام میں کھل کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وحید الحسن ہاشمی ان اصناف سے اس قدر وابستہ کیوں ہیں؟؟

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ عقیدے کی شاعری سطحی جذبات کی نمائندگی کرتی ہے اور فنی اعتبار سے کمزور ہوتی ہے۔ یہ طرز فکر انتہائی غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی عظیم شاعری مذہبی معتقدات سے مالا مال ہے۔(۵۳) یونان' انگلستان اور ہندوستان کی عظیم تہذیبوں کی جڑیں مذہب سے پیوست ہیں۔ یہی سبب ہے کہ یہاں کی شاعری پر بھی مذہب کے گہرے اثرات تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح فنی اعتبار سے ہندوستان میں جن شعراء کو قبولیت عام و خاص کا درجہ حاصل ہے وہ بھی مذہبی رجحانات کی حامل شاعری کرتے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی معتقدات کی پیش کش سے یہ شعراء اخلاقی موعظت کرتے ہیں۔ سید وحید الحسن ہاشمی نے مذہبی معتقدات کی شاعری کو اصلاح معاشرہ کا ایک ذریعہ بنایا ہے اور احمد ندیم قاسمی کے بقول وحید الحسن ہاشمی نے عقیدے اور فن کو نہایت توازن سے اپنی شاعری میں جگہ دیکر منفرد مقام حاصل کیا ہے۔(۵۴)

سید وحید الحسن ہاشمی جدید مختصر مرثیہ کے پیشرو ہیں۔ انہوں نے عصرِ حاضر کے مرثیوں کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ دور کے بیشتر شعراء نے ان کی تحریک سے متاثر ہو کر اپنے مرثیوں کو مختصر بھی کیا اور فکری اور فنی اعتبار سے ان میں ندرتیں بھی پیدا کیں۔(۵۵) ہاشمی صاحب کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ انہوں نے

---

(۵۳) سجاد باقر رضوی' ڈاکٹر (دیباچہ) طاہرین (سید وحید الحسن ہاشمی)' لاہور: سفینہ پبلی کیشنز' ۱۹۸۸ء' ص ۱۰

(۵۴) احمد ندیم قاسمی' العطش (جلد اول)' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز' ۱۹۸۹ء' ص فلیپ

(۵۵) عبدالکریم خالد' پروفیسر "تہذیب و ادب کی زندہ علامت" ماہنامہ "خواجگان" لاہور' مارچ ۲۰۰۱ء' ص ۱۷

اپنے مرثیوں کو زمانے کی آواز میں شامل کیا اور فنی و فکری حوالے سے اس صنف کو با اعتبار بنایا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے مرثیوں میں زندگی بسر کرنے کے اعلیٰ اخلاقی اصول فراہم کر کے اس بے راہ رو معاشرے کو راہ راست پر ڈالنے کی کوشش کی۔ سید وحید الحسن کی رثائی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ جدید مختصر مرثیے کے موجد ہیں اور جب تک صنف مرثیہ زندہ ہے وحید الحسن ہاشمی کا نام بھی زندہ رہے گا۔

وحید الحسن ہاشمی اس لحاظ سے قابلِ توجہ مرثیہ نگار ہیں کہ ان کے مرثیوں میں جوشؔ اور آلِ رضاؔ کے فنی و فکری محاسن یکجا ہو گئے ہیں۔ وحید الحسن ہاشمی جوشؔ ملیح آبادی کے پرستار اور آلِ رضاؔ کے عزیز شاگرد ہیں۔ اسی سبب سے ان کی شاعری دو متنوع ذائقوں کا حسین اور دلچسپ مرقع بن گئی ہے۔ وحید الحسن ہاشمی جوشؔ کی طرح استعماری قوتوں کے سخت خلاف ہیں۔ انہوں نے اپنے مرثیوں میں استعمار کی پھیلی ہوئی سازشوں کو بے نقاب کرنے کی جو کوشش کی ہے اس نے ان کے شعری مقام و مرتبہ کو نہایت بلند کر دیا ہے۔ استعماری قوتوں کے خلاف شعری محاذ آرائی پر جوشؔ ملیح آبادی کا ہاشمی صاحب کے فن پر واضح اثر دکھائی دیتا ہے۔ مختلف مرثیوں سے سرسری طور پر انتخاب شدہ بند ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ کس طرح وحید الحسن ہاشمی نے جوشؔ کی تقلید میں ملوکیت' بادشاہت اور استعماریت کے خلاف اپنے نظریات پیش کیے ہیں:

اسلام کے لباس میں شاہی تھی جلوہ گر — دینِ خدا تھا دستِ حکومت میں بے اثر
دھندلا گئی تھی شام میں قرآن کی نظر — بیٹھا تھا کفر مسندِ آلِ رسولؐ پر
بس اک نظر سے وقت کے فرعون کٹ گئے
زینبؑ بڑھی تو کفر کے سائے سمٹ گئے

(مرثیہ: ناموسِ وفا)

....

اب پیکرِ یزید میں اُبھرا غرورِ شام — اب ظلمتوں کے سنگ تھے اور زندگی کا جام
بولا غبار چاہیے سورج سے انتقام — اب کربلا کا دشت تھا اور وقت کا امام

مغلوب پا کے حوصلۂ مشرقین کو
اب زندگی پکار رہی تھی حسینؑ کو

(مرثیہ: زندگی)

....

ہر ظلم کا انجام ہے ظالم کی تباہی جاگے گا جب انسان تو بکھر جائے گی شاہی
چھو سکتی نہیں نور کو ظلمت کی سیاہی میزان کی عظمت ہے فقط عدلِ الٰہی
تہذیب کے ہر دور میں بدنام رہے گی
ہو گی نہ وہاں صبح، جہاں شام رہے گی

(مرثیہ: زنجیرِ سفر)

....

سجادؑ نے اس فکر کے جادو پہ کیا وار دیکھا سوئے حاکم تو لرزنے لگا دربار
شبیرؑ کے چہرے پہ نظر، لب پہ یہ گفتار زنجیر ہلائی تو ہلا مجمعِ کفار!
حاکم کا کوئی حکم نہ منشور چلے گا
اب دہر میں عاشور کا دستور چلے گا

(مرثیہ: زنجیرِ سفر)

....

زینبؑ سے آدمی کے چلن کو بقا ملی زینبؑ سے ہمتِ بشری کو جلا ملی
زینبؑ سے اہلِ درد کو سطحِ وفا ملی زینبؑ سے شام میں خبرِ کربلا ملی
شاہی کے جم سکے نہ قدم تھرتھرا گئے
زینبؑ حسینیت کی صدا بن کے چھا گئی

(مرثیہ: ناموسِ وفا)

....

سید وحید الحسن ہاشمی نے جوشؔ اور آلِ رضا کی طرح معاشرے کے اعلیٰ ترا قدار کی پامالی کا ذکر بطریقِ تاسف کیا ہے۔ ان کے تمام مرثیوں کا مطالعہ کیجیے۔ ان میں آپ کو جگہ جگہ زمانے کی ناگفتہ بہ حالت کا نقشہ ملے گا اور ان خرابیوں کی نشان دہی ملے گی، جن سے معاشرے میں اعلیٰ ترا قدار پامال ہو رہے ہیں۔ یہ رویہ اس اعتبار سے قابلِ قدر اور لائقِ صد تحسین ہے کہ

شاعر کا مقصد یہی ہے کہ وہ اپنے اشعار کے آئینے میں قوم کے ہر فرد کو اس کی اصل صورت دکھا دے۔ درج ذیل بند ملاحظہ فرمایئے اور دیکھیے کہ کس طرح شعری پیرائے میں فرد اور قوم کی حالتِ زار کا ذکر کیا گیا ہے۔

وہم و گماں کے دشت میں حیراں ہے آدمی ‏ اک مستقل خیالِ پریشاں ہے آدمی
خود اپنی زندگی سے گریزاں ہے آدمی ‏ ہر دم شکارِ گردشِ دوراں ہے آدمی
دوشِ نظر سے چادرِ غیرت اُتار کے
دنیا لئے ہے دین کی توفیق ہار کے

....

ہر ذات اپنی ذات سے رسوا ہے ان دنوں ‏ عقبیٰ کے رُخ پہ غازۂ دنیا ہے ان دنوں
سستا بہت ضمیر کا سودا ہے ان دنوں ‏ غیرت کسی غریب کا لاشہ ہے ان دنوں
کتنا حسیں فریب نظر کھا رہے ہیں لوگ
دو کشتیوں میں پاؤں ہیں اور جا رہے ہیں لوگ

....

(مرثیہ: حسینؓ اور قربانی)

دولتِ صبر سے ہو جائے جو ملت محروم ‏ اس کی قسمت میں کہاں فکر کے تابندہ نجوم
اس کا احساس فنا، اس کی قیادت معدوم ‏ ایک معنی میں کہا جاتا ہے اس کو مرحوم
قوم بے صبر سہاروں پہ گزر کرتی ہے
غیر کے پاؤں سے خود اپنا سفر کرتی ہے

....

(مرثیہ: صبر)

صبر سے دُور ہے ملت تو وہ ملت کیا ہے ‏ جوش بے ہوش کی دنیا میں حقیقت کیا ہے
شب میں گہنائے ہوئے چاند کی وقعت کیا ہے ‏ خود جو محتاجِ نظر ہو وہ بصیرت کیا ہے
دن یہ بے صبریٔ ہمت کبھی دکھلاتی ہے
کوئی رستہ نہیں اور قوم چلی جاتی ہے

....

(مرثیہ: صبر)

وحید الحسن ہاشمی اس سماجی صورتِ حال کی بدحالی کے ذمہ دار افراد کو لائق تعزیر سمجھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایسے افراد کے تذکرے کے وقت موصوف کے قلم میں جو شدت پیدا ہو جاتی ہے وہ ان کے صاف باطن ہونے کی نشانی ہے۔ بلاشبہ ایسے افراد لائق نفرین و ملامت ہیں جو ذاتی مفادات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اجتماعی مفادات کو قربان کر دیتے ہیں۔ درج ذیل بند دیکھیے کہ سید وحید الحسن ہاشمی نے کس طرح ایسے لوگوں کے چہروں سے نقابِ منافقت اٹھا کر ان کے اصل روپ ظاہر کیے ہیں۔

یہ ملتِ اسلام کے کیسے ہیں بہی خواہ   رستہ ہے الگ قوم کا ان کی ہے الگ راہ
پابندِ عدالت نہ شریعت سے ہیں آگاہ   دل پیرو ابلیس زبانوں پہ ہے اللہ
سب کچھ انہیں معلوم ہے انجان نہیں ہیں
اسلام کی حد میں ہیں مسلمان نہیں ہیں

(مرثیہ: زنجیر سفر)

رہزن کی اب یہ ضد ہے کہ رہبر کہیں اُسے   مفلس یہ چاہتا ہے تونگر کہیں اُسے
قطرے کی آرزو ہے سمندر کہیں اُسے   جاہل مُصر ہے نفسِ پیمبر کہیں اُسے
حکمِ امام اس کی نظر میں عناد ہے
اپنی روش غلط ہو تو وہ اجتہاد ہے

(مرثیہ: حسینؑ اور قربانی)

ڈال کر چہرۂ اسلام پہ شاہی کی نقاب   بہرِ ترمیم اٹھا لائے محمدؐ کی کتاب
اپنی ہی ذات کو پہنا کے خدائی القاب۔   پیاس دنیا کی بجھانے لگے مانندِ سراب
اتنا بے نور کیا علم کے کاشانے کو
ہاتھ میں رہ گیا قرآن قسم کھانے کو

(مرثیہ: صبر)

وحید الحسن ہاشمی نے محض کور ذوق، بدطینت اور بداعمال رہبروں کی مذمت میں اپنے

شعری افکار کو صرف نہیں کیا بلکہ جگہ جگہ ایسے قابل تقلید افراد کی تصویر کشی بھی کی ہے' جن کا اتباع دنیا اور آخرت دونوں کے لئے سود مند اور باعث افتخار ہے۔ یہی وہ افراد ہیں' جو حق و صداقت کے زیر سایہ پروان چڑھے ہیں اور اجتماعی مفادات کے لئے ذاتی فوائد کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ درج ذیل بندوں میں شاعر نے ایسے ہی افراد کا تعارف کرایا ہے' ملاحظہ فرمایئے۔

تہذیب حریت کا فسانہ ہیں اہل بیتؑ　　آزادیٔ بشر کا ترانہ ہیں اہل بیتؑ
زلفِ رہِ حیات کا شانہ ہیں اہل بیتؑ　　جس میں تھکن نہیں وہ زمانہ ہیں اہل بیتؑ
مقدور چھین لیں نگہ کائنات کا
چاہیں تو یہ بدل دیں مقدر حیات کا

(مرثیہ: خونِ تبسم)

قربانیوں کا حسنِ مجسم ہیں اہل بیتؑ　　عظمت ہے زندگی تو معظم ہیں اہلِ بیتؑ
قربانیاں کرم ہیں مکرم ہیں اہل بیتؑ　　دنیا اگر ہے زخم تو مرہم ہیں اہل بیتؑ
ان کے عمل سے گلشنِ ہستی میں رنگ ہے
ان کے بغیر صلح ہے کوئی نہ جنگ ہے

(مرثیہ: حسینؑ اور قربانی)

آزادیٔ خیال کو جس نے امان دی　　مفہومِ صبر و شکر کو جس نے زبان دی
جس نے چمن کے واسطے صحرا میں جان دی　　نرغے میں اہلِ کفر کے جس نے اذان دی
جھومر لہو کا دے کے جبینِ ممات کو
جس نے دلہن کی طرح سنوارا حیات کو

(مرثیہ: شب عاشور)

جدید اُردو مرثیے کے فروغ کے لئے جن اکابر مرثیہ گو شعراء نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں' ان میں نجم آفندی' آل رضا' جوش ملیح آبادی' جمیل مظہری' صفدر حسین اور قیصر بارہوی کے اسمائے گرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ وحید الحسن ہاشمی کو یہ امتیاز حاصل

ہے کہ انہوں نے ۱۹۷۰ء کے اوائل میں اُردو میں ''جدید مختصر مرثیہ'' کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اس سلسلے میں آپ نے بنیادی اہمیت کے بے شمار مضامین خود بھی لکھے اور دیگر ناقدین سے بھی لکھوائے جن میں یہ موقف کلیدی حیثیت رکھتا ہے کہ عصر حاضر میں دیگر اصناف کی طرح مرثیے کو بھی اپنے اندر اختصار پیدا کرنا چاہیے۔ (۵۶) موصوف نے ان مقالات میں جدید اور قدیم مرثیوں کے فرق کی وضاحت کی اور جدید مرثیے کے خدوخال متعین کیے۔ ان کے نظریات تیزی سے مقبول ہوئے اور مرثیہ گو شعراء نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ آج کل جو مختصر مرثیے قارئین سے خراجِ تحسین حاصل کر رہے ہیں، ان کی داغ بیل ڈالنے والے وحید الحسن ہاشمی ہیں۔

اب ان پیش کردہ معروضات کی روشنی میں کراچی کے ایک مرثیہ نگار ڈاکٹر ہلال نقوی صاحب کا یہ موقف کسی بھی صورت میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ وحید الحسن ہاشمی کی مختصر مرثیہ گوئی کی تحریک کو استحکام نہیں مل سکا ہے۔ (۵۷) اس سلسلے میں ڈاکٹر موصوف نے ''لہو لہو کہکشاں'' کے دیباچے میں بھی اس تحریک کے مثبت اثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے فقط اس دلیل پر مختصر مرثیہ گوئی کی تحریک کو ناکام و نامراد قرار دے دیا ہے کہ وحید الحسن ہاشمی کا ابتدائی مرثیہ چالیس اور ایک دوسرا مرثیہ اُنہتر بندوں پر مشتمل ہے۔ اسی دیباچے میں فاضل مصنف نے اپنے ہی استدلال کی نفی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مرثیہ جو سلام اور نوحہ جیسی مختصر اصناف سے مزاجاً اور طبعاً یکسر جدا صنف ہے' اپنی کمیت سے نہیں بلکہ اپنی کیفیت سے پہچانا جاتا ہے اور کیفیت کو بندوں کی کمی کے حصار میں مقید نہیں کیا جاسکتا۔'' (۵۸)

اس فکری مغالطے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ وحید الحسن ہاشمی نے

---

(۵۶) (i) وحید الحسن ہاشمی (مرتب) جدید فن مرثیہ نگاری' لاہور: مکتبہ تعمیر ادب' ۱۹۶۷ء۔
(ii) وحید الحسن ہاشمی' تنقیدی جہتیں' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز' ۱۹۹۴ء۔

(۵۷) ہلال نقوی' ڈاکٹر' ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' کراچی: محمدی ٹرسٹ' ۱۹۹۴ء' ص ۷۲۵

(۵۸) ہلال نقوی' ڈاکٹر' ''لہو لہو کہکشاں'' (مقدمہ)' کراچی: ادارہ تقدیس قلم' ۱۹۸۹ء' ص ۳۱

محض مرثیے کے بندوں کی تعداد کو کم کرنے پر زور نہیں دیا' بلکہ انہوں نے ہمیشہ مرثیے کے مجموعی مزاج کو بدلنے اور اس میں فکری تبدیلیاں لانے پر زور دیا ہے۔ اب اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب کا فرض ہے کہ وہ جدید مختصر مرثیہ گوئی کی تحریک کے اثرات کا بنظرِ غائر جائزہ لیں اور اگر انہوں نے اس تحریک سے متاثر ہونے والے شعراء کی فہرست تشکیل دی تو انہیں اپنے آپ کو بھی یقیناً اس فہرست میں شامل کرنا پڑے گا۔'' (۵۹)

وحید الحسن ہاشمی کے جدید مختصر مرثیوں کا مطالعہ کیجئے تو ان میں عصرِ حاضر کے جدید رویوں کا سراغ ملتا ہے۔ یہ رویے ایک جانب تو عقل کی میزان پر پورے اترتے ہیں اور دوسری جانب یہ جدید سائنسی افکار سے متصادم نہیں ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں میں عصرِ حاضر کے اہم ترین مسائل اور معاملات کی ترجمانی ملے گی۔ درج ذیل بندوں کا مطالعہ کیجئے اور دیکھیے کہ موصوف نے نئے اور تازہ افکار کو کس جدت اور فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔

ذروں کی گفتگو نے دیا زندگی کو رنگ حیراں ہوئے پہاڑ تراشے گئے وہ سنگ
مخلوق کے مزاج میں تخلیق کی اُمنگ تحصیلِ امن کے لئے لازم ہو جیسے جنگ
جدت کی سمت مرکبِ تہذیب موڑ کے
انسان نے عطر لے لیا پتھر نچوڑ کے

(مرثیہ: زندگی)

دل کی بستی میں جو تنہائی کا اٹھتا ہے دُھواں وہم ہو جاتا ہے جب بزمِ خیالات کی جاں
اشک جب ٹوٹ کے بن جاتے ہیں نظروں کی زباں آدمی درد سے ہوتا ہے جو مجبورِ فغاں
یوں سنبھل جاتا ہے وہ صبر کی دولت پا کر
جیسے مزدور کو تسکین ہو اُجرت پا کر

(مرثیہ: صبر)

---

(۵۹) عباس رضا ''وحید عصر'' لاہور: الحسن پبلی کیشنز' ۱۹۹۸ء ص ۴۹۱

حُبِ خدا ہے اصل میں انسان کا مآل — نسبت یہ دائمی ہے رعایت یہ لازوال
اس کی کشش جنوب ہے' اس کا اثر شمال — تقویمِ معرفت میں ہے اک پل ہزار سال
باہر ہے یہ زمان و مکاں کی قیود سے
بجلی یہ کھیلتی ہے سحاب وُرُود سے

(مرثیہ: خونِ تبسم)

تکمیلِ سفر کیجئے زنجیرِ سفر سے — آلام کا رُخ موڑیئے زخموں کی سپر سے
دنیا کی نظر کاٹیے شمشیر نظر سے — ظلمت کا گلا گھونٹیے مقتل کی سحر سے
یوں سجدۂ صد شکر ہو زنداں کی زمیں پر
تقدیس کا ہر نقش اُبھر آئے جبیں پر

(مرثیہ: زنجیرِ سفر)

وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں میں ایک ایسی فلسفیانہ فکر موجود ہے' جو خشک فلسفیانہ موشگافیوں سے کسی حد تک مختلف ہے۔ وحید الحسن ہاشمی اپنے فلسفیانہ افکار کو استفہام کے ذریعہ استوار کرتے ہیں۔ وہ کسی ایک اہم مسئلے کے حوالے سے مختلف نکات سوالات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی علمی استعداد کے مطابق ممکنہ جوابات بھی فراہم کرتے جاتے ہیں۔ سوال اور جواب کا یہ سلسلہ قارئین کو حظ اور مسرت فراہم کرتا ہے۔ درج ذیل بندوں کا مطالعہ کیجئے اور دیکھیئے کہ شاعر نے کس طرح اولاً استفہامیہ انداز پیدا کیا اور اس کے بعد ان سوالات کو کتنے سہل اور سادہ طریقے سے حل کر دیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ غائب ہے حق کی ذات — دیکھے بغیر کیسے محبت کو ہو ثبات
کوئی تو ہو کہ جس سے کہے دردِ دل کی بات — مقصود سامنے ہو تو بوجھل نہیں حیات
کردار بے اثر ہے کہانی نہیں اگر
پیاسا اجل رسیدہ ہے پانی نہیں اگر

کوئی سنے تو عقل یہ کہتی ہے بار بار　　لازم نہیں کہ دید پہ اُلفت کا ہو مدار
دیکھا ہے کب کسی نے نگاہوں سے دل کا پیار　　پنہاں نظر کا نور ہے لیکن ہے اعتبار
کیفیتوں کو قلب کی پہچانتے ہیں لوگ
ظاہر نہیں ہے درد مگر مانتے ہیں لوگ

(مرثیہ: خونِ تبسم)

....

مشہور یہ کیا کہ محمدؐ تو ہیں بشر　　ان کا مدار خلقت ظاہر ہے خاک پر
ان کے بھی جسمِ خاک پہ موسم کا ہے اثر　　مثلِ بشر شہود کی پابند ہے نظر
بے جاں جہاں کے کارِ مسلسل سے ہو گئے
آخر زمین اوڑھ کے تربت میں سو گئے

کہتے ہیں آدمی ہے بہرحال محترم　　سب ایک سے ہیں کوئی زیادہ بہت نہ کم
قسمت لکھی گئی نہ مقدر ہوا رقم　　فطرت نے سب کو ایک سے ساماں کیے بہم
جاہل کہو کسی کو نہ اہلِ خبر کہو
ہے آدمی رسول کہو یا بشر کہو

لیکن یہ ناقدین سے پوچھے کوئی ذرا　　قرآں کی رو سے معنیٔ تطہیر پھر ہیں کیا
جب آدمی کی فکر ہے آلودۂ خطا　　کیوں اک بشر کو حقِ تصرف دیا گیا
نعرہ برابری کا ہے جب ہر زبان پر
کیوں مصطفیٰؐ کو حق ہے زمانے کی جان پر

جب عالمِ شہود کے انساں ہیں ایک سے　　پھر اتباعِ حکمِ نبیؐ کیوں کوئی کرے
جب آب و گِل کے جسمِ بشر میں ہیں سلسلے　　پھر کس طرح رسولؐ سوئے لامکاں گئے
جب بندشیں نہیں کوئی رزقِ حلال پر
صدقہ حرام کیوں ہے محمدؐ کی آلؑ پر

یکساں ہیں جب سرشت میں کل ساکنِ زمیں　　سایہ نبیؐ کے جسمِ مبارک کا کیوں نہیں
جب ہیں رسولِ پاکؐ اسی خاک کے مکیں　　کس طرح لامکاں سے مکاں ہو گیا قریں
جب ہر بشر کا رنگ ہے بزمِ شہود میں
کیوں صرف اہلِ بیتؑ میں شامل درود میں

جب ایک ہی شجر کے ہیں سب آدمی ثمر　　شیریں جوان میں یہ ہے تو وہ کیوں ہے تلخ تر
جب آسمان سے کوئی اترا نہیں بشر　　آدمؑ کہاں سے آ کے بسے ہیں زمین پر
فطرت نہیں یہ مہد میں جب کائنات کی
کس طرح پھر مسیحؑ نے جھولے میں بات کی

(مرثیہ: ملیکتہ العرب)

جدید مختصر مرثیہ عموماً ۵۰ تا ۷۵ بندوں پر محیط ہوتا ہے لہٰذا مرثیہ نگار اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ قارئین کے سامنے اشارات و کنایات میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرے۔ وحید الحسن ہاشمی بھی کم لفظوں سے زیادہ معانی پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے بیشتر مرثیوں میں رمزیت اور علامت کا ایک جہانِ معانی آباد نظر آتا ہے۔ بعض اوقات تو ان کا یہ ایجاز و اختصار قاری کو متحیر کر دیتا ہے۔ درج ذیل بندوں کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیئے کہ انہوں نے کس طرح دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔

مکے کا قحط ہو کہ ہو وہ دعوتِ نبیؐ　　طائف کا وہ سفر ہو کہ محصور زندگی
ہجرت کا کرب ہو کہ جفا غارِ ثور کی　　دشمن سے جنگ ہو کہ قبیلوں سے دوستی
دنیا کے دبدبے سے نہ جاہ و جلال سے
نامِ خدا چلا ہے خدیجہؑ کے مال سے

(مرثیہ: ملیکتہ العرب)

تڑپی کبھی شبیہِ پیمبرؐ کے روپ میں　　اٹھی کبھی جلالتِ حیدرؑ کے روپ میں
چمکی کبھی تبسمِ اصغرؑ کے روپ میں　　نکلی کبھی حسینؑ کی خواہر کے روپ میں

بھائی نہ تھے تو دین کی نگہدار بن گئی
زینبؑ وفا کی قافلہ سالار بن گئی

(مرثیہ: ناموسِ وفا)

اخلاق ہے نبیؐ کے گھرانے سے سربلند   اخلاق کو علیؑ کی ادائیں ہیں سب پسند
اخلاق فاطمہؑ کی حیات کا نیاز مند   اخلاق پر حسینؑ نے آنے نہ دی گزند
اس گلستاں میں پھول سے رونق ہے پھول کی
خلقِ حسنؑ بہار ہے خلقِ رسولؐ کی

(مرثیہ: خلقِ حسنؑ)

قربانیٔ حیات کو اب ڈر نہیں رہا   ذہنوں کو خوفِ ناوک و خنجر نہیں رہا
عزمِ خلیلؑ رہ گیا آذر نہیں رہا   آئینۂ حق ہے دینِ سکندر نہیں رہا
ایثار کی کماں کو نئے تیر مل گئے
قربانیاں اُداس تھیں شبیرؑ مل گئے

(مرثیہ: حسینؑ اور قربانی)

وحید الحسن ہاشمی جدید مرثیہ نگار ہونے کے باوجود اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اگر مرثیے میں ''مرثیت'' نہیں ہوگی تو وہ مرثیہ ایک بے بو پھول ہوگا۔ اس کی معنویت اور تاثیر میں کمی واقع ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مرثیوں میں حزن و ملال کی فضا قائم رہتی ہے۔ ان کے مرثیوں میں فکری تسلسل اور معنوی ربط ہوتا ہے' جو واقعۂ کربلا پر منتج ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مرثیے میں وہ جگہ جگہ ایسے الفاظ شعوری طور پر استعمال کرتے ہیں کہ قاری کا ذہن واقعۂ کربلا کے کسی ایک پہلو کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس طرح شاعر مصائب بیان نہ کرنے کے باوجود قاری کا ذہنی تعلق واقعۂ کربلا سے جوڑے رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں وحید الحسن ہاشمی کی رائے بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

''...... مختصر مرثیے میں اگر ''مرثیت'' کا عنصر مفقود ہے تو اسے ہم نظم کہیں گے

مختصر مرثیہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ مرثیت کیا ہے" درد حسینی" سے درد انسانی کو کم کرنا۔(۶۰)"

وحید الحسن ہاشمی کے بیشتر مرثیے خصوصیت کے ساتھ اپنے اندر ایک ایسی المیہ کیفیت سموئے ہوئے ہیں جس کا فن مرثیہ نگاری کے آہنگ سے خاص تعلق ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مرثیوں کے مصائب سے متعلق بند دوسرے شعراء کی نسبت زیادہ مبکی نظر آتے ہیں۔ وہ کبھی تو کرداروں کی نفسیاتی کشمکش سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کبھی لفظوں کے دروبست سے ایسا سحر انگیز ماحول پیدا کردیتے ہیں کہ قاری کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر طاہر حسین کاظمی کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

> "...... وحید الحسن ہاشمی کے مراثی میں مصائب کا بیان بھی سوز و گداز اور شاعرانہ فنکاری کے ساتھ موجود ہے..... مصائب کے بیان میں غم و الم کا سماں پیدا کرنے میں کامیابی سے گزرے ہیں۔(۶۱)"

تمام مرثیوں کے مبکی بندوں کا مطالعہ کیجیے تو آپ یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس مقام پر ہاشمی صاحب میر انیس سے زیادہ میرزا دبیر سے قریب ہیں۔ ذیل میں مرثیوں کے مختلف بندوں کا مطالعہ کیجئے اور دیکھیے کہ شاعر نے کس طرح قاری کا رابطہ واقعۂ کربلا سے بحال رکھا ہے۔

ماضی کا حال، حال کے منظر میں دیکھیے　　کل کا شباب آج کے پیکر میں دیکھیے
جوہر صدف کا تابشِ گوہر میں دیکھیے　　اوصاف انبیاء رخِ حیدرؑ میں دیکھیے
دیروز ایک نقشِ غمِ ناتمام ہے
امروز حبِ آلِ محمدؐ کا نام ہے

(مرثیہ: ناموس وفا) ....

---

(۶۰) وحید الحسن ہاشمی "تنقیدی جہتیں" لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، ص ۳۶

(۶۱) طاہر حسین کاظمی، ڈاکٹر "اردو مرثیہ میر انیس کے بعد" دہلی: ایرانین آرٹ پرنٹرز، ۱۹۹۷ء، ص ۳۸۷

میزانِ روشنی میں زمانے کو تولیے مقصد سے زندگی کے فسانے کو تولیے
ماحول میں عمل کے خزانے کو تولیے قرآن سے نبیؐ کے گھرانے کو تولیے
آیت کہے گی حرمتِ اشراف چاہیے
تاریخ وزن رکھتی ہے انصاف چاہیے

(مرثیہ: ملیکۃ العرب)

پانی کا نام لے تو حمیت کے ہے خلاف کچھ مانگنا غیور طبیعت کے ہے خلاف
پیچھے قدم ہٹیں یہ شجاعت کے ہے خلاف آواز دیں رباب کو غیرت کے ہے خلاف
اپنی مثال منزلِ غیرت پہ آپ ہے
بیٹا سمجھ رہا ہے کہ مجبور باپ ہے

اصغرؑ پدر کی صدق بیانی سمجھ گئے الفاظِ بے صدا کے معانی سمجھ گئے
پیتے ہیں کیسے تیغ کا پانی سمجھ گئے لائے ہیں کیوں حسینؑ کہانی سمجھ گئے
شیرِ خدا کے شیر کا منظر دکھا دیا
خیبر رگِ گلو پہ اٹھا کر دکھا دیا

(مرثیہ: حسینؑ اور قربانی)

مسلمؑ بہت قریب ہے وہ منظرِ الم عابدؑ کو تازیانے لگیں گے قدم قدم
بازار میں جب آئیں گے شبیرؑ کے حرم پوچھے گا واقعہ سرِ عباسؑ ذی حشم
لائے تھے جن کو ساتھ وہ پیارے کہاں گئے
بھیا مری بہن کے ستارے کہاں گئے

(مرثیہ: سفیر آلِ محمدؐ)

آخر بہن کے سامنے آئے شہؑ انام رکھی نہ پہ لاش بہن سے کیا کلام
زینبؑ تمہارے باغ میں آئی ہوائے شام لیلیٰ سے کہہ دو دیکھ لے اپنا مہ تمام

خیمے میں پھر شبیہ پیمبرؐ نہ آئے گا
جی بھر کے دیکھ لو علی اکبرؑ نہ آئے گا

(مرثیہ: زندگی)

....

شانے بندھے ہوئے ہیں مگر حوصلہ وہی — سر پر ردا نہیں ہے مگر دبدبہ وہی
کیا کیا رکاوٹیں ہیں مگر راستہ وہی — بھائی نے جو کہا تھا بہن کی صدا وہی

یہ ارتباط فکر و نظر کا مقام ہے
زینبؑ "حسینیت" کی اشاعت کا نام ہے

(مرثیہ: ناموس وفا)

....

وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں میں اسالیب کے مختلف ذائقے اور پیرائے ملتے ہیں۔ کہیں تو وہ آلِ رضا کی طرح سادہ اسلوب بیان اختیار کرتے ہیں اور کہیں جوش ملیح آبادی کی طرح ان کے فن میں لکھنوئ مرصع کاری ملتی ہے۔ یہ بات بہر حال طے ہے کہ موصوف لفظ شناس ہیں اور الفاظ کو قرینے سے استعمال کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کا اسلوب بیان واضح اور جچا تلا ہے۔ سادگی، سلاست اور روانی کے حوالے سے ان پر انیس کی چھوٹ پڑتی نظر آتی ہے۔ وہ تشبیہ اور استعارے کے رسمی استعمال کے قائل نہیں ہیں بلکہ اس فن میں ان کا موقف واضح طور پر یہ ہے کہ علم بیان و بدیع اگر شعری حسن میں اضافہ کریں تو ان کا استعمال برحق، ورنہ لفظوں کا الٹ پھیر بے مصرف ہے۔ وحید الحسن ہاشمی کے مرثیوں کے اسلوب اور زبان و بیان کے حوالے سے ڈاکٹر طاہر حسین کاظمی کی یہ رائے ملاحظہ فرمایئے:

> "...... وحید الحسن ہاشمی کے مراثی پر نظر کرنے سے ان کی علمی بصیرت اور بالغ نظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ زبان صاف اور کلام برجستہ ہے۔ نکتہ رسی اور نکتہ دانی ان کا خاص شیوہ ہے۔ خیالات میں وسعت اور معنویت ہے...... ان کے کلام میں سادگی، صفائی اور برجستگی ہے۔ (۶۲)"

---

(۶۲) طاہر حسین کاظمی، ڈاکٹر "اردو مرثیہ میر انیس کے بعد" دہلی: ایرانین آرٹ پرنٹرز، ۱۹۹۷ء
ص ۳۸۸

درج ذیل بندوں کا مطالعہ فرمایئے اور دیکھیے کہ کس طرح انہوں نے اسلوب کی مختلف جہتوں کو فنکارانہ صناعی کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ علم بیان و بدیع کے ارکان باہمدگر اس طرح شیر و شکر ہو گئے ہیں، کہ شعری ضرورت محسوس ہوتے ہیں۔

طوفاں کی موج موج پہ کشتی رواں ہوئی　　چکرا گئے بھنور وہ روانی عیاں ہوئی
چادر کی طرح وادیٔ کوہ گراں ہوئی　　آئی صدائے زندگی میں آسماں ہوئی
انساں سمندروں کے مدینے میں آ گیا
باقی وہی رہا جو سفینے میں آ گیا

(مرثیہ: زندگی)

سبطِ نبیؐ کی جو زمانے پہ اک نظر　　آئینِ مصطفیٰؐ کی جبیں تھی لہو میں تر
اسلام جیسے راہ میں ٹوٹا ہوا شجر　　قرآن جیسے ظلم سے توڑا ہوا ثمر
عقبیٰ تھی اک مذاق نگاہِ عوام میں
ایمان تول تول کے بکتا تھا شام میں

(مرثیہ: خلقِ حسنؑ)

ندا یہ دی کہ شغالو قریب آؤ تو　　جو سورما ہیں زمانے کے ان کو لاؤ تو
فنونِ حرب کے انداز کچھ دکھاؤ تو　　لو اس لکیر سے آگے قدم بڑھاؤ تو
مزہ تو جب ہے کہ لشکر کی یوں صفائی ہو
یہاں حسام چلے، شام میں دہائی ہو

(مرثیہ: سرکارِ وفا)

کتنے حسین ہاتھ تو کیا خوش نظر ہیں پاؤں　　عالم کی رہبری کے لئے معتبر ہیں پاؤں
اسلام کی وہ سمت ہے ان کے جدھر ہیں پاؤں　　یہ پشتِ مصطفیٰؐ پہ نہیں عرش پر ہیں پاؤں
ہاتھوں پہ مثلِ زلف خرد کی زمام ہے
معراج اس ادا کی بلندی کا نام ہے

(مرثیہ: خلقِ حسنؑ)

ماتھے کا نور سیدِ ابرار کی طرح آنکھیں نبیؐ کے دیدۂ انوار کی طرح
رفتار بھی رسولؐ کی رفتار کی طرح پیکر تمام احمدِ مختارؐ کی طرح
حمدِ خدا کا سروِ سہی قد ہے دوسرا
صورت بتا رہی ہے محمدؐ ہے دوسرا

(مرثیہ: زندگی)

....

اس معروضے کے آغاز میں راقم الحروف نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ واقعۂ کربلا کا سب سے بڑا فیض یہ ہے کہ اس نے ایک سطح پر تو انسان کا تعلق خدا سے اور دوسری سطح پر انسان کا تعلق اعلیٰ معاشرتی اقدار سے جوڑ دیا ہے۔ وحید الحسن ہاشمی نے بھی واقعۂ کربلا کے وسیلے سے اپنی عزائی شاعری کے ذریعہ اعلیٰ تر معاشرتی اقدار کو فروغ دینے کی جو کوشش کی ہے، وہ لائق تحسین ہے۔ آلِ رضا اور جوشؔ ملیح آبادی کی رحلت سے اُردو عزائی ادب میں جو خلاء پیدا ہو گیا تھا، وحید الحسن ہاشمی نے اپنے نادر الوجود اسلوبیاتی مرثیوں کے ذریعے اس کو پر کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وحید الحسن ہاشمی کی رثائی شاعری مواد اور اسلوب کے لحاظ سے آلِ رضا اور جوشؔ کے شاعرانہ محاسن کا پر تجمل امتزاج ہے۔

⌘⌘⌘

سیف زلفی ـــــ مرثیے کی ایک توانا آواز

کسی بھی مہذب معاشرے میں ادب' ادیب اور قاری کے مثلث کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔(۱) یہ مثلث جتنا مضبوط ہوتا ہے' قوم کی فکری اڑان اتنی ہی بلند ہو جاتی ہے۔ اگر اس مثلث کا کوئی ایک سرا کمزور ہو جائے تو معاشرہ شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم ایک ایسے پر آشوب معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں اس مثلث کے تینوں کنارے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں۔ ادیب ذاتی نمود و نمائش اور جلب منفعت کے لیے ہنگامی ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ باشعور قارئین نے ادب کی کم قدری اور بے سرو سامانی دیکھ کر فلمی رسائل اور ڈائجسٹوں میں پناہ ڈھونڈ لی ہے۔ صحافیوں اور کالم نگاروں کو اعزازات و انعامات سے نواز کر پوری قوم کو کالم نگار بننے کی ترغیب دی جا رہی ہے اور ادب سر عام رسوا ہو رہا ہے۔ اگر یہ صورت حال چند برس مزید جاری رہی تو ہمارے معاشرے میں ادب و ادیب کی وقعت ختم ہو جائے گی اور ہمارا معاشرہ بے ادبی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوب کر اپنی شناخت کھو بیٹھے گا۔

معاشرتی بے حسی اور ادبی بنجر پن کو ختم کرنے کے بے شمار طریقے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان ادبی تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی کریں جو دنیاوی طمع سے دور رہ کر دیانت داری

---

(۱) شبیہ الحسن' ڈاکٹر' شام و سحر کی باتیں' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز' ۱۹۹۸ء' ص ۱۳۱

سے ادب کی خدمت پر کمر بستہ ہیں۔ ہمیں ادبی قارئین کے ذہنی و فکری احیاء کے لیے نئے اور تازہ افکار و نظریات پیش کرتے رہنا چاہیے۔ ہمیں قاری ادب اور ادیب کے مثلث کو قوی تر بنانے کے لیے ان معتبر ادیبوں اور شاعروں کی یاد بھی منانا چاہیے جو پورے انہماک سے علم و ادب کی خدمت کرنے کے بعد خاموشی سے گزر گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مرحوم ادیبوں اور شاعروں کے فکری چراغ سے ہم اپنے چراغ فکر روشن کر سکتے ہیں۔ جب یہ بات طے ہے کہ جدت روایت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے تو ان شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات بھی ہمارے لیے چراغ ہدایت بن سکتی ہیں۔ اردو شعر و ادب کو فکری طور پر مالا مال کرنے والوں میں ایک معتبر نام سیف زلفی کا بھی ہے۔(۲) سیف زلفی نے اردو ادب کی شمع کی لو کو تیز کرنے کے لیے اپنا خون جگر صرف کیا اور ان کے لہو کی تابانی سے اردو شعر و ادب پر ایک نکھار آ گیا ہے۔ سیف زلفی کون تھے؟ شعر و ادب میں ان کی کیا قدر و منزلت ہے؟ مرثیے کی صنف سے انہیں کیا رغبت تھی؟ انہوں نے کتنے مرثیے کہے؟ ان مرثیوں کی علمی و ادبی کیا حیثیت ہے اور مرثیے کی تاریخ میں سیف زلفی کا کیا مقام و مرتبہ ہے......؟؟ ان تمام سوالات کے جوابات آپ کو اس مضمون میں مل جائیں گے۔

سیف زلفی ایک تخلیقی ذہن رکھتے تھے۔(۳) انہوں نے عمر بھر ادب کی خدمت کی اور کئی نثری و شعری تخلیقات یادگار چھوڑیں۔ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کے ورثے کی حفاظت کی، روایت کی اعلیٰ قدروں کو اپنی ذات میں جذب کیا اور انفرادیت کا سہارا لے کر دنیائے ادب میں اپنے لیے ایک مستقل مقام بنانے میں کامران ہوئے۔ روایت، وراثت اور انفرادیت کی اس فنی تکوین نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ سیف زلفی کی کسی بھی نثری یا شعری تخلیق کا مطالعہ فرمائیے آپ خود دیکھیں گے کہ اس تخلیق کے پس پردہ یہی فنی مثلث کارفرما ہے۔ سیف زلفی نے شعری ذوق اپنے آباؤ اجداد سے

---

(۲) وحید قریشی، ڈاکٹر (فلیپ) جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء ص فلیپ

(۳) اختر حسین شیخ "شمشیر براں" مشمولہ جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء ص ۴۹۱

ورثے میں پایا اور وہ برملا کہتے تھے کہ شاعری ان کے اجداد کا پیشہ تھی اور ان کے گھٹی میں پڑی تھی۔(۴)اسی طرح وہ روایت کے رچاؤ کو شاعری کے لیے لازمی قرار دیتے تھے۔(۵)ان کا واضح موقف یہ تھا کہ وراثت اور روایت میں اگر نیا پن، تازگی اور انفرادیت نہیں ہے تو شاعر عظیم نہیں کہلا سکتا۔(۶)

سیف زلفی کا اسم گرامی سید ذوالفقار حسین رضوی تھا۔آپ ۳۱ مئی (۷)۱۹۳۱ء کو بریلی میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد ماجد کا نام سید مقبول حسین رضوی اور والدہ گرامی کا نام

---

(۴) سیف زلفی ''انٹرویو.....آغا سلمان باقر''لاہور:روزنامہ مغربی پاکستان'۱۱ نومبر ۱۹۸۲ء ص ۳

(۵) آغا سلمان باقر''سیف زلفی سے ملاقات''لاہور:ماہنامہ''شام وسحر''اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۱۰

(۶) آغا سلمان باقر''سیف زلفی سے ملاقات''لاہور:ماہنامہ''شام وسحر''اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۱۲

(۷) سیف زلفی کی تاریخ ولادت کا حتمی تعین درج ذیل ذرائع سے کیا گیا ہے:

(i) سیف زلفی'انٹرویو آغا سلمان باقر'لاہور:روزنامہ مغربی پاکستان'۱۱۔نومبر ۱۹۸۲ء

(ii) شبیہ الحسن ڈاکٹر'جدید لہجے کا شاعر۔سیف زلفی'لاہور:الحسن پبلی کیشنز'۲۰۰۰ء ص ۹۷

(iii) صفدر علی شیخ'میں کون ہوں اے ہم نفساں'لاہور:ماہنامہ شام وسحر'اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۷

(iv) وحید الحسن ہاشمی'سید ''ھل من ناصر''لاہور:مرثیہ نگاران پنجاب ۲۰۰۰ء ص ۳۱

یاد رہے کہ سیف زلفی کے سن ولادت کے بارے میں درج ذیل سنین بھی پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۹۲۹ء

ہلال نقوی ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ''کراچی:محمدی ٹرسٹ'۱۹۹۴ء

۱۹۳۰ء

(i) عفت حسن ''سید سیف زلفی۔شخصیت وفن''مقالہ ایم۔اے اردو'پنجاب یونیورسٹی'لاہور (غیر مطبوعہ)'۱۹۹۱ء ص ۲

(ii) محمد رفیق بلوچ''سیف زلفی۔احوال وآثار''مقالہ ایم۔فل اردو(غیر مطبوعہ)'علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی'اسلام آباد ۱۹۹۳ء ص ۳

(iii) شناختی کارڈ سیف زلفی'مملوکہ راقم الحروف

(iv) سروس بک سیف زلفی'مملوکہ محکمہ ریلوے لاہور

سیدہ کنیز بتول تھا۔ آپ کے آباؤ اجداد ایران سے ہجرت کر کے روہیل کھنڈ میں آباد ہوئے۔
اس سلسلے میں سیف زلفی کے اجداد کی کہانی خود ان کی زبانی سنیئے:

"......میرے جد امجد ایران کی فوج میں اسلحے کے کمانڈر رہتے۔ ان کو میر اسلحہ کہتے تھے۔ پورے خاندان کے ساتھ بریلی آئے۔ مجھے ٹھیک طرح سے تو نہیں معلوم مگر میرے نزدیک دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حکومت وقت سے کوئی بڑا اختلاف ہو یا پھر ایران کے سیاسی حالات ایسے ہوں گے کہ وہاں سے کوچ کرنا غنیمت تھا۔ ان جد امجد کا مزار روہیل کھنڈ میں آج بھی ہے۔" (۸)

سیف زلفی نے ابتدائی تعلیم پنجابیاں پرائمری سکول بریلی سے حاصل کی اور میٹرک اور ایف اے کے امتحانات اسلامیہ ہائی سکول بریلی سے نمایاں اعزاز کے ساتھ پاس کیے۔ یہاں انہیں دیگر معروف اساتذہ کے ساتھ ساتھ شوکت سبزواری، خواجہ احمد فاروقی اور حامد بریلوی جیسے اساتذہ سے کسبِ فیض کا موقع ملا۔ اس سلسلے میں سیف زلفی کی اپنی رائے ملاحظہ فرمایئے:

"......اس سکول میں دو ہندو ٹیچر تھے۔ باقی سب مسلمان ٹیچر تھے۔ شوکت سبزواری اور خواجہ احمد فاروقی سے میں نے اسی سکول میں پڑھا۔ سبزواری صاحب اردو پڑھاتے اور فاروقی صاحب انگریزی۔ اساتذہ کا اتنا رعب اور احترام تھا کہ وہ دور سے نظر آ جاتے تو ہم راستہ کاٹ کر نکل جاتے تھے۔ حامد بریلوی صاحب نے مجھے آٹھویں میں فارسی پڑھائی۔ یہ شاعر تھے میں شعر کہتا تھا تو بڑے خوش ہوتے تھے مگر مجھے شاعری سے روکتے تھے۔ (۹)

سیف زلفی نے بعد میں منشی فاضل، ادیب فاضل اور بی۔ اے کے امتحانات پرائیویٹ طالب علم

---

(۸) سیف زلفی "انٹرویو آغا سلمان باقر" لاہور، روزنامہ "مغربی پاکستان" ۱۱۔ نومبر ۱۹۸۲ء

(۹) تنویر ظہور "سیف زلفی سے بچپن کی باتیں" مشمولہ جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی، مرتبہ ڈاکٹر شبیہ الحسن، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۲۴۶

کے طور پر پاس کیے۔

سیف زلفی ۱۹۴۷ء میں نقل مکانی کر کے پاکستان تشریف لے آئے۔ یہاں انہوں نے محکمہ ریلوے پاکستان میں شعبۂ اکاؤنٹس میں ملازمت کر لی اور یہیں سے اکاؤنٹس آفیسر کے طور پر قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ (۱۰) انہوں نے ریڈیو پاکستان لاہور اور پاکستان ٹیلی ویژن میں سکرپٹ رائٹر کے طور پر عارضی طور پر ملازمتیں کیں اور یہ سلسلہ تادمِ آخر جاری رہا۔

سیف زلفی عمر بھر علم و ادب کی آبیاری میں سرگرم عمل رہے۔ انہوں نے رسالہ "عکسِ نو" اور "گلفشاں" کے مدیر کی حیثیت سے شعر و ادب کی ترویج کے لیے اپنی جملہ صلاحیتیں صرف کر دیں۔ خاص طور پر رسالہ گلفشاں اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے اس عہد کا رجحان ساز رسالہ بن گیا تھا۔ (۱۱) اس رسالے کے حوالے سے راقم الحروف کا طویل مضمون دیکھا جا سکتا ہے تاہم سردست ڈاکٹر سعادت سعید کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

> "..... اس رسالے میں انہوں نے جدید ذہن کے حامل شاعروں اور ادیبوں کو بھی چھاپا اور کلاسیکی اور قدیم ذوق رکھنے والے سخن طرازوں کو بھی۔" (۱۲)

اسی طرح انہوں نے ادب پروری کرتے ہوئے حلقۂ اہل قلم کی بنیاد رکھی۔ (۱۳) اس حلقے نے بہت کم عرصہ میں شہرت عام اور بقاء دوام کے دربار میں جگہ پائی اور اس کے ہمہ گیر اثرات آج بھی علم و ادب پر مرتسم ہو رہے ہیں۔ سیف زلفی ایک عرصے تک حلقہ ارباب ذوق لاہور،

---

(۱۰) محمد رفیق بلوچ "سیف زلفی۔ احوال و آثار" مقالہ ایم۔ فل اردو (غیر مطبوعہ) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ۱۹۹۲ء ص ۷

(۱۱) شبیہ الحسن، ڈاکٹر "لاہور سے نکلنے والا معتبر رسالہ "گلفشاں" "مشمولہ" جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی" لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء ص ۱۳۲

(۱۲) سعادت سعید، ڈاکٹر "حریت فکر کا علمبردار سیف زلفی" لاہور روزنامہ جنگ ۴۔ جون ۱۹۹۱ء

(۱۳) شبیہ الحسن، ڈاکٹر "حلقۂ اہل قلم۔ ایک تحقیقی مطالعہ" "مشمولہ" جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی" لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء ص ۸۵

پاکستان پیپلز پروگریسو رائٹرز اور حلقہ شعرائے اہلبیتؑ کے سیکرٹری رہے اور اس حیثیت میں ان کی گراں قدر خدمات سنہرے حروف میں لکھی جانے کے قابل ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سہیل احمد خاں کی گراں قدر رائے ملاحظہ فرمائیے:

> ''......اس سلسلے میں ان کا سب سے نمایاں کام' میرے نزدیک انہوں نے حلقہ ارباب ذوق میں کیا۔ جب وہ حلقے کے سیکرٹری منتخب ہوئے تو حلقہ اتنا فعال نہیں رہا تھا۔ بہت سے اراکین کی دلچسپی اس میں ختم ہو چکی تھی۔ سیف زلفی نے منتخب ہونے کے بعد ناصر کاظمی' مجید امجد' مولانا صلاح الدین احمد اور کئی دوسرے مرحوم ادیبوں کے بارے میں خصوصی اجلاس منعقد کرائے جس میں مشہور ادیبوں نے مضامین پڑھے۔ ان جلسوں سے بہت سے لوگوں کی حلقے سے دوبارہ دلچسپی ہوئی۔ (۱۴)''

سیف زلفی کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بیگم نصرت بھٹو نے ۱۹۸۹ء میں انہیں ''جمہوریت ایوارڈ'' سے نوازا۔ اسی طرح پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک انعامی مقابلے میں ان کا ملی نغمہ (ہمارا پرچم یہ پیارا پرچم) پہلے انعام کا مستحق قرار پایا۔ اسی طرح بعض تنظیموں کی جانب سے بھی ان کی علمی' ادبی و شعری خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔

سیف زلفی کی شادی سید محمد تقی کی دختر نیک اختر محترمہ توفیق فاطمہ سے ہوئی۔ موصوفہ انتہائی شریف النفس' خلیق' مہمان نواز اور شعر و ادب کی پرستار تھیں۔ سیف زلفی کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹوں رضا انتخاب' رضا شہاب اور چار بیٹیوں عفت حریم' نگہت فاطمہ' نزہت فاطمہ اور گلناز فاطمہ سے نوازا تھا۔

سیف زلفی کو ذاتی اور معاشرتی غموں نے ذہنی طور پر الجھا دیا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں انہیں

---

(۱۴) سہیل احمد خاں ''مکتوب بنام عفت حسن'' مطبوعہ جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی' لاہور: الحسن پبلی کیشنز' ۲۰۰۰ء' ص ۳۶۳

جگر کا عارضہ ہو گیا جو ابتدائی طبی امداد کے باعث وقتی طور پر تو دب گیا لیکن اس نے پھر ۱۹۹۰ء میں سر ابھارا اور سیف زلفی کو اُدھ موا کر دیا۔(۱۵) زلفی موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد آخر کار ۲۱ مئی ۱۹۹۱ء کو اس دار فنا سے دار البقا کوچ کر گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ○

ان کی وفات کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ آپ کے جنازے میں لاہور کے معتبر اور مقبول ادباء اور شعرا نے شرکت کی۔ انہیں مومن پورہ قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ لاہور کی تمام ادبی انجمنوں نے سیف زلفی کے لیے تعزیتی قرار دادیں منظور کیں اور ان کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔(۱۶) اس طرح لاہور کا ایک عظیم تخلیق کار اپنا تخلیقی سرمایہ اہل لاہور کی خدمت میں پیش کر کے کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ راقم الحروف کی ایک نظم کے صرف دو اشعار ملاحظہ فرمایئے:

زندہ رہا غضنفر و کرار کی طرح
باتوں میں اس کی کاٹ تھی تلوار کی طرح
آئی جو موت ہنس کے گلے سے لگا لیا
زندہ رہا زمانے میں خوددار کی طرح

سیف زلفی نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف کو اعتبار بخشا۔ غزل ہو یا نظم، منقبت ہو یا سلام، مرثیہ ہو یا نعت، نوحہ ہو یا دوہا، حمد ہو یا ترانہ غرض ہر صنف میں سیف زلفی کا تخلیقی سرمایہ ان کی شعری عظمت پر گواہی دیتا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت رئیس امروہوی کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

"...... سیف زلفی کا شکوہ تخیل اور زور بیان مسلمہ حقیقت ہے۔ غزل ہو یا نظم،

---

(۱۵) میرزا ادیب "واحسرتا سیف زلفی" لاہور: ماہنامہ شام و سحر، اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۶۵

(۱۶) اسرار زیدی "سیف زلفی میرا دوست میرا بھائی" مشمولہ "جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی" لاہور ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۳

منقبت ہو یا مرثیہ، مثنوی ہو یا منظومہ۔ ایک پر شور اور بے کنار طوفان کی طرح وہ ہر مرحلۂ فکر سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ الفاظ ان کے ہاتھ میں سنگ پاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ انہیں تراش خراش کر قوت تخیل سے ایک ایسے تاج محل میں تبدیل کر دیتے ہیں جس پر فن وسخن دونوں کو ناز ہوتا ہے۔" (۱۷)

سیف زلفی نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور اپنے خون جگر سے ہر صنف کو سینچا لیکن وہ جس مقام کے حقدار تھے وہ انہیں حاصل نہ ہو سکا۔ اس سلسلے میں راقم کی یہ رائے پیش نگاہ رکھیے:

"...... سیف زلفی ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کئے بغیر عمر بھر شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے تاہم ان کے مزاج کا جوہر نظموں اور غزلوں میں کھل کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان کے منظوم ڈرامے اور ملی نغمے بھی ارباب دانش سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی جدید نعتیں اور مرثیے اردو شاعری میں بیش بہا اضافے کا موجب ہیں۔ یہ امر انتہائی ملال انگیز ہے کہ زندگی بھر سیف زلفی کی پذیرائی ان کے مقام و مرتبے کے مطابق نہیں ہوئی۔" (۱۸)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیف زلفی نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کیوں کی؟ اگر وہ کسی ایک صنف میں دل لگا کر مشق کرتے تو کیا وہ ایک بڑے شاعر نہیں بن سکتے تھے؟؟ اس سوال کا جواب سیف زلفی نے اپنے ایک انٹرویو میں دیا ہے ملاحظہ فرمایئے:

"...... مجھے کرکٹ کا بہت شوق ہے۔ اپنے زمانے میں کرکٹ باہر کھیلتا تھا اور آج گھر میں بچوں کے ساتھ کھیلتا ہوں۔ جب ٹیلی ویژن پر کرکٹ کا میچ ہوتا ہے تو میں ان کے ساتھ ہی لنچ کرتا ہوں اور ان کے ساتھ ہی ٹی کرتا ہوں۔

---

(۱۷) رئیس امروہوی "مکتوب بنام سیف زلفی" کراچی: مرقومہ یکم اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۱

(۱۸) شبیہ الحسن، ڈاکٹر، شام وسحر کی باتیں، لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۸

میں اچھا کھلاڑی اسے سمجھتا ہوں جو آل راؤنڈ قسم کا کھلاڑی ہو یعنی یہ کہ اچھا باؤلر ہو' اچھا بلے باز ہو' اچھا سکورر ہو اور اچھا فیلڈر رہو۔ اسی لیے میں عمران خان کو اچھا کھلاڑی سمجھتا ہوں۔ یہ مثال میں نے اس لیے دی ہے کہ اسی عمل کو شاعری میں اہمیت دیتا ہوں۔ شاعر کو صرف غزل ہی نہیں کہنا چاہیے بلکہ اسے ہر صنف شعر میں شعر کہنا چاہیے۔ تب ہی وہ اچھا شاعر ہو سکتا ہے۔ نظم' دوہے' مرثیہ' قصیدہ غزل وغیرہ لکھ سکے۔ وہی شاعر ہے ورنہ وہ شاعر تو ہے' اسی طرح جیسے کوئی صاحب صرف باؤلر ہیں۔ بیٹنگ کریں تو کلین بولڈ ہو جاتے ہیں یعنی آٹھویں نمبر کے کھلاڑی ہیں۔ یہ تو بات نہ ہوئی۔ یہی حال شاعری اور شاعر کا ہے۔ اسی طرح کچھ میرا حال ہے۔ میری رباعیات' غزلوں نعت وغیرہ کے مجموعے شائع ہوئے۔ چونکہ میں سادات گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس لیے مرثیے نے میری طبیعت میں شعری مزاج کو جلا بخشی۔ ردیف' قافیے اور بندشوں کے آہنگ ذہن میں اس زمانے میں اتر گئے جب ہوش بھی نہیں تھا۔'' (۱۹)

سیف زلفی کی پوری زندگی عملی جدوجہد میں گزری۔ ہندوستان کے صوبہ یو۔پی میں پیدا ہونے والی یہ ہمہ جہت شخصیت پاکستان آئی تو لاہور اس کا مستقر ٹھہرا۔ یہاں سیف زلفی نے شعر و سخن سے اتنا ربط بڑھایا کہ پھر اسی کے ہو کر رہ گئے۔ سیف زلفی کی ایک نظم ''میرا نام زلفی ہے'' کا ایک ٹکڑا دیکھیے:

میرا نام زلفی ہے
سوچ کی چتاؤں میں' درد کی ہواؤں میں
اور کچھ نہیں کرتا
صرف شعر کہتا ہوں

---

(۱۹) سیف زلفی' انٹرویو آغا سلمان باقر'' لاہور: ماہنامہ شام و سحر' اکتوبر ۱۹۹۲ء' ص ۱۳

فکر کے شبستاں میں
جتنے دیپ روشن ہیں
سب دکھوں سے روشن ہیں

سیف زلفی نے ساری زندگی لاہور میں بسر کر دی اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا جگر کے عارضے میں مبتلا ہو کر رحلت فرما گئے۔ ان کی رحلت کے حوالے سے اصغر ندیم سید نے ایک کالم میں لکھا:

"...... Saif Zulfi died a few days back in Lahore, after a protracted illness. He was hospitalised three months ago, with a liver problem. He served Pakista Railways as an accounts officer and obtained premature retirement. A passionate lover of poetry and literature, Saif Zulfi joined the P.T.V. for some time in its "Current Affairs" department. He was a daily visitor of Pak Tea House. He was electeo secretary of Halqa-e-Arbabe-Zauq at one time and served that organization well, by providing an intimate and cordial literary atmosphere. As a poet Saif Zulfi was known for his Ghazal. He soon joined the ranks of those trying to pave the way of contemporary expression. Gradually he moved over to religious poetry

and contributed a collection of Na'at, Salam and Marsias. Halqu-E-Arbabe-Zauq arranged a condolence meetings for him......"(20)

سیف زلفی نے زندگی بھر شعروادب سے ناتا جوڑے رکھا تاہم ان کی بہت کم شعری تخلیقات زیورطبع سے آراستہ ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا کثیر شعری سرمایا ہنوز منتظر اشاعت ہے۔ مقام مسرت ہے کہ سیف زلفی کے صاحبزادے رضا انتخاب نے راقم الحروف کی تحریک پر سیف زلفی کے تمام کلام کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے اور امکان ہے کہ ۲۰۰۵ء تک سیف زلفی کا تمام کلام نہایت اہتمام سے شائع ہو جائے گا۔ تادمِ تحریر سیف زلفی کی درج ذیل شعری تخلیقات منظر عام پر آ چکی ہے۔

۱۔ ہمارے ہیں حسینؑ (۱۹۶۸)

۲۔ کربلا کے دو اسیر (۱۹۷۴)

۳۔ تا بخاک کربلا (۱۹۷۶)

۴۔ روشنی (۱۹۷۹)

۵۔ نور (۱۹۸۰)

۶۔ ٹکڑے ٹکڑے آدمی (۱۹۸۴)

۷۔ لہو چاند اور سویرا (۱۹۸۹)

ذیل میں ان تخلیقات کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں:

۱۔ ہمارے ہیں حسینؑ

سیف زلفی کے قطعات، رباعیات اور منظومات کا پہلا مجموعہ ''ہمارے ہیں حسینؑ'' کے نام سے ۱۹۶۸ء میں لاہور سے طبع ہوا۔ اس کتاب کے صفحہ نمبر ۲ میں اس کتاب کے حوالے

---

(۲۰) اصغر ندیم سید ''لٹریری سین'' لاہور: روزنامہ ''دی نیشن'' منگل ۴ جون ۱۹۹۱ء

سے یہ تفصیلات درج ہیں:

ناشر:	چوہدری شیر محمد
مکتبہ:	شیر پبلی کیشنز
مطبع:	نقوش پریس' لاہور
سرورق:	موجد فنون پریس' لاہور
کتابت:	سید مجاہد مصطفیٰ رضوی
باراول:	دو ہزار
قیمت:	دو روپے پچاس پیسے
ملنے کا پتہ:	62۔بی' علامہ اقبال روڈ' لاہور

سیف زلفی نے یہ کتاب اپنے عزیز ترین دوست مختار علی خاں کے نام معنون کی ہے۔ ۱۱۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا مختصر دیباچہ ابوضیا اقبال کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''...... یہ مجموعہ اس دور میں کہ نوجوان اور جدید شعراء کا شعری شعور کسی نہ کسی مادی یا غیر مادی نظریئے' تقاضے' قدر یا آدرش سے متاثر ہے' ان کا فن لب و رخسار صنم یا گیسوئے حیات کی فکر میں غلطاں ہے اور ذہن پر روداد شکم' جمالیاتی حس' شخصیت پرستی' بین الاقوامیت یا کسی نہ کسی ازم کی چھاپ ہے۔ ایک نوجوان اور ذہن جدید کے شاعر کا رسولؐ اور آل رسولؐ سے بے پناہ عقیدت کا اظہار خاصی چونکا دینے والی بات ہے...... ''ہمارے ہیں حسینؓ'' ان کی رباعیوں اور نظموں کا مجموعہ ہے جو غزل کی صنف اور تقاضے سے الگ ہٹ کر ایک مقدس اور ارفع نقطے پر مرکوز ہے۔ یہ نقطہ کروڑوں انسانوں کے سینے میں دل بن کر دھڑکتا ہے۔ اس مجموعے کی رباعیوں اور نظموں میں بھی یہی کھنک جھرنے کے سرگم میں ڈھلتی ہے اور یہی تیز لہجہ گھن گرج بن کر لپکتا ہے۔ ان میں طبقاتی تشنج اور فرقہ وارانہ کھنچاؤ کہیں نہیں ہے بلکہ قلب ونظر کی وسیع ہمہ گیری اور بلند و بالا آفاقیت ہے جس سے ہر صاحب نظر کے بیدار

احساس کا سراغ ملتا ہے۔" (۲۱)

"ہمارے ہیں حسینؑ" ستاسی قطعات و رباعیات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں درج ذیل نظمیں بھی شامل ہیں:

(ا) دخترانِ قوم

(ب) جوانانِ قوم

(ج) شہادتِ مولا علیؑ

(د) اس کو جنت مل گئی

(ر) زہے قسمت

(س) علیؑ علیؑ

(ص) مومن

(ط) دامانِ بوترابؑ

ان قطعات، رباعیات اور منظومات کے عمیق مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سیف زلفی محمدؐ و آلِ محمدؐ سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں اور ان کا جینا مرنا ان کی محبت سے مشروط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مجموعہ میں عقیدت کے بہت سے جذباتی رُخ دکھائی دیتے ہیں تاہم سیف زلفی نے اپنی فنی بصیرت سے ان رُخوں کو خوب سے خوب تر بنا دیا ہے۔ اسی لیے عفت حسن نے اس مجموعہ کو سیف زلفی کے بے پناہ جذبوں کا اظہار قرار دیا ہے۔ (۲۲) اور محمد رفیق بلوچ نے اس تصنیف کو محمدؐ و آلِ محمدؐ کی محبت کا ثمر قرار دیا ہے۔ (۲۳)

"ہمارے ہیں حسینؑ" میں موجود قطعات و رباعیات میں ایک جذباتی تاثر ملتا

---

(۲۱) ابوضیا اقبال "پیش لفظ" "ہمارے ہیں حسینؑ" لاہور: شیر پبلی کیشنز، ۱۹۶۸ء، ص ۴

(۲۲) عفت حسن "سیف زلفی۔ شخصیت و فن" مقالہ ایم۔ اے اردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۶۲

(۲۳) محمد رفیق بلوچ "سیف زلفی۔ احوال و آثار" مقالہ ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۴۹

ہے۔ سیف زلفی نے حضور اکرمؐ اور آپؐ کے اہل بیت سے اظہار عقیدت کے لیے مختلف فکری موضوعات منتخب کیے ہیں اور اپنی شاعرانہ صلاحیت کی بدولت ان میں جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ اس کتاب کے ایک مبصر شیر محمد چودھری کا موقف یہ ہے کہ سیف زلفی نے عارفانہ وجد اور عاشقانہ جذبے سے اپنے اشعار تخلیق کیے ہیں۔ (۲۴)

''ہمارے ہیں حسینؑ'' میں موجود منظومات انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ خاص طور پر نوجوانانِ قوم اور دخترانِ قوم اخلاقی موعظت کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان نظموں میں شاعر نے نسل جدید کو تعلیمات محمدؐ و آل محمدؐ اپنانے کی تلقین کی ہے اور ان کی سیرت پر چلنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس حوالے سے شیر محمد چودھری رقم طراز ہیں:

> ''......اس کتاب کی نظمیں نفس مضمون کے اعتبار سے نئی اور سبق آموز ہیں۔ محبت اور اس کا احترام حسینؑ کی شخصیت، حسینؑ کے ماننے والوں کا کردار بھی حسینؑ کے پرتو کی جھلک ہونا چاہیے۔ ''دختران قوم'' ''نوجوانانِ قوم'' ''شہادت علیؑ'' ''مومن'' اور ''علی علیؑ'' ایسی بلند پایہ نظمیں ہیں جو مسلمانوں میں رُوح ایمان اور جذبہ عشق بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔'' (۲۵)

''ہمارے ہیں حسینؑ'' کی اشاعت کے بعد سیف زلفی کی شعری عظمت کو تسلیم کیا گیا اور ناقدین نے اس کتاب کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔ ''ہمارے ہیں حسینؑ'' کی اشاعت کے بعد بعض حلقوں کی جانب سے یہ شوشہ چھوڑ دیا گیا کہ سیف زلفی محض ایک مذہبی شاعر ہیں اور ان کا مطمح نظر مذہبی عقیدت کے علاوہ کچھ نہیں۔ سیف زلفی نے ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے کہا:

> ''......''ہمارے ہیں حسینؑ'' جس کی اشاعت کے بعد افواہ اڑی کہ سیف زلفی میر، غالب اور جوش کے عقیدے کا شاعر ہے۔ میرا مسلک ندیم کی سی

---

(۲۴) شیر محمد چودھری (مبصر) ''ہمارے ہیں حسینؑ'' ماہنامہ گلفشاں لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۹

(۲۵) شیر محمد چودھری (مبصر) ''ہمارے ہیں حسینؑ'' ماہنامہ گلفشاں لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۰

انسان دوستی ہے جو میں نے حسینؑ کے کردار سے چنی ہے......"(۲۶)

"ہمارے ہیں حسینؑ" میں موجود قطعات، رباعیات اور منظومات میں سے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش خدمت ہیں تا کہ قارئین کو سیف زلفی کی فکری عظمت اور فنی دسترس کا احساس ہو جائے۔

قطعات و رباعیات

ہر مشکل ہو آسان، بڑی مشکل ہے ۔۔۔ قطرے میں ہو طوفان بڑی مشکل ہے
اے خود کو نہ پہچاننے والے انسان ۔۔۔ اللہ کی پہچان بڑی مشکل ہے

....

ایمان و حقائق کی طلب ہیں احمدؐ ۔۔۔ اک وجہ شناسائی رب ہیں احمدؐ
بس ان کے لیے خلق ہوئی ہے دنیا ۔۔۔ تخلیق دو عالم کا سبب ہیں احمدؐ

....

یوں خانہ احساس میں پلتے ہیں چراغ ۔۔۔ روتے ہیں تو آنکھوں سے نکلتے ہیں چراغ
ہم حُب علیؑ لے کے جدھر جاتے ہیں ۔۔۔ اس منزل تاریک میں جلتے ہیں چراغ

....

پاکیزہ ہے پھولوں سے بھی نام زہراؑ ۔۔۔ مریم سے بھی آگے ہے مقام زہراؑ
ہر لفظ میں زہراؑ کے خدا بولتا ہے ۔۔۔ قرآن کی صورت ہے کلام زہراؑ

....

زلفی خط گلزار ہے سینہ میرا ۔۔۔ ہے عطر لو سونگھو تو پسینہ میرا
میں ذکر حسینؑ ابن علیؑ کرتا ہوں ۔۔۔ ملتا ہے فرشتوں سے قرینہ میرا

....

---

(۲۶) سیف زلفی "تاثرات" ماہنامہ فنون لاہور جدید غزل نمبر (جلد دوم) جنوری ۱۹۶۹ء ص ۱۶۵۹

ظلمت ہو اگر شمس و قمر بن جائیں
ہو دھوپ تو گنجان شجر بن جائیں
چاہے کوئی فتنہ تو جدا کر نہ سکے
یوں مل کے رہیں شیر و شکر بن جائیں

....

جس کو مرے مولا سے محبت ہو جائے
حاصل اسے ہر چیز پہ قدرت ہو جائے
کانٹوں پہ نظر ڈالے تو وہ پھول بنیں
صحرا میں قدم رکھے تو جنت ہو جائے

....

جذبات نکھرتے ہیں بہشتوں کی طرح
اشعار بھی مربوط ہیں رشتوں کی طرح
لکھتا ہوں اگر مدحت اوصاف حسینؑ
الفاظ اترتے ہیں فرشتوں کی طرح

....

نظم

دُختران قوم

اے کنیزان در بنت علیؑ رفعت مآب
شاعر بزم حسینیؑ تم سے کرتا ہے خطاب

ظلمتوں کی آندھیوں میں روشنی بنتی ہو تم
بے حسی ہو قوم میں تو زندگی بنتی ہو تم

تم اُجالا قوم کا ہو قوم کا آئینہ تم
کیوں نئے سورج کی ظلمت میں ہوئی جاتی ہو گم

فاطمہ زہراؑ کا اپنے سامنے رکھ کر مزاج
تم اگر رستے سے ہٹ جاؤ تو کیا اس کا علاج

چادر زینبؑ کا ماتم کرنے والی بیبیو
کون کہتا ہے سر بازار ننگے سر پھرو

جن کی آنکھوں سے غم شبیرؑ میں دریا بہے
زیب کب دیتے ہیں ان کو اُونچے اُونچے قہقہے

یہ لب و رُخسار کی آرائشیں کس کام کی
اس سحر کے شہد میں شامل ہے تلخی شام کی

توڑ دو لاکٹ گلے کا نوچ لو کانوں کے پھول
پھینک دو پوڈر کے ڈبے ڈال دو فیشن پہ دھول

ذکر خون کربلا کی ہونٹ پر سرخی ملو
ادھ جلے خیموں کا اپنی آنکھ میں کاجل بھرو

ان کے ماتھے پر بناوٹ کا بھلا جھومر کہاں
جن کی پیشانی کو چمکاتے ہوں سجدوں کے نشاں

مانگ میں سیندور بھر لو کربلا کی خاک سے
حسن کا پیکر بنو نور شہؑ لولاک سے

رائیگاں جائے نہ زینبؑ کی اسیری کا مال
غیرت کرب و بلا کرتی ہے پردے کا سوال

تم ہوئیں بے پردہ تو پھر تم کو پہچانے گا کون
زینبؑ و کلثومؑ کے ایثار کو مانے گا کون

یاد رکھنا حشر کے میداں میں جانا ہے تمہیں
فاطمہ زہراؑ کو اپنا منہ دکھانا ہے تمہیں

۲۔ کربلا کے دو اسیر

''کربلا کے دو اسیر'' نامی کتابچہ سیف زلفی کے تخلیقی ذہن کا عکاس ہے۔ بتیس صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی شخصیت اور کارناموں کے حوالے سے مسدس کے سترہ بند ہیں جبکہ دوسرے حصے میں جناب سید سجادؑ کے وقیع کارناموں کے حوالے سے تیس بند شامل ہیں۔ مجموعی طور پر کتابچہ رضا احمد کے نام معنون ہے جبکہ پہلا مسدس زیبا رضا زیدی اور دوسرا رضا احمد کے نام انتساب کیا گیا ہے۔ اس کتابچہ کے آغاز میں یہ ضابطہ درج ہے:

با اہتمام:	سیف الاسلام سیف غازی
پبلشر:	غازی پبلی کیشنز غازی ڈیکوریشن سروس جمشید روڈ، کراچی غازی پبلی کیشنز 62/B علامہ اقبال روڈ، لاہور
پریس:	قلمکار پرنٹنگ پریس، 71-لیاقت بازار ایم۔اے جناح روڈ، کراچی
قیمت:	ایک روپیہ

اس کتاب میں سن تخلیق یا اشاعت درج نہیں ہے تاہم راقم الحروف نے درج ذیل ذرائع سے اس کا سن تخلیق ۱۹۷۰ء قرار دیا ہے۔

(۱) عفت حسن ''سیف زلفی شخصیت و فن'' مقالہ ایم۔اے (اردو) پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۹۲ء ص ۶۸

(۲) محمد رفیق بلوچ ''سیف زلفی۔ احوال و آثار'' مقالہ ایم۔فل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ۱۹۹۴ء ص ۵۰

اس کتابچہ کے آخر میں سیف زلفی کی دو تصانیف ''ہمارے ہیں حسینؑ'' اور ''زندہ لہو'' (غزلیات) کے اشتہارات موجود ہیں۔

''کربلا کے دو اسیر'' کے پہلے حصہ میں سیف زلفی نے شیر خدا کی شیر دل بیٹی حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے وقیع کارناموں کو پیش کیا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ حضرت زینبؑ خدائے خلق کی وحدت، رسول حق کی قیادت، علیؑ کے رعب شجاعت، بتولؑ پاک کی عظمت، حسنؑ کے تخت صداقت اور کرب و بلا کے حسینؑ کی مزاج شناسی کا نام ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب یزید شہادت حسینؑ کے بعد فاتح کی حیثیت سے تخت پر براجمان تھا تو زینب سلام اللہ علیہا نے اس کے غرور کو ملیامیٹ کر دیا۔

خونِ حسینؑ پاک دکھانے کا عزم ہے　　تحریک انقلاب جگانے کا عزم ہے
کوفے کو کربلا سے ملانے کا عزم ہے　　پرزے یزیدیت کے اڑانے کا عزم ہے

منزل بہت کڑی ہے مگر یہ دلیر ہے
بنتِ علیؑ کی اپنے ارادے میں شیر ہے

سیف زلفی حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے وقیع کارناموں کے بیان کے بعد واضح کرتے ہیں کہ آج اسلام حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی بے پناہ ریاضت اور محنت کے نتیجہ میں زندہ و پائندہ ہے:

بی بی! یہ تیرے باغ ریاضت کا ہے ثمر　　مخلوق آج دین خدا سے ہے بہرہ ور
بنیاد عشق حق ہے محمدؐ کی آل پر　　پرچم حسینیت کے کھلے ہیں نگر نگر

اب ہے زبان خلق پر چرچا حسینؑ کا
بجتا ہے کائنات میں ڈنکا حسینؑ کا

''کربلا کے دو اسیر'' کے دوسرے حصہ میں سیف زلفی نے اسیر کربلا و شام حضرت امام زین العابدینؑ کی شخصیت کے گراں قدر پہلو اجاگر کیے ہیں۔ سیف زلفی کا خیال ہے کہ حضرت عابدؑ عروج عظمت انسان، مدار کعبہ ایمان، سکون خاطر یزداں، خدا کا بولتا قرآں، بہار

دین الٰہی، خدائے عزم کی تصویر، کتاب صبر کی تحریر، زبان وقت کی تقدیر، مہر کمال کی تنویر، مصدر ایمان و آگہی، منبع عرفان و آگہی اور حسینیتؑ کا مہکتا ہوا لہو ہیں۔ حضرت عابد علیہ السلام نے یزیدی فوج کا ہر ظلم و ستم سہا لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ ان کے اس طرزِ عمل نے یزید کو شکست فاش دی اور کلمہ اسلام کو زندہ و تابندہ کر دیا:

عابدؑ نحیف و زار مگر آہنی فصیل　　عابدؑ شکستہ حال مگر فتح کی دلیل
عابدؑ رسن نصیب مگر خلق سے جمیل　　عابدؑ اسیر ظلم مگر دین کا وکیل

سر تا قدم محافظ تقدیر لا الٰہ
عابدؑ ہر ایک گام پہ تفسیر لا الٰہ

حضرت عابدؑ نے اسیر ہونے کے باوجود یزیدی دربار میں جو خطبے دیئے ہیں وہ ان کی عظمت پر دال ہیں۔ سیف زلفی نے امام عالی مقام کی صفات بیان کرنے کے بعد واضح کیا ہے کہ عصر حاضر میں امام زین العابدینؑ کی کوششوں سے اسلام سرخرو ہے۔

ہیں آپ وہ مورخ میدان کربلا　　جھیلی ہے جس نے یورش طوفان کربلا
ہے جس کا خون خون شہیدان کربلا　　دربار شام میں بھی نگہبان کربلا

تاریخ کربلا کی ہے پائندہ آپ سے
خونِ حسینؑ آج بھی ہے زندہ آپ سے

اس تصنیف کے بارے میں اختر حسین شیخ رقم طراز ہیں:

''......کربلا کے دو اسیر، کربلا کی شیر دل خاتون جناب زینبؑ اور سید سجاد کے عظیم کردار کا مختصر خاکہ ہے جو مسدس کی صورت میں قلمبند کیا گیا ہے۔ الفاظ کا شکوہ اور جلال و جمال ملاحظہ ہو جیسے ندی، پہاڑی گزرگاہ میں رواں......'' (۲۷)

---

(۲۷) اختر حسین شیخ ''شمشیر براں'' کراچی: ماہنامہ ''سرگزشت'' جنوری ۱۹۹۳ء، ص ۴۷

تابناک کربلا

سیف زلفی کا تیسرا مجموعہ کلام ''تابناک کربلا'' کے نام سے ۱۹۷۶ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اسی صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ کلام اپنے اندر منظومات' منقبت' سلام' قطعات اور رباعیات سموئے ہوئے ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ غلام محمد قاصر (استاد شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج مردان) نے ۲۵ دسمبر ۱۹۷۵ء کو ''خبر ہونے تک'' کے عنوان سے تحریر کیا تھا۔ سیف زلفی نے یہ کتاب اپنے والد ماجد سید مقبول حسین رضوی مرحوم کے نام معنون کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''...... والد مرحوم سید مقبول حسین رضوی کے نام جن کا سایہ سر سے اُٹھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے جیسے میں ننگے سر دھوپ میں کھڑا ہوں۔'' (۲۸)

''تابناک کربلا'' محرم الحرام کے ابتدائی ایام عزا کے حوالے سے لکھی گئی منظومات پر مشتمل ہے۔ ان نظموں میں اے ماہ محرم کے ہلال' تیرا نام زندہ ہے حسینؑ' کربلا میں امام کی آمد' دعوت فکر' تابناک کربلا' ہراول فوج حسینؑ' زینبؑ کے لالؑ' جناب حضرت قاسم ابن حسنؑ' شہزادہ علی اکبرؑ' شجاعت کے شاہکار' مرد سپاہی' شام غریباں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں ایک سلام چند مسدس اور قطعات و رباعیات بھی موجود ہیں۔ سیف زلفی کے دو طویل مرثیوں کے جزوی اقتباسات بھی علمدار فوج حسینؑ'' اور ''سپاہی چھ ماہ کا'' کے عنوانات سے شامل کتاب ہیں۔

''تابناک کربلا'' شاعر دربار محمد سیف زلفی کی عزائی شاعری کا بے مثال مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں سیف زلفی نے اپنے عقیدے کو شعری لباس پہنایا ہے لیکن کمال یہ ہے کہ اعتقادات سطحی محسوس نہیں ہوتے بلکہ ان میں عالمگیریت کا احساس اُجاگر ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس مجموعے کی منظومات اپنے اندر بے پناہ فکری وسعت رکھتی ہیں۔ اس حوالے سے غلام محمد قاصر رقم طراز ہیں:

---

(۲۸) سیف زلفی' تابناک کربلا' لاہور: غازی پبلی کیشنز' ۱۹۷۶ء' ص ۲

''......''تا بخاکِ کربلا'' کی نظموں کے انتخاب میں ایک تو عشرہ محرم میں پڑھی جانے والی مجالس عزا کی ترتیب اور روایات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے اور دوسری جانب واقعات کا تاریخی تسلسل بھی شاعر کے پیش نظر رہا ہے اور یوں ان کی بعض انتہائی موثر اور اہم نظمیں انتخاب سے رہ گئی ہیں تاہم موجودہ صورت میں بھی یہ مختصر سا مجموعہ قلب و روح پر ایک دیرپا اثر چھوڑتا ہے......''(۲۹)

سیف زلفی کی یہ عزائی نظمیں ایک گہرا تاثر چھوڑتی ہیں اور پڑھنے والا اپنے آپ کو کربلا کے میدان میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ اب ذیل میں سیف زلفی کی معروف نظموں میں سے شعری اقتباسات ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ سیف زلفی نے کس طرح فن اور فکر کو یکجا کر دیا ہے۔

تو ہے ہم زندہ دلان عشق کا پیک خیال
تجھ سے ہی ذہن و نگاہ و دل کو ملتا ہے جمال
تیرے تیور سے ٹپکتا ہے شجاعت کا جلال
اے محرم کے ہلال

(اے ماہ محرم کے ہلال)

حضور غور کیجئے:

یہ چار دن کی زندگی
یہ اصل زندگی نہیں
یہ زندگی ہے امتحاں
اور امتحاں بھی سخت ہے
وہی ہے اس میں کامراں
کہ جو بلند بخت ہے

---

(۲۹) غلام محمد قاصر ''تا بخاکِ کربلا'' لاہور: غازی پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء، ص ۷

وہی بلند بخت ہے
کہ جس کا ذہن ہے رسا
اسی کا ذہن ہے رسا

یہ لطف خاص دوستو
خدا ہے جس پہ مہرباں
(دعوتِ فکر)

حضور غور کیجیے:

کیا ہے ظلم سے بند پانی
کہ تنگ ہو مصطفیٰ کا جانی
مگر

حسینؑ جری کو دیکھو مقابلہ میں ڈٹا ہوا ہے
لہو میں اپنے اٹا ہوا ہے
جوان بیٹے کے تازہ خوں میں نہا رہا ہے
جوان بھائی کے گرم بازو اٹھا رہا ہے
جوان بھتیجے کی لاش گٹھڑی بنا کے خیمے میں لا رہا ہے
صغیر بچے کا جسم نازک زمیں کے اندر چھپا رہا ہے
نظر میں خیمے دھواں دھواں ہیں
جناب زینبؑ کی بے کسی ہے
جناب عابدؑ کی بیڑیاں ہیں
مگر

حسینؓ جری کو دیکھو
لہو کے دریا میں غرق ہو کر
نبی کی کشتی بچا رہا ہے

(تابخاکِ کربلا)

''تابخاکِ کربلا'' دو اعتبار سے قابلِ توجہ ہے۔ اول یہ کہ اس میں سیف زلفی نے فکری اعتبار سے امام عالی مقام کے کردار کے نمایاں محاسن پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے کارناموں کو تاریخی' سیاسی اور تہذیبی پس منظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس تصنیف میں سیف زلفی نے ہیئت کے بے شمار تجربے کیے ہیں۔ اے ماہ محرم کے ہلال' تیرا نام زندہ ہے حسینؓ' کربلا میں امام کی آمد' دعوت فکر' تابخاکِ کربلا' مرد سپاہی اور دیگر نظموں میں مختلف ہیئتیں استعمال کی گئی ہیں۔ اس تصنیف کے بارے میں غلام محمد قاصر کی یہ رائے انتہائی وقیع ہے:

> ''......تابخاکِ کربلا کی اشاعت قوم میں جذبہ فکر و عمل بیدار کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے جو ہمارے شاعر کا بارگاہ حسینی میں سب سے بڑا خراج عقیدت ہے۔ اُمید ہے کہ سیف زلفی کی اس کاوش کو مذہبی' علمی اور ادبی حلقوں میں یکساں محبت اور احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا......'' (۳۰)

روشنی

سیف زلفی کی جدید نعتوں کا مجموعہ ''روشنی'' کے نام سے ۱۹۷۹ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ ایک سو چھتیس صفحات پر مشتمل یہ کتاب حلقہ اہلِ قلم لاہور نے شائع کی۔ اس کتاب کے ضابطہ پر یہ عبارت درج ہے:

---

(۳۰) غلام محمد قاصر ''تابخاکِ کربلا'' لاہور: غازی پبلی کیشنز' ۱۹۷۶ء' ص ۸

نعتیہ مجموعہ: روشنی

شاعر: سید سیف زلفی

کتابت: آفتاب برادرز

سرورق: اسلم کمال

ناشر: حلقہ اہل قلم، لاہور

پریس: چودھری پریس، 17۔ ریلوے روڈ، لاہور

کتاب منگوانے کا پتہ: سید رضا شہاب، سید رضا انتخاب
62۔ بی علامہ اقبال روڈ، لاہور

(اس کتاب کے تمام حقوق سید رضا شہاب اور سید رضا انتخاب کے لیے محفوظ ہیں)

''روشنی'' میں نعتوں کے علاوہ نعتیہ رباعیات بھی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ تضمینیں بھی اس کتاب کی رونق دوبالا کرنے کا سبب ہیں۔ روشنی کا انتساب سید اسد بخاری کے نام کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ عبدالجبار لطیفی نے ''روشنی کا شاعر'' کے نام سے ۱۴ جنوری ۱۹۷۸ء کو رقم کیا ہے۔ اس مجموعہ کے آغاز (ص ۳) میں سیف زلفی کی تصویر کے نیچے یہ شعر تحریر ہے:

لاہور کی زمین سے زلفی بہ فیض عشق
میں روز دیکھتا ہوں مدینہ رسولؐ کا

سیف زلفی حضور اکرمؐ سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں اور ''روشنی'' نامی مجموعہ نعت بھی ان کی عقیدت کا مظہر ہے۔ سیف زلفی نے اس مجموعے میں عام نعت گو شعراء کی روش کو اختیار کرنے کے بجائے اپنے لیے ایک علیحدہ راستہ اختیار کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو احمد ندیم قاسمی کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

''......یہ مجموعہ ان معنوں میں تو یقیناً نعتوں پر مشتمل ہے کہ یہ حضورؐ کی تعریف وتوصیف اور عقیدت ومحبت میں لکھے ہوئے اشعار ہیں مگر نعت میں وہ جو غزل کا سا دھیما پن اور والہانہ پن ہوتا ہے اس کی جگہ قصیدے کے بلند

بانگ انداز نے لے لی ہے اور اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حضورؐ
پاک کی شان میں لکھے ہوئے یہ قصائد نعتیہ قصائد متعدد پہلوؤں سے جدید
بلکہ جدید تر ہیں اور اگر ہم انہیں نعتیں قرار دیں تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ زلفی کا
انداز نعت گوئی قطعی طور پر مختلف اور منفرد ہے کیونکہ اس میں نعت گوئی کی عام
روش اختیار نہیں کی گئی بلکہ قصیدے اور کہیں کہیں مرثیے اور پھر کہیں کہیں سلام
کا سا لہجہ برتا گیا ہے۔(۳۱)''

''روشنی'' کی نعتوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیف زلفی حضور اکرمؐ سے عقیدت رکھتے ہیں اور اس عقیدت میں بے پناہ احترام بھی شامل ہے۔ ایک جانب تو سیف زلفی نے اپنی نعتوں میں حضورؐ کی سیرت کے نمایاں پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی سعی کی ہے اور دوسری جانب ان نعتوں کے ذریعے اپنے معاشرے کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے حضورؐ سے دست گیری کی التجا کی ہے۔ اس حوالے سے حفیظ تائب کی یہ بات بالکل درست ہے:

''......سید سیف زلفی کی نعت میں روح عصر جا بجا سانس لیتی نظر آتی ہے۔ وہ
اپنے عہد کے تمام مسائل و مصائب، دربار رسالتؐ میں بیان کرتا ہے اور
معاشرے کی خرابیاں لکھتے ہوئے اس کے قلم سے کوئی نہیں بچتا......''(۳۲)

سیف زلفی کی نعتوں میں رنگ و نور کے کئی اچھوتے زاویے محسوس ہوتے ہیں۔ انہوں نے رسول اکرمؐ کو محض اسلامی نہیں بلکہ آفاقی نمائندہ قرار دیا ہے اور احساس دلایا ہے کہ اگر انسان جذب دل سے نعت کہے تو اس میں ایک دل گداز کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر کرار حسین کی ''روشنی'' کے بارے میں رائے ملاحظہ فرمایئے:

''......کوئی ایک ہفتہ ہوا میری نظر اتفاقاً اس کتاب پر پڑی۔ کتاب
پڑھی تو جذبہ کی سچائی اور گہرائی پر اور اظہار کے حسن اور سلیقہ پر حیران

---

(۳۱) احمد ندیم قاسمی ''سیف زلفی کا طرز نعت گوئی'' لاہور: ماہنامہ شام و سحر اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۲۸

(۳۲) حفیظ تائب ''سیف زلفی کی نعتیہ شاعری'' لاہور: ماہنامہ شام و سحر اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۳۱

رہ گیا......'' (۳۳)

اب چند باتیں ''روشنی'' کے اسلوب کے حوالے سے بھی سن لیجیے۔ سیف زلفی نے نعت کی مخصوص ہیئت سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف ہیئتوں اور اصناف میں نعتیں لکھی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان نعتوں میں جوش و جذبہ کی فراوانی محسوس ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر رواں دواں ہے۔ اس حوالے سے سب سے پہلے ڈاکٹر آغا سہیل کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

''...... زیر تبصرہ مجموعہ نعتوں سے متعلق ہے جس میں مخمس، مسدس، مربع، ترکیب بند، ترجیع بند اور نظم معریٰ سب کچھ موجود ہے۔ ہیئت کی خوبی اور مواد کی عمدگی دونوں بجائے خود احسن ہیں اور یہاں تو جوش و ولولے کا ایک سمندر ہے کہ جو شاعر کے بطون میں جاری و ساری ہے۔ (۳۴)

حقیقت یہ ہے کہ سیف زلفی کے موضوعات و اسالیب میں ہم آہنگی ملتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ہاں نعت کی متنوع ہیئتیں بھی قارئین کو منفرد ذائقہ عطا کرتی ہیں۔ اس حوالے سے تقی جالب کی یہ رائے ہمارے موقف کی تائید کرے گی:

'' ''روشنی'' میں اظہار اور اسلوب بیان کے نئے نئے تجربے ہیں لیکن یہ ابلاغ و مفہوم سے عاری نہیں بلکہ حقائق اور معنی کو دھوپ کی طرح واضح اور روشن کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ روشنی ہماری نعتیہ اور مدحیہ شاعری میں یقیناً ایک بیش بہا اضافہ ہی نہیں نئے شعراء کے لیے ایک نیا راستہ، پیغام اور جہت بھی ہے......'' (۳۵)

اب آخر میں ''روشنی'' کے دیباچہ نگار عبدالجبار لطیفی کی یہ رائے بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

---

(۳۳) کرار حسین، پروفیسر ''مکتوب بنام سیف زلفی'' کراچی: المرقومہ ۱۸ مئی ۱۹۷۸ء، ص ۱

(۳۴) آغا سہیل، ڈاکٹر ''تبصرہ (روشنی) غیر مطبوعہ لاہور، مرقومہ ۲۶ جنوری ۱۹۶۸ء، ص ۱

(۳۵) تقی جالب ''روشنی پر رائے'' غیر مطبوعہ مملوکہ راقم الحروف المرقومہ ۱۸ اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۲

"......روشنی آپ کی جدید نعتوں کا مجموعہ ہے جس میں ایک ذہین، صاحب طرز فن کار اور عاشق رسولؐ نے اپنے ممدوح کو خراج عقیدت اس محبت اور وسعت سے پیش کیا ہے جیسا کہ پیش کرنے کا حق ہے......"(۳۶)

سیف زلفی کی تصنیف "روشنی" کی بے حد قدرومنزلت ہوئی اور پورے پاکستان میں اس کتاب کی تقاریب رونمائی منعقد ہوئیں۔ اخبارات میں کالم لکھے گئے اور مختلف رسائل میں اس پر تبصرے ہوئے۔ "روشنی" کے حوالے سے ظہور حیدر جارچوی کی درج ذیل نظم علمی و ادبی حلقوں میں بڑی مقبول ہوئی۔

روشنی

ظہور حیدر جارچوی

بخش دی حق نے جو علم و آگہی کی روشنی　　بن گئی عشق نبیؐ سے زندگانی روشنی
نعت محبوب خدا کی دھوم ہے محفل میں آج　　دو ہی باتیں ہیں زباں پر سیف زلفی روشنی
سیف زلفی کی عقیدت سے وہ پھیلی ہے حنا　　آج ہے بزمِ ادب میں روشنی ہی روشنی
کیوں نہ چمکیں کہکشاں کی طرح مصرعے نعت کے　　جذب ہے اس میں عقیدت کی گلابی روشنی
گوش دل سے نعت محبوب خدا سن لے اگر　　تیرگی کو ہو میسر جاودانی روشنی
جدت الفاظ نے رنگیں چراغاں کر دیا　　روشنی میں جلوہ گر ہے ہر طرح کی روشنی
نور محبوب خدا سے ایسی چمکی ہے کتاب　　سر چھپاتی پھر رہی ہے آفتابی روشنی
سیف زلفی کا قلم چلتا ہے مثل ذوالفقار　　حیدریؔ شاعر کو حاصل ہے حسینیؑ روشنی

کر دیا نذرانہ دل پیش ہم نے بھی ظہور
جب نظر آئی برائے رونمائی روشنی (۳۷)

---

(۳۶) عبدالجبار لطیفی "روشنی کا شاعر" (دیباچہ) لاہور: حلقۂ اہل قلم ۱۹۷۶ء، ص ۱۱

(۳۷) ظہور حیدر جارچوی صاحب کی یہ نظم راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔ موصوف نے یہ نظم ۱۹ مئی ۱۹۷۸ء کو تحریر کی تھی۔

اب ذیل میں سیف زلفی کی معروف نعتوں سے چند اشعار پیش کیے جارہے ہیں:

توصیف تری خامہ جدت سے لکھوں گا
میں تیرا سراپا نئی صورت سے لکھوں گا
میں روئے محمدؐ کا پرستار ہوں زلفیؔ
یہ پیار کی باتیں ہیں محبت سے لکھوں گا

....

اپنی امت کو پلائیں نور کی دھاریں حضورؐ
ان گلابوں کو عطا ہوں پھر سے مہکاریں حضورؐ
فرقہ فرقہ ہو گئی افسوس اُمت آپؐ کی
کھنچ گئی ہیں ایک گھر میں کتنی دیواریں حضورؐ
اپنے ہی بھائی کے ہاتھوں اپنے ہی بھائی کا خون
اپنی ہی گردن ہے اور اپنی ہی تلواریں حضورؐ

....

اگر وہ چاہے
تمام عالم کو ایک پل میں بدل ہی ڈالے
اگر وہ چاہے
تو قلب مغرب سے آفتاب سحر نکالے
وہ حکم دے
تو پہاڑ اپنے ہر ایک ذرے کو آب کر دے
اگر وہ چاہے
تو ایک پل میں سمندروں کو سراب کر دے
ہوائیں اس کی گھٹائیں اس کی

زمین اس کی ہے باغ اس کے
ہے رات اس کی چراغ اس کے
مکین اس کے مکان اس کے
زمین تو کیا آسمان اس کے
خدا کا بندہ ہے وہ محمدؐ
مگر تمہیں کچھ خبر نہیں ہے
(اقتباس: نظم وسیلہ)

انسانیت کے چہرہ افضل کی روشنی
وہ آدمی ہے آخر و اول کی روشنی
خورشید کی سپاہ مسلسل کی روشنی
صدیوں پہ پھیلتی ہوئی اک پل کی روشنی

لایا ہے وہ فلک سے اُجالے زمین پر
ورنہ تمام رنگ تھے کالے زمین پر
(مسدس رسولؐ سے اقتباس)

نور

سیف زلفی کا شعری مجموعہ ''نورؐ'' ۱۹۸۰ء میں طبع ہوا۔ اس مجموعے میں دو کلیدی نظمیں ''یا فاطمہ بنت علیؑ'' اور ''علیؑ امام من است ومنم غلام علیؑ'' شامل ہیں۔ ''یا علیؑ یا علیؑ'' کے عنوان سے ایک نظم بھی اس مجموعے کی زینت بڑھا رہی ہے۔ اس کے علاوہ سلام، نوحہ اور قطعات و رباعیات بھی اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ضابطہ کے عنوان سے یہ تحریر ہے:

(اس کتاب کے تمام حقوق سید رضا شہاب اور سید رضا منتخب کے لیے محفوظ ہیں)

مصنف: سید سیف زلفی
ناشر: مکتبہ نسیم حیدر
تاریخ اشاعت: نومبر ۱۹۸۰ء

تعداد: ایک ہزار

کتابت: شریف شیوہ

قیمت: دس روپے

پتہ: بوگی روڈ بلاک نمبر ۲۷ ریلوے کالونی لاہور

پرنٹر: اکبر امین پریس

مکتبہ نسیم حیدر

یکے از مطبوعات حلقہ اہل قلم

سیف زلفی نے یہ کتاب اپنی والدہ اور بڑے بھائی سید وقار حسین رضوی کے نام معنون کی ہے۔ آغاز میں سیف زلفی نے اس کتاب کی تشکیل وتخلیق کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی ہے اور واضح کیا ہے کہ اس کتاب کی منظومات ایک منت کی تکمیل کا حصہ ہیں وہ رقم طراز ہیں:

> ''...... یہ نظم میں نے آپریشن کے بعد منت کے طور پر لکھی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے محمدؐ و آل محمدؐ کے کرم سے ان کے حضور نعت ومنقبت کے کافی پھول کھلائے ہیں اور انشاء اللہ اس عظیم سرکار کا اس غلام بے درم پر کرم وفیض رہے گا' لکھتا رہوں گا......'' (۳۸)

نورؔ کے آغاز میں پروفیسر حفیظ الرحمٰن سحابی نے '' کچھ شاعر کے بارے میں'' کے عنوان سے ایک مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں سیف زلفی کی شخصیت اور فن کے ساتھ ساتھ اس کتاب کے حوالے سے بھی چند نکات پیش کیے ہیں۔ موصوف اس کتاب نورؔ کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''...... سیف زلفی کی کتاب نورؔ دیکھ کر میں ''شاعری جزویست از پیغمبری'' کا قائل ہو گیا ہوں ...... محبت وعقیدت سے چھلکتے ہوئے یہ شعر قاری پر ایک کیف طاری کرتے ہیں......'' (۳۹)

---

(۳۸) سیف زلفی' نور' لاہور: مکتبہ نسیم حیدر' ۱۹۸۰ء' ص ۱۰

(۳۹) حفیظ الرحمٰن خان' پروفیسر '' کچھ شاعر کے بارے میں'' مقدمہ نور' لاہور: مکتبہ نسیم حیدر' ۱۹۸۰ء' ص ۷

''نورؑ'' کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سیف زلفی محمدؐ و آل محمدؐ سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ ان منظومات میں حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا اور حضرت علی علیہ السلام کی سیرت کے نمایاں محاسن ہی اُجاگر نہیں کیے گئے ہیں بلکہ ان کو عصر حاضر کے لیے نمونہ تقلید بھی قرار دیا گیا ہے۔ سیف زلفی کے نزدیک حضرت فاطمہؑ خاتون جنت ہونے کے ساتھ ساتھ ہر دور کی خواتین کے لیے نمونہ حیات بھی ہیں۔ اسی طرح حضرت علیؑ اس کائنات میں رسولؐ اکرم کے بعد افضل ترین ہستی ہیں اور جو لوگ حضرت علیؑ کی پیروی کر لیں گے وہ کامیاب و کامران ہو جائیں گے۔

''نورؑ'' کا اسلوب شعر رواں ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش نے اشعار کے حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ خوبصورت تراکیب اور دلنشیں مرکبات نے اس مجموعہ کلام کی اہمیت کو دو چند کر دیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے حوالے سے اکرام امام رضوی رقمطراز ہیں:

> ''......ہم اس ایمان افروز کتاب کی اشاعت پر شاعر سیف زلفی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں......'' (۴۰)

اب ذیل میں اس کتاب ''نورؑ'' کے چند اشعار قارئین کی خدمت میں پیش ہیں:

یا فاطمہؑ

یا فاطمہؑ بنت نبیؐ یا سیدہ یا فاطمہؑ
مومنین کے رب کی قسم

خاتون جنت آپ ہیں
تبلیغ مذہب کی قسم

جان رسالتؐ آپ ہیں
مہتاب یثرب کی قسم

---

(۴۰) اکرام امام رضوی ''مختصر رائے (نور)'' ایضاً ص ۱۱۱

نورِ نبوت آپ ہیں
یزداں کے ناموں کی قسم
اوصافِ وحدت آپ ہیں
گیارہ اماموں کی قسم
اصلِ امامت آپ ہیں
قرآن و سنت کی قسم
قرآن و سنت آپ ہیں
دینِ مشیت کی قسم
دینِ مشیت آپ ہیں
حق کی صداقت کی قسم
حق کی صداقت آپ ہیں
انسانیت کا شہر ہیں
یزدانیت کی نہر ہیں

(یا "فاطمہ بنت نبیؐ" سے ایک بند)

....

علیؑ نجات کے دریا کی ایک کشتی ہے
کوئی علیؑ سے ہے شہباز کوئی چشتی ہے
علیؑ کا چاہنے والا ہر اک بہشتی ہے
رہے گا عیش سے جنت میں ہر غلام علیؑ

علیؑ امام من است و منم غلام علیؑ

("تضمین علیؑ امام من است و منم غلام علیؑ" سے ایک بند)

....

عشق چمن حق سے معطر ہوں گے
ہم پیرو سلمانؓ و ابوذرؓ ہوں گے
ہم مالک جنت کے ہیں خادم زلفی
ہو گا جہاں آقا وہیں نوکر ہوں گے

(قطعات ورباعیات)

....

ٹکڑے ٹکڑے آدمی

سیف زلفی کی غزلوں کا اولین مجموعہ ''ٹکڑے ٹکڑے آدمی'' کے نام سے ۱۹۸۴ء میں طبع ہوا۔ ایک سو اٹھائیس صفحات پر مشتمل اس مجموعہ کلام میں صرف غزلیں شامل ہیں۔ یہ کتاب مختار علی خاں پرتو روہیلہ، مرتضیٰ برلاس اور رضا احمد غازی کے نام معنون کی گئی ہے تاہم آغاز میں ''ابا کے لیے دوشعر'' اور ''اماں کے لیے دوشعر'' پیش کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے ضابطے میں یہ درج ہے:

(جملہ حقوق بحق رضا شباب اور رضا انتخاب محفوظ)

نام: ٹکڑے ٹکڑے آدمی

تاریخ اشاعت: جنوری ۱۹۸۴ء

سرورق: اسلم کمال

تعداد: گیارہ سو

قیمت: ۲۵ روپے

کتابت: ادارہ فروغ کتابت ہسپتال روڈ لاہور

ناشر: حلقہ اہل قلم لاہور

منگوانے کا پتہ: 62-بی علامہ اقبال روڈ لاہور

سیف زلفی ایک طویل عرصے سے غزل گوئی کر رہے تھے۔ ان کی غزلیں برصغیر

پاک و ہند کے معروف رسائل میں شائع ہو کر ارباب دانش سے داد و تحسین حاصل کرتی تھیں اس سلسلے میں اختر حسین شیخ رقم طراز ہیں:

"...... سیف زلفی کی غزلوں کا مجموعہ "ٹکڑے ٹکڑے آدمی" ۱۹۸۲ء میں منصۂ شہود پر آیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ راتوں رات اس کی غزل پر عاشق ہو گئے۔ یہ عمل ۱۹۴۸ء سے بتدریج جاری تھا۔ اس وقت جب وہ لاہور اور بیرون لاہور منعقد ہونے والے مشاعروں میں تہلکہ مچایا کرتا تھا یا برصغیر کے ادبی رسائل میں اس کا کلام چھپا کرتا تھا۔ فنون' ادب لطیف' نقوش' ادبی دنیا' لیل ونہار' اوراق' سیپ اور بھارت' میں شائع ہونے والے مختلف جرائد اس کا کلام بڑے اہتمام سے چھاپتے تھے۔ ۱۹۶۸ء میں اس کا اپنا ادبی رسالہ "گلفشاں" چھپنے لگا۔ اس کا کلام ٹی وی' ریڈیو پر بھی نشر ہوا کرتا تھا۔ گویا وہ ہر پل خوبصورتی کو پسند کرنے والوں کی نگاہ میں تھا"۔(۳۱)

سیف زلفی نے رسائل میں اپنی غزلوں کی پذیرائی دیکھ کر انہیں مجموعے کی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے مجموعہ کلام کا نام "زندہ لہو" رکھا اور مختلف کتب میں اس کے اشتہارات بھی شائع ہوئے۔ اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر وزیر آغا نے تحریر کیا۔ خدا جانے کیا اسباب ہوئے جن کی بنا پر یہ مجموعہ کلام "ٹکڑے ٹکڑے آدمی" کے نام سے طبع ہوا تو اس میں دیباچہ ڈاکٹر طارق عزیز کا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اہل علم وادب نے اس کی بے حد پذیرائی کی اور سیف زلفی غزل گو شعراء کی صف اول میں شمار ہونے لگے۔ اس کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر طارق عزیز رقمطراز ہیں:

"...... سیف زلفی روایت کا گہرا شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے تقاضوں سے بھی اچھی طرح واقف ہیں اسی لیے ان کی شاعری ایک مخصوص

---

(۳۱) اختر حسین شیخ "شمشیر براں" کراچی: ماہنامہ سرگزشت' جنوری ۱۹۹۳ء' ص ۷۸

فنی شخصیت رکھتی ہے......" (۴۲)

سیف زلفی کو ابتداء ہی سے اپنی غزلوں کی بدولت شہرت حاصل ہوئی۔ اردو کے تمام معتبر ناقدین سیف زلفی کی غزلوں کے محاسن بیان کرنے لگے ہیں۔ سب سے پہلے ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک مکتوب ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے ادبی دنیا کے مدیر کی حیثیت سے سیف زلفی کو بھیجا تھا:

"...... ۵۸۔ سول لائنز

۳ مئی ۱۹۶۳ء

محترمی سیف زلفی صاحب

السلام علیکم!

خط ملا۔ غزل بھی موصول ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی یہ غزل بھی ادبی دنیا میں چھپنے والی پہلی غزل کی طرح بہت پسند کی جائے گی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ آپ کی غزلوں میں ایک تازگی ہے اور نکھار! بالکل ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح! غزل میں اپنی "آواز" پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن آپ کی دو تین غزلوں کے مطالعہ کے بعد ہی ایک نئی آواز کا احساس ہونے لگتا ہے۔ خدا کرے آپ اسی لگن اور انہماک سے لکھتے رہیں اور باہر کی کوئی "آواز" آپ کو اپنی روش سے ہٹانے کی کوشش نہ کرے۔ بہر حال آپ کی یہ غزل پا کر مجھے دلی خوشی ہوئی ہے۔ اگلے شمارے میں آ جائے گی۔ آپ کا ممنون ہوں۔ ادبی دنیا اسی ہفتے میں آ جائے گا۔

مخلص

وزیر آغا...... (۴۳)"

---

(۴۲) طارق عزیز ڈاکٹر "محبت اور امن کا شاعر (دیباچہ)" ٹکڑے ٹکڑے آدمی۔ سیف زلفی، لاہور: حلقہ اہل قلم، ۱۹۸۴ء، ص ۷

(۴۳) وزیر آغا، ڈاکٹر "مکتوب بنام سیف زلفی" سرگودھا، المرقومہ ۳ مئی ۱۹۶۳ء، ص ۱

"ٹکڑے ٹکڑے آدمی" کی اشاعت کے بعد اس کی تقریب رونمائی کا سلسلہ ہوا۔ پاکستان کے معروف شہروں میں اس کتاب کی پذیرائی کے لیے تقاریب منعقد ہوئیں اور معروف ناقدین اور دانشوروں نے سیف زلفی کو عصر حاضر کے جدید لہجے کا شاعر قرار دیا۔

لاہور میں منعقدہ ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی نے کہا:

> "...... سیف زلفی اردو غزل میں ایک ایسا لہجہ لے کر آئے ہیں جو سراسر ان کا اپنا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک خاص لہجہ متعدد عناصر کے ملاپ سے بنتا ہے اور ان عناصر میں ذاتی، ذہنی رجحانات کے ساتھ ہی شاعری کی روایات کے بعض حصے بھی شامل ہوتے ہیں مگر ایک منفرد لہجے والے شاعر کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ان عناصر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ یکجا کرتا ہے اور ان پر اپنی انفرادیت کی چھاپ لگاتا ہے۔ سیف زلفی کا سراغ ہمیں نظیر اکبر آبادی اور جوش ملیح آبادی کی شاعری میں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں ایک عجیب سی کھنک ہے اور وہ غزل میں دھیمے لہجے کے قائل نہیں معلوم ہوتے......" (۴۴)

"ٹکڑے ٹکڑے آدمی" کے حوالے سے سیف زلفی کی غزل کی پذیرائی کرنے والوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، قیصر بارہوی، مرتضیٰ برلاس، پرتو روہیلہ، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ناصر چودھری، سرفراز سید، اظہر غوری، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سعادت سعید، اسرار زیدی، یونس علی دلشاد، کرامت بخاری، ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری، رانا غلام شبیر، ڈاکٹر طارق عزیز اور سرور مجاز شامل ہیں۔ اب ذیل میں صرف تین اصحاب کی آراء ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت قیصر بارہوی فرماتے ہیں:

> "...... سیف زلفی نے جن مناظر سے دوسرے اساتذہ کو گزرتے ہوئے دیکھا وہ خود بھی ان میں سے گزرا ہے اس کے طرز عمل سے اس امر کا یقین ہو

---

(۴۴) احمد ندیم قاسمی "سیف زلفی جدید لہجے کا شاعر" لاہور: ماہنامہ شام و سحر" ۱۹۹۴ء ص ۴۳

جاتا ہے کہ جب انسان عزم کرلے تو اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ زلفی نے اپنے ہم عصر شعراء سے بہت کچھ حاصل کیا اور آئندہ نسلیں محبت اور عقیدت کے حوالے سے "ٹکڑے ٹکڑے آدمی" کا مطالعہ کریں گی تو یقیناً بہت کچھ حاصل کریں گی۔ زلفی نے اپنی تخلیقات میں ہر طرح کی معاشرتی صورت حال کا ذکر کیا ہے۔ وہ ایک زندہ شاعر ہے......" (۴۵)

ڈاکٹر سہیل احمد خاں رقمطراز ہیں:

"......سیف زلفی کا نام ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ایک شاعر کے طور پر زیادہ نمایاں ہوا اور اس زمانے میں فنون اور دیگر رسالوں میں ان کی غزلیات نظر سے گزریں۔ فنون میں احمد ندیم قاسمی نے ان کی چند غزلوں پر ایک تعارف بھی تحریر کیا تھا جس میں سیف زلفی اور شکیب جلالی کو نئے لہجے کا غزل گو شاعر قرار دیا گیا تھا۔ سیف زلفی کا لہجہ غزل میں بہت بلند آہنگ تھا اور ان کے ہاں لفظوں کی شان و شوکت گھن گرج بہت نمایاں تھی......" (۴۶)

مرتضیٰ برلاس سیف زلفی کی غزل کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

"......غزل میں جو محبوب کی منت سماجت کا روایتی انداز ہے وہ سیف کی غزل میں ناپید ہے۔ وہ محبوب کے سامنے سر جھکا کر نہیں سر اٹھا کر جاتا ہے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے یہ خود اختیاری اور سرکشیدگی کا انداز ہے......" (۴۷)

اب آخر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیف زلفی نے اپنے شعری مجموعے کا نام تبدیل کر کے "ٹکڑے ٹکڑے آدمی" کیوں رکھا؟ اس کا ایک سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ سیف

---

(۴۵) قیصر بارہوی "لاہور کی ادبی سرگرمیاں از اسرار زیدی" کراچی: ہفت روزہ "اخبار جہاں" ۲۳۔ فروری ۱۹۸۶ء، ص ۳۰

(۴۶) سہیل احمد خان، ڈاکٹر "مکتوب بنام عفت حسن" لاہور، مرقومہ ۱۹۔ اگست ۱۹۹۲ء، ص ۱

(۴۷) مرتضیٰ برلاس "مکتوب بنام عفت حسن" لاہور، مرقومہ ۱۱ ستمبر ۱۹۹۲ء، ص ۳

زلفی نے عصر حاضر کے آدمی کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا اس لیے اپنے شعری مجموعے کا نام یہ رکھ لیا اور دوسرا سبب بقول ڈاکٹر سعادت سعید یہ ہے کہ:

''......انہوں نے سماجی دباؤ اور اداراتی جبر کے خوفناک جبڑوں میں اذیت سہتے افراد کے لیے شاعری کی۔ وہ ایسا کیوں نہ کرتے وہ خود بھی تو ایسے ہی شکنجوں میں کسے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی غزلوں کے مجموعے کا نام ''ٹکڑے ٹکڑے آدمی'' یونہی تو نہیں رکھا تھا۔ جور زماں کی تیز درانتی نے ان کے جسم کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ ان کا دل کیوں بند نہ ہوتا جگر چھلنی چھلنی ہو چکا تھا......'' (۴۸)

حقیقت یہ ہے کہ سیف زلفی نے اپنے معاشرے میں جو کچھ دیکھا اور جس طرح محسوس کیا اسے سچائی کے ساتھ بیان کر دیا۔ اسی لیے ''ٹکڑے ٹکڑے آدمی'' حق و صداقت کی دستاویز بن گیا ہے۔ سرور مجاز رقمطراز ہیں:

''...... ''ٹکڑے ٹکڑے آدمی'' پر اظہار خیال کرنے والوں نے کہا کہ سیف زلفی زندگی کے حقائق کو بڑی جرأت اور حوصلے سے بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں......'' (۴۹)

اب ذیل میں سیف زلفی کے مجموعے ''ٹکڑے ٹکڑے آدمی'' سے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

ظلم کے خنجر تلے تڑپے نہ تڑپے آدمی
مقتلِ احساس میں ہے ٹکڑے ٹکڑے آدمی

اب قلم میں بین ہے لفظوں کی شہنائی نہیں
لکھ رہا ہے وقت کی قبروں کے کتبے آدمی

---

(۴۸) سعادت سعید، ڈاکٹر ''حریت فکر کا علمبردار۔ سیف زلفی'' لاہور: ماہنامہ ''شام و سحر''، جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۴۷

(۴۹) سرور مجاز ''ادبی باتیں'' لاہور: روزنامہ ''مشرق'' ۱۹ فروری ۱۹۸۶ء، ص ۴

انا کے موڑ پہ بچھڑے تو ہم سفر نہ ملے
ہم ایک شہر میں رہ کر بھی عمر بھر نہ ملے
نہالِ فن کا عجب رنگ فکر ہے ذلفی
جو اپنے خون سے سینچے اسے ثمر نہ ملے

....

اب کیا گلہ کریں کہ مقدر میں کچھ نہ تھا
ہم غوطہ زن ہوئے تو سمندر میں کچھ نہ تھا
یارو، وہ بانکپن سے تراشا ہوا بدن
فنکار کا خیال تھا پتھر میں کچھ نہ تھا

....

کپڑے ہی بدلتے نہ کبھی بال بناتے
ہم کس کی محبت میں برا حال بناتے
اڑنا ہے کڑی دھوپ میں معلوم جو ہوتا
کیوں موم کے ہم اپنے پر و بال بناتے

....

کوفہ کے قریب ہو گیا ہے
لاہور عجیب ہو گیا ہے
ہر دوست ہے میرے خوں کا پیاسا
ہر دوست رقیب ہو گیا ہے

....

ذہن کے تار بجے
صبح کے چار بجے

کوئی آہٹ نہ ہوئی
کان ہر بار بجے
آج تالی کی طرح
سارا سنسار بجے

....

زنداں قلم، صلیب قلم، کربلا قلم
ہے کتنی عظمتوں کا شناسا مرا قلم
جس سے قبائے ظلمت شب چاک چاک ہے
زلفی اسی چراغ کی لو ہے مرا قلم

....

چنگاریاں نہ ڈال مرے دل کے گھاؤ میں
میں خود ہی جل رہا ہوں دُکھوں کے الاؤ میں
ہے کوئی اہل دل، کہ خریدے مرا مزاج
میں زخم بیچتا ہوں محبت کے بھاؤ میں

لہو، چاند اور سویرا

سیف زلفی کی غزلوں، نظموں اور دوہوں پر مشتمل شعری تخلیق ''لہو، چاند اور سویرا'' ۱۹۸۹ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل اس مجموعہ کلام پر ضابطہ کے طور پر درج ہے:

(جملہ حقوق بحق نزہت فاطمہ اور گلناز فاطمہ محفوظ)

کتاب: لہو، چاند، سویرا
شاعر: سیف زلفی
کتابت: نذیر ہاشمی

قیمت: -/75 روپے

ناشر: پاکستان پیپلز پروگریسو رائٹرز لاہور

مطبع: اظہار سنز پرنٹرز لاہور (یہ آخری صفحہ پر درج ہے)

پتہ: بیرون ریلوے ڈی ایس آفس لاہور نمبر 5

....

لہو، چاند اور سویرا کے ٹائٹل پر سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر بھٹو کی تصاویر موجود ہیں اور نیچے یہ شعر درج ہے:

عمریست کہ افسانہ منصور کہن شد
من از سر تو جلوہ وہم دار و رسن را

''لہو، چاند اور سویرا'' میں سیف زلفی کی وہ شعری تخلیقات موجود ہیں جن میں ظالم و جابر قوتوں کے خلاف شدید نفرتوں کا اظہار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مجموعہ کلام ذوالفقار علی بھٹو کی عملی جدوجہد سے لے کر بے نظیر بھٹو کی سربراہی تک کی منظوم داستان ہے۔ اس دوران میں ملک میں جو کچھ ظلم وستم ہوا اور سیف زلفی کی حساس آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اسے اس مجموعہ کلام میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سعادت سعید رقم طراز ہیں:

''...... سیف زلفی نے ''لہو، چاند اور سویرا'' جیسا مجموعہ تخلیق کر کے اپنے حریت بھرے ضمیر کے جذبات کا برملا اظہار کیا ہے اور اس میں اپنے اس شعر میں موجود جذبے کا کھلا ثبوت دیا ہے۔

ظالم کا کبھی ساتھ نہ دینا مرے بچو
کرنا نہ کوئی کام شریعت کے علاوہ'' (۵۰)

سیف زلفی پاکستان پیپلز پارٹی سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور اس کے لیے علمی،

---

(۵۰) سعادت سعید، ڈاکٹر ''حریت فکر کا علمبردار، سیف زلفی'' لاہور: ماہنامہ ''شام وسحر'' جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۷۴

قلبی، عملی اور قلمی طور پر حاضر رہتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اس کتاب میں جہاں انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر بھٹو جیسے اکابرین کی مدح سرائی کی ہے وہاں اس مجموعہ کلام کا انتساب جبر و تشدد کی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر ہونے والے شہید بھٹو کے تمام پرستاروں کے نام کیا ہے۔ اس حوالے سے اصغر علی چودھری رقمطراز ہیں:

"......بھٹو شہید کے نقش قدم پر چل کر ظلم و استبداد کا مقابلہ کرتے وطن کے جیالوں نے جو زخم کھائے، جبر سے اور خون پہنا ہے، زیر نظر شعری مجموعے نے اس خون کو چاند کی سی خوبصورتی اور چمک دمک دے کر نئے سویرے اور طلوع سحر کی نوید نہایت مسحور کن انداز میں سنائی ہے۔ یہ جناب سیف زلفی کے فن اور ان کی فطری صلاحیتوں کے کمال کا منہ بولتا ثبوت ہے......" (۵۱)

"لہو، چاند اور سویرا" میں سیف زلفی نے ذوالفقار علی بھٹو کے دور سے بے نظیر بھٹو کی جدوجہد تک کا فسانہ ہی قلمبند نہیں کیا بلکہ ایک حساس اور باشعور شاعر کی طرح اس میں اپنے نقطۂ نظر کو بھی شامل کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے شعری لوازمات کا خیال رکھتے ہوئے فنی محاسن پر بھی بھرپور توجہ دی ہے۔ اس حوالے سے ظہیر کاشمیری رقم طراز ہیں:

"......"لہو، چاند اور سویرا" ہمارے عصری آشوب کی شعری تفسیر ہے جسے سیف زلفی نے جمالیاتی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے فنی چابکدستی سے تحریر کیا ہے۔

سیف زلفی نے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۹ء کے واقعات کو تخلیقی انداز میں پیش کر کے ایک وقائع نگار کے فرائض ہی انجام نہیں دیئے بلکہ ایک ہنرمند رزمیہ نویس کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں اور ارد گرد پیدا ہونے والے حادثات و سانحات کو احساسی طور پر قاری تک پہنچانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "لہو، چاند اور سویرا" میں حزنیہ، طربیہ اور رزمیہ جذبات کے ساتھ احتجاج و رجائیت کے جذبات بھی جابجا ملتے ہیں اور یہ ساری کتاب حب الوطنی کے

---

(۵۱) اصغر علی چودھری (مختصر رائے) "لہو، چاند اور سویرا" لاہور: پاکستان پروگریسو رائٹرز، ۱۹۸۹ء، ص ۳

ارفع اور بلند آدرش کی مظہر دکھائی دیتی ہے......" (۵۲)

"لہو چاند اور سویرا" میں شامل منظومات، غزلیات اور دوہوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیف زلفی نے اس مجموعہ میں محض حالات کی ستم ظریفی کا رونا ہی نہیں رویا ہے بلکہ حالات کی تبدیلی کے خواب بھی دیکھے ہیں۔ اس طرح ان کا نقطہ نظر کسی حد تک رجائی ہو جاتا ہے۔ وہ حالات و واقعات کی چیرہ دستیوں سے خوفزدہ ضرور ہیں مگر وہ ان کی تبدیلی کے لیے کوشاں بھی دکھائی دیتے ہیں اور انہیں یقین ہے کہ حالات ضرور تبدیل ہوں گے اور انہیں اپنے حسین خوابوں کی تعبیر ضرور ملے گی۔ اس سلسلے میں مسعود اشعر رقمطراز ہیں:

"......سیف زلفی نے اپنی غزلوں، نظموں اور ترانوں کے ذریعہ قوم کے انفرادی اور اجتماعی خوابوں کو الفاظ کا پیکر فراہم کیا ہے اور ان جذبوں کو زبان عطا کی ہے جو ساری قوم کا اجتماعی ورثہ ہیں......" (۵۳)

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ سیاسی یا ہنگامی نوعیت کی شاعری میں پائیداری نہیں ہوتی۔ بعض اوقات تو شاعر کی ذرا سی بے توجہی سے تمام کلام محض "نعرہ" بن جاتا ہے۔ سیف زلفی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اس شعری تخلیق میں فن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ یہی سبب ہے کہ سیف زلفی نے اپنے سیاسی افکار و نظریات کو مختلف علامات و اشارات میں پیش کیا ہے۔ اس طرز عمل نے سیف زلفی کی شاعرانہ حیثیت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ اس سلسلے میں ظہیر کاشمیری رقمطراز ہیں:

"......اس کتاب میں جو نظمیں، غزلیں اور دوہے شامل ہیں ان میں جابر قوتوں کے خلاف نفرت کا اظہار ہے۔ بھٹو خاندان کی خونچکاں داستان کا تذکرہ ہے۔ عوام کی بے مثال جدوجہد کا تذکرہ ہے اور طلوع فردا کی نوید پر اظہار اعتماد کیا گیا ہے۔ سیف زلفی چونکہ منجھا ہوا شاعر ہے اس لیے اسے

---

(۵۲) ظہیر کاشمیری (فلیپ) "لہو چاند اور سویرا" لاہور: پاکستان پروگریسو رائٹرز ۱۹۸۹ء، ص فلیپ نمبر ۱

(۵۳) مسعود اشعر (فلیپ) "لہو چاند اور سویرا" لاہور: پاکستان پروگریسو رائٹرز ۱۹۸۹ء، ص فلیپ نمبر ۲

زبان و بیان میں قدرت حاصل ہے اور وہ اپنے فن سے قاری پر گہرے تاثرات مرتب کرتا ہے۔ بحیثیت مجموعی اس مجموعے میں مرثیے' رزمیے' مزاحمتی ادب اور انقلابی ادب کے اکثر و بیشتر عناصر موجود ہیں اور غنائیت کے ساتھ ساتھ خیال و جذبات کی بوقلمونی نے اس مجموعے کو ہفت رنگ نغمہ بنا دیا ہے......" (۵۴)

سیف زلفی نے "لہو' چاند اور سویرا" میں اپنے جذبات' احساسات اور نظریات کی بھرپور تشہیر کی ہے لیکن کمال فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے فنی لغزشوں سے اپنا دامن بچایا ہے۔ اس مجموعے کی بعض نظمیں اور غزلیں اپنے علامتی نظام اور تشبیہات و استعارات کی بنا پر سیف زلفی کی نمائندہ تخلیقات قرار دی جا سکتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بعض نعرہ نما نظموں کو بھی سیف زلفی کے اسلوب بیان نے فن کی اعلیٰ سطح سے ہمکنار کر دیا ہے۔ فن و فکر کے اس حسین امتزاج نے سیف زلفی کی اس تخلیق کو معتبر بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں اسرار زیدی رقمطراز ہیں:

"......سیف زلفی نے غزل کی طرح ان نظموں اور ترانوں میں اپنے فنی اسلوب کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان کا رزمیہ آہنگ ان نظموں کے تاثر میں زیادہ شدت پیدا کرنے کا سبب بنا ہے۔ قائداعظم اور شہید بھٹو سے سیف زلفی کی عقیدت اور تعلق خاطر نے ہر دو رہنماؤں سے متعلق نظموں کو جس جذباتی اور فنی عروج پر پہنچایا ہے وہ قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے۔ یوں بھی یہ نظمیں اور ترانے ہمارے سیاسی اور ادبی تاریخ کے اہم باب کا ناقابل فراموش حصہ ہیں......" (۵۵)

سیف زلفی ایک وطن دوست بلکہ وطن پرست انسان تھے۔ انہوں نے صرف اپنی نظموں اور غزلوں میں وطن دوستی کے جذبات پیش نہیں کیے بلکہ وہ اپنی گفتگو میں بھی وطن سے محبت کا بھرپور اظہار کرتے رہتے تھے۔ ناصر چودھری نے سیف زلفی کی ایک انگریزی نظم کا بھی

---

(۵۴) ظہیر کاشمیری' "لہو' چاند اور سویرا" لاہور: پاکستان پروگریسو رائٹرز' ۱۹۸۹ء' ص فلیپ نمبر ا

(۵۵) اسرار زیدی' (دیباچہ) "لہو' چاند اور سویرا" لاہور: پاکستان پروگریسو رائٹرز' ۱۹۸۹ء' ص ۴

حوالہ دیا ہے جس میں سیف زلفی نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر وطن کے لیے سب کچھ قربان کرنے کا اعلان کیا ہے:

"...... The pregnant clouds of bloodshed

are hovering over my Garden.

The Shadows of destruction are Creeping

to my land saying, "Pardon" "Pardon"

"Pardon"

The deep Ocean of feelings is wounded

and furious

The shattered shores are always injurious

The Cyclones are untying their tides

God may hide us, hide us, hide. (56)

اب ذیل میں "لہو، چاند اور سویرا" میں سے انتخاب کلام پیش خدمت ہے۔

تو اپنے دست ستم پہ اتنا گھمنڈ مت کر
قریب تر ہے وہ دن جفا گر
تری کلائی مروڑ دوں گا
تمام کوڑے نچوڑ دوں گا

(نظم "تمام کوڑے نچوڑ دوں گا" کا ایک بند)

تری نظیر ہی نہیں کہ تو تو بے نظیر ہے
ترے خلاف جو بھی ہے بڑا ہی بے ضمیر ہے

---

(۵۶) ناصر چودھری "سیف زلفی۔ ایک عظیم شاعر" لاہور: ماہنامہ "شام و سحر" اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۴۷

تو اک کھنچی کمان ہے تو سنسناتا تیر ہے
جو باضمیر لوگ ہیں تمام تیرے ساتھ ہیں
عوام تیرے ساتھ ہیں
رسولؐ کائنات کے غلام تیرے ساتھ ہیں
(نظم ''عوام تیرے ساتھ ہیں'' سے ایک بند)

....

تو ہے پورے چاند کی ٹھنڈک' تو پھولوں کی باس
تو گلشن کا نرم سویرا' تو سورج کی آس
خیالوں نے نئے پیکر بنائے ہیں تری خاطر
تو آتا ہے ......
(نظم ''رہائی'' سے ایک بند)

....

زخم جبیں سے' دل کا چمن ہے لہو لہو
اس نیشتر سے سارا بدن ہے لہو لہو
دل قاش قاش زہر صداقت نے کر دیا
تھوکا ہے اتنا خوں کہ گگن ہے لہو لہو

....

کتاب قتل پہ جرأت کی آن کیا لکھتے
سرورق ہی نہیں تھا نشان کیا لکھتے
ہمارے ہاتھ تراشے گئے زباں کی طرح
ہم اپنے عہد ستم کا بیان کیا لکھتے

....

زمین والے کہیں، آسماں ضمیر مجھے
مرا وقار بڑھے گا کرو اسیر مجھے
میں اس کے ذہن پہ حاوی ہوں خوف کی صورت
سمجھ رہا ہے خطر، شہر کا امیر مجھے

....

اس گھر میں سب خوف زدہ ہیں کیا گبرو کیا نار
وہ گھر جس پر قبضہ کر لے گھر کا چوکیدار

....

حق والوں کو سولی دینا، سچ والوں کو زہر
ظالم تجھ کو تاک رہا ہے دیکھ خدا کا قہر

....

آنکھوں کے ساگر سے پھوٹی گرم لہو کی دھار
ڈھاکہ فال ہوا تو زلفی روئے زار قطار

....

یہ چاند تارے کا جھلملاتا، نیارا پرچم
ہمارا پرچم
یہ پرچموں میں عظیم پرچم
عطائے رب کریم پرچم
ہمارا پرچم
ہماری عظمت کا پاسباں ہے
ہمارے احساس کا بیاں ہے

ہماری رفعت کا آسماں ہے
ہماری ملت کا ترجماں ہے
عظیم ملت، عظیم پرچم
عطائے رب کریم پرچم

فضا میں نغمے لٹا رہا ہے
شعور ملت جگا رہا ہے
دل و نظر میں سما رہا ہے
تمام عالم پہ چھا رہا ہے
برنگ موج نسیم پرچم
عطائے رب کریم پرچم

یہی نشان حشم ہمارا
یہی ہے ابر کرم ہمارا
یہ جاں ہماری یہ دم ہمارا
رہے گا اونچا علم ہمارا
علم ہمارا عظیم پرچم
عطائے رب کریم پرچم
یہ پرچموں میں عظیم پرچم

(''پرچم'' پر کل پاکستان ایوارڈ دیا گیا)

اب چند باتیں سیف زلفی کی غیر مطبوعہ تخلیقات کے بارے میں بھی سن لیجئے۔

سیف زلفی ایک ماہر و مشاق شاعر تھے۔ انہوں نے عمر بھر شعر و نثر سے تعلق قائم رکھا۔ ان کا کچھ کلام تو زیور طبع سے آراستہ ہوا تاہم بیشتر کلام ابھی تک غیر مطبوعہ صورت میں محفوظ ہے۔ ذیل میں سیف زلفی کے غیر مطبوعہ کلام کے حوالے سے چند تعارفی معروضات پیش خدمت ہیں۔

جیون پتنگ سانس کی ڈوری کاٹ گئی
زلفی جی اس دل کو دیمک چاٹ گئی
اک آہ بھی کھینچی تو اسے بار لگی ہے
ہم سایہ ہے دیوار سے دیوار لگی ہے
شفاف ہے دامن پہ ذرا گرد نہیں ہے
اس دور میں ایسا تو کوئی فرد نہیں ہے
زلفی ہمارے دامن شہرت میں کیا نہیں
شکوہ گزار کیوں ہوں متاع ہنر سے ہم

۲۔ سیف زلفی کے دوہے

سیف زلفی نے ہزار ہا دوہے کہے۔ کچھ دوہے ان کی مطبوعہ کتب میں شائع ہوئے اور کچھ مختلف ادبی رسائل کی زینت بنے۔ تاہم زیادہ تر دوہے غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ سیف زلفی اپنے دوہوں پر فخر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے دوہوں کو جس بیاض میں یکجا کیا تھا اس پر ''جیون' امرت' دھارا'' تحریر ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سیف زلفی اپنے دوہوں کے لیے یہ نام پسند کر چکے تھے۔ سب سے پہلے دوہا نگاری کے حوالے سے سیف زلفی کی اپنی رائے ملاحظہ فرمائیے:

> ''...... مجھے اپنے دوہوں پر فخر ہے۔ جب بھی میرے دوہوں کا مجموعہ آیا تو یہ محسوس ہوگا کہ پنجاب کی مٹی کا کوئی بول رہا ہے ...... جس سرزمین پر میں رہتا ہوں اس سرزمین کی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو محسوس ہوگی میرے دوہوں میں ...... گنگا اور جمنا کے کناروں سے جو تہذیب پیدا ہوئی وہ میں دوہے میں استعمال کرتا ہوں۔ ''گنگا جمنی'' بڑی کول اور ملائم نرم زبان ہے۔ یہ اردو بھی ہے اور ہندی بھی۔ اس میں پنجابی بھی ہے۔ یہ ساری زبانوں سے مل کر اور حسین ہو جاتی ہے اور دوہے کا مزاج ہی گنگا جمنی ہے۔ اس کی بحریں بڑی

ا۔ سیف زلفی کی غزلیں

سیف زلفی کی غزلوں کی تعداد کا حتمی تعین ممکن نہیں ان کا پہلا مجموعہ غزلیات ''ٹکڑے ٹکڑے آدمی'' ۱۹۸۲ء میں طبع ہوا۔ ان کی کچھ غزلیں دوسرے مجموعہ ''لہو، چاند اور سویرا'' میں ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئیں۔ اس وقت میرے پیش نگاہ دو رجسٹر ہیں جن پر سیف زلفی کی غزلیں رقم ہیں۔ ان غزلوں کی مجموعی تعداد کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ سیف زلفی کی غزلوں کے دو مجموعے تیار کیے جا سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ سیف زلفی نے اپنی زندگی میں بعض غزلوں کی کتابت بھی کرائی تھی لیکن زندگی نے ساتھ نہ دیا اور ان کا یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ سیف زلفی کی ان غیر مطبوعہ غزلوں کو سلیقے سے شائع کیا جائے۔

سیف زلفی کی غیر مطبوعہ غزلیات میں ایک خاص طرح کی غنائیت اور لہجے کی کاٹ کا امتزاج موجود ہے۔ سیف زلفی کی یہ غزلیں انہیں جدید عہد کا غزل گو ثابت کرتی ہیں۔ اگر یہ غزلیں طبع ہو جاتی ہیں تو ناقدین کو سیف زلفی کا مقام باردگر متعین کرنا پڑے گا۔ آپ بھی ان غزلوں کے چند غیر مطبوعہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

تقدیر اپنی راہ کا پتھر لگی مجھے
منزل کو چھو رہا تھا کہ ٹھوکر لگی مجھے

خدا نے پھینک دیا لا کے کس خرابے میں
بشر ملا نہ مجھے کوئی اس خرابے میں

پلکوں پہ آنسوؤں کے گہر تولنے لگا
میں چپ رہا تو میرا بدن بولنے لگا

چھیڑ دیتا ہے جو کوئی ساز آدھی رات کو
صاف آتی ہے تری آواز آدھی رات کو

جذبات کو لفظوں میں سمونے نہیں دیتا
حالات کچھ ایسے ہیں کہ رونے نہیں دیتا

مترنم ہیں اس میں ہلکے پھلکے' پیار محبت کے خوبصورت جذبے بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کے پہلے دو مصرعوں میں غزل کی شعریت موجود ہوتی ہے۔ میں نے اس کو عشق و محبت سے الگ رکھ کر بھی لکھا ہے......"(۵۷)

سیف زلفی کے ان دوہوں میں موضوعات کی رنگارنگی ملتی ہے۔ اس میں ہجر و وصال کے قصے بھی ہیں اور عہد جدید کے مسائل بھی۔ سیف زلفی نے ان دوہوں میں حضور اکرمؐ اور ان کے خانوادے کو بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔ سیف زلفی کی دوہا نگاری کے حوالے سے عبدالجبار لطفی رقمطراز ہیں:

"......سیف زلفی صاحب وہ صاحب طرز شاعر ہیں جنہوں نے تین سو سے زائد دوہے لکھے ہیں۔ ان دوہوں میں زندگی کے مسائل جو بہت وسعت رکھتے ہیں سمٹ آئے ہیں اور ایک ایک دوہا دل میں اُترتا چلا جاتا ہے......"(۵۸)

اب سیف زلفی کے چند دوہے ملاحظہ فرمائیے:

اس اندھیارے جگ میں زلفی کون اُجالا لائے
آگے پیچھے سب ہی اندھے' رستہ کون بجھائے

....

پریت اُجالا' پریت شوالا' پریت خدا کا نام
پریت اگر سچی ہے پگلے پریت کہاں ناکام

....

تم پکے جی دار لٹیرے ہم چوروں کے بھائی
آنکھ بچے تو صاف اڑا لیں کیا پربت کیا رائی

---

(۵۷) آغا سلمان باقر "سیف زلفی سے ملاقات" لاہور: ماہنامہ "شام و سحر" اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۴

(۵۸) عبدالجبار لطفی' (دیباچہ) روشنی' لاہور: حلقہ اہل قلم' ۱۹۷۹ء، ص ۹

چغلی کھا کر پچھتائے گا ایسے پاپ سے ڈر
کہنا ہے تو منہ پر کہہ دے پیچھے بات نہ کر

....

لندن اور امریکا گھومے گھوم آئے جاپان
اپنا پاکستان ہے زلفی اپنا پاکستان

....

۴۔ بچوں کے لیے نظمیں

سیف زلفی بچوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ انہوں نے ننھے منے بچوں کے لیے بے شمار نظمیں لکھیں اور انہیں ایک بیاض میں یکجا کر کے ''تتلیوں کے گیت'' کا عنوان دیا۔ شومئی قسمت سے یہ مجموعہ طبع نہ ہو سکا۔ اس مجموعے میں لوریاں، گیت اور نظمیں شامل ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان نظموں میں سیف زلفی نے حب وطن اور اخلاقی موضوعات کو بطور خاص جگہ دی ہے۔ آپ ان نظموں کے درج ذیل عنوانات سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سیف زلفی اپنے عہد کے بچوں کو کیا تلقین کرنا چاہتے ہیں۔

۱۴۔ اگست...... یہ گرمیاں...... چاند
چاند کی سیر...... قائداعظمؒ...... عید کا چاند
تتلیوں سے زیادہ حسین ساتھیو...... چھٹیاں...... علم کی روشنی
پانی برس رہا ہے...... عدل...... کسان
سب قسمت کا پھیر...... سمت نما...... بھالو
کون اسے سلجھائے...... بندر والا...... گڑیا
برسا پانی...... سورج...... اللہ
منھی منی اوڑھ کے چنی...... چندا ماموں...... شیخو
صبح ہوئی...... کوئل...... جھولا

ان نظموں کے ساتھ ساتھ سیف زلفی کی لوریاں بھی قابل توجہ ہیں۔ اگر یہ مجموعہ جلد شائع ہو گیا تو بچوں کے ادب پر یہ ایک احسان ہو گا۔ "تتلیوں کے گیت" کے حوالے سے اختر حسین شیخ رقمطراز ہیں:

"......بچوں کے لیے جو کچھ زلفی نے تخلیق کیا وہ معیار و مقدار دونوں لحاظ سے تسلی بخش ہے۔ نظمیں، گیت اور نغمے جن کا نام اس نے تتلیوں کے گیت رکھا۔ یہ کتاب آخری صفحے تک دلچسپ اور مزے دار ہے۔ زلفی کی ایک لوری تو بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ ریڈیو کوریا سے نشر ہونے والی اس لوری کا مزاج صحیح معنوں میں بین الاقوامی ہے......" (۵۹)

اب ذیل میں سیف زلفی کی بچوں کے لیے لکھی گئی ایک لوری اور چند نظمیں پیش خدمت ہیں:

لوری

سو جا میرے لال
سو جا میرے پیارے لال
سو جا میری آنکھ کے تارے
سو جا میرے راج دلارے، سو جا میرے لال
کرنوں کا میں جھولا ڈالوں
اور تجھ کو بہلاؤں
چاند نگر کی میٹھی نیندیں
آنکھوں میں بکھراؤں
میٹھی میٹھی لوری دے کر
نیندوں کو مہکاؤں

---

(۵۹) اختر حسین شیخ "شمشیر براں" کراچی: ماہنامہ سرگزشت، جنوری ۱۹۹۳ء، ص ۷۷

نندیا کی پروا سے بکھریں ریشم جیسے بال

سو جا میرے لال

سو جا میرے لال

''چاند'' نظم سے اقتباس

چاند کی رہگزر

روشنی کا سفر

یہ سہانی ڈگر

اس سہانی ڈگر پر چلو۔ بے خطر ساتھیو

ہم سفر ساتھیو

''پانی برس رہا ہے'' نظم سے اقتباس

چھم چھام چھم چھما چھم

پانی برس رہا ہے

بچے نہا رہے ہیں

ملہار گا رہا ہے

پانی بھرا ہوا ہے

ڈبکی لگا رہے ہیں

....

اب سیف زلفی کی زبان سے سنیئے کہ وہ بچوں کے لیے کس طرح لکھتے تھے:

''......میں نے بچوں کے لیے کیسے لکھنا شروع کیا؟ یہ ایک لاشعوری بات ہے۔ بچوں کے لیے لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ اس کے لیے بچہ بننا پڑتا ہے۔ میں نے بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھی ہیں جو ریڈیو سے اکثر نشر ہوتی رہتی ہیں۔ میری ایک نظم ''سو جا میرے لال'' ریڈیو پاکستان کے تمام

سٹیشنوں سے بچوں کے پروگرام میں نشر ہوتی ہے......"(۶۰)

۴۔ سیف زلفی کے منظوم ترجمے

سیف زلفی انگریزی زبان و ادب کے شناور رہے ہیں انہوں نے انگریزی ادب کے مزاج کو سمجھنے کی مقدور بھر کوشش کی اور انگریزی تخلیقات کے منظوم تراجم میں اس کا اظہار بھی کیا۔ انہوں نے رابرٹ فراسٹ اور لینگسٹن ہیوز کی نظموں کے ایسے منظوم ترجمے کیے جن پر اصلیت کا گمان گزرتا ہے تاہم سیف زلفی کے حقیقی جوہر شیکسپیئر کے معروف ڈرامے اوتھیلو کے منظوم ترجمے میں کھلتے ہیں۔ اس حوالے سے پہلے سیف زلفی کی بات سن لیجیے:

"......شیکسپیئر کا انگ' رنگ ڈھنگ دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اُردو میں بھی کوئی ایسی چیز ہونا چاہیے۔ البتہ میں نے شیکسپیئر کا ترجمہ کرنے کے باوجود اس کا وہی رنگ ڈھنگ اور انداز اور لطافت پیش کی ہے جو انگریزی میں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب میری یہ کتاب لوگوں کے سامنے آئے گی تو وہ اس کی عظمت کا اعتراف کریں گے......"(۶۱)

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیف زلفی نے شیکسپیئر کے دیگر معروف ڈراموں کو چھوڑ کر اوتھیلو کا انتخاب کیوں کیا......؟ حقیقت یہ ہے کہ اس ڈرامے کی بعض قدریں سیف زلفی کی شخصیت سے ملتی جلتی تھیں نیز انہوں نے اس المیاتی ڈرامے کو اس لیے بھی منتخب کیا کہ اس میں فرد کے اخلاقی نظام کو ٹکڑے ٹکڑے دکھایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سعادت سعید کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیے:

"......سیف زلفی نے شیکسپیئر کے ڈرامے "اوتھیلو دی مور آف وینس" کا منظوم ترجمہ بھی کر رکھا تھا۔ یہ ترجمہ طباعت کے لیے تیار تھا۔ شیکسپیئر کے اس المیہ ڈرامے کو منتخب کر کے اس کا منظوم ترجمہ کرنا جہاں سیف زلفی کی محنت

---

(۶۰) تنویر ظہور "سیف زلفی اپنے بچپن کے واقعات سناتے ہیں" لاہور: کلاسیک' ۱۹۹۰ء' ص ۸۱

(۶۱) آغا سلمان باقر "سیف زلفی سے ملاقات" لاہور: ماہنامہ "شام و سحر" اکتوبر ۱۹۹۲ء' ص ۱۸

پسند طبیعت کا عکاس ہے وہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے اس ڈرامے کو کیوں چنا......؟ اوتھیلو ایک المیہ کردار ہے۔ وہ ایاگو کی سازش کا شکار ہوتا ہے۔ کیسیو کو فوج میں ایاگو پر فائق گردانا جاتا ہے اور وہ اس کا بدلہ اوتھیلو سے لیتا ہے جو کمانڈر اور شریف انسان ہے۔ حق دار کا حق پہچانتا ہے۔ رحم دل اور حلیم طبع ہے لیکن ایاگو اسے خودکشی پر مجبور کردیتا ہے۔ ایاگو اس کے گرد ایسا جال پھیلاتا ہے کہ وہ اس سے نکل ہی نہیں پاتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو انسان دوسروں کا حق پہچانتے ہیں ان کی پذیرائی نہیں ہوتی۔ شاید سیف زلفی نے اسی لیے اس کھیل کو منتخب کیا تھا......" (۶۲)

اس منظوم ڈرامے کا عمیق مطالعہ احساس دلاتا ہے کہ سیف زلفی کو زبان و بیان پر بے پناہ قدرت تھی۔ انہوں نے انگریزی سامراج اور نفسیاتی حقائق کو جس طرح اُردو میں پیش کیا ہے اس کی جتنی بھی مدح سرائی کی جائے کم ہے۔ اب ذیل میں اس ڈرامے کے ایک منظر کی چند سطور ملاحظہ فرمایئے اور سیف زلفی کی ہنر مندیوں کی داد دیجیے۔

"...... میں مجرم ہوں اگر کچھ جھوٹ بولوں مگر میری فقط اک التجا ہے
مجھے اتنا بتاؤ......

کیا تمہاری چاند سی بیٹی...... تمہارے مشورے سے
رات کے سنسان لمحوں میں...... تمہارے گھر سے نکلی ہے؟
(مجھے کچھ کچھ یقیں سا ہے) کہ جب کوئی محافظ بھی نہیں ہے
سوائے اس غلام روسیہ کے
کہ جو ٹکڑوں پہ پلتا ہے۔ کرائے پر جو چلتا ہے
تمہاری خوش نما بیٹی اسی کے ساتھ نکلی ہے اور
اس اوباش کے مکروہ بانہوں میں مچلتی ہے
اگر اس میں تمہارا مشورہ بھی کارفرما ہے تو جو

---

(۶۲) سعادت سعید ڈاکٹر "حریت فکر کا علمبردار سیف زلفی" لاہور ماہنامہ "شام و سحر" اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۷۵

کچھ بھی ہوا ہے

تمہاری اپنی مرضی ہے۔ تمہاری ہی اجازت ہے

تو پھر تم کو خبر دینا ہماری بے وقوفی اور طفلانہ حماقت ہے

اگر تم بے خبر ہو اس خبر سے

تو پھر اخلاق اور آداب کی رو سے بتاؤ تو

کہ تم نے خواہ مخواہ ہم پر ملامت کی

تو کیوں کی ہے......؟؟؟

سیف زلفی کے اس منظوم ڈرامے کی بہت قدر و منزلت ہوئی۔ ملک کے معروف دانشوروں اور ناقدین نے اسے سیف زلفی کا عظیم کارنامہ قرار دیا۔ سیف زلفی نے یوں تو بہت سے منظوم ترجمے کیے لیکن ''اوتھیلو'' والی شہرت کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ اس حوالے سے ایک رائے ملاحظہ فرمایئے:

"...... Big news in the literary world is the transalation into Urdu of Shakespears 'Othello'. The translation is also in verse. The translator is Saif Zulfi, better known for his patriotic song 'Yeh, Parchamon mein Azeem Parcham' which was sung on TV by Naheed Akhtar and awarded the national prize.

According to the Pakistan Writers Association hosts at a recent mushaira where Saif Zulfi was chief guest, this is the only translation of Othello in Urdu although the 'Association of Eighteen Professors' in

Lucknow is engaged in a similar undertaking. Saif Zulfi acknowledged their help in this enormous task which took him over four years. During an informal discussion with they twenty or more poets gathered together at the mushaira, he discussed the problems of finding suitable alternatives for thos words in Shakespear's English which were already innovations within English as we know it. Unfortunately Saif Zulfi did not read any excerpts from his translation as the book is presently in the press.

This brought to mind a translation of 'Macbeth' into 'Barnam Yanna' (or 'Burnham Forest'). This translation was in highly Sanskritized Shudh Hindi, adapted to and performed in Delhi by the National School of Drama in the Yakshgn style of dance. Many people had misgivings about Shakespeare in Yakshgn, but it was a beautiful and poetic translation and production which conveyed the complete richness and drama of the original. One cannot be so over ambitious to hope to see such here but may be Othello in

Urdu may provide food for thought to threatre groups. (63)

۵۔ سیف زلفی کی دیگر تخلیقات

سیف زلفی نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی اور شعروادب کے آل راؤنڈر قرار پائے۔ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات میں بے شمار وطنی نغمے، گیت اور قطعات ورباعیات شامل ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تخلیقات کو جلد از جلد طبع کرایا جائے تاکہ قارئین سیف زلفی کے افکار عالیہ سے بیش از بیش فائدہ اٹھا سکیں۔ان تخلیقات کی اشاعت کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ سیف زلفی کو مجموعی طور پر پڑھنے کا موقع مل جائے گا اور معتبر ناقدین سیف زلفی کا نئے سرے سے مطالعہ کر کے شعروادب میں ان کے حقیقی مقام کا تعین کر سکیں گے۔

۶۔ سیف زلفی کے غیر مطبوعہ مرثیے

اب کچھ باتیں سیف زلفی کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے۔سب سے پہلی بات یہ کہ سیف زلفی کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے ہنوز کوئی مبسوط کام نہیں ہوا ہے۔اردو مرثیے کے حوالے سے لکھی جانے والی معروف تنقیدی کتب میں سیف زلفی کے بارے میں جزوی اشارے ملتے ہیں۔ناقدین نے سیف زلفی کی مرثیہ نگاری کا حوالہ تو ضرور دیا ہے لیکن ان کی مرثیہ نگاری کے محاسن و معائب سے ہمیں بے خبر رکھا ہے۔آیئے سب سے پہلے ان ناقدین کی آراء ملاحظہ فرمایئے جنہوں نے سیف زلفی کو مرثیہ نگار تسلیم کیا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر وحید قریشی

"......سیف زلفی ہمارے ان شعرا میں سے ہیں جن کی زندگی میں وہ قدر نہیں ہوئی جو ہونی چاہیئے تھی۔ان کی زندگی میں ان کے کئی مجموعے چھپے۔رثائی

---

(63) YAMEEMA MITHA, Special Feature, Daily "Muslim" Islamabad, Wednesday, September 14, 1983

شاعری میں انہوں نے مرثیے کو ایک نیا لہجہ دینے کی کامیاب کوشش کی۔'' (۶۴)

۲۔ ڈاکٹر ہلال نقوی

''...... کراچی کے بعد جدید مرثیے کی ارتقائی تاریخ میں لاہور کا نام اہم ہے ...... اپنی تعداد کے اعتبار سے بھی کراچی کے بعد لاہور ہی کے شعرا سامنے آتے ہیں۔ قیصر بارہوی' ڈاکٹر صفدر حسین اور وحید الحسن ہاشمی کے علاوہ جو نام لیے جاسکتے ہیں وہ یہ ہیں ڈاکٹر مسعود رضا خاکی' شائق زیدی' ضیا اللہ ضیا' ظفر شارب' سیف زلفی' حسن عسکری کاظمی......'' (۶۵)

۳۔ ضمیر اختر نقوی

''...... سیف زلفی نے کئی مختصر مرثیے کہے ہیں۔ بقول وحید الحسن ہاشمی ان کے مرثیوں میں بلا کی روانی اور جدید خیالات کی ارزانی پائی جاتی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں زلفی نے ایک مرثیہ ''امام حسینؑ اور تسخیر قلوب'' کے عنوان سے کہا ہے جو ان کا کامیاب مرثیہ ہے۔'' (۶۶)

۴۔ ڈاکٹر اسد اریب

''...... لاہور خاص طور پر تو تصنیف مرثیے کے فروغ کا ایک اہم مرکز ثابت ہوا۔ حلقہ شعرائے اہلبیت کے سیکرٹری وحید الحسن ہاشمی نے لاہور کو مرثیے کی سرگرمیوں کے اعتبار سے لکھنؤ کا حریف بنادیا۔ یہاں کی مجلسوں میں جن لوگوں نے مرثیے کہے اور پڑھے ان میں نمایاں نام ڈاکٹر مسعود رضا خاکی' قیصر بارہوی' وحید الحسن ہاشمی' شائق زیدی' سیف زلفی اور افسر عباس زیدی کا ہے۔'' (۶۷)

---

(۶۴) وحید قریشی' ڈاکٹر'' (فلیپ) جدید لہجے کا شاعر سیف زلفی'' لاہور: الحسن پبلی کیشنز' ۲۰۰۰ء' ص فلیپ

(۶۵) ہلال نقوی' ڈاکٹر' بیسویں صدی اور جدید مرثیہ' کراچی: محمدی ٹرسٹ' ۱۹۹۴ء' ص ۲۳۱

(۶۶) ضمیر اختر نقوی' اردو مرثیہ پاکستان میں' کراچی: سید اینڈ سید' ۱۹۸۲ء' ص ۴۹۹

(۶۷) اسد اریب' ڈاکٹر' اردو مرثیے کی سرگزشت' لاہور: کاروان ادب' ۱۹۸۹ء' ص [illegible]

۵۔ احمد ندیم قاسمی

''......سیف زلفی نے غزل، نعت اور مرثیے کی دنیا میں نام پیدا کیا تھا......
سیف زلفی عقیدے کے اعتبار سے شیعہ مسلمان تھے اس لیے انہوں نے سلام اور مرثیے بڑے جذبے سے لکھے......'' (۶۸)

۶۔ ڈاکٹر سہیل احمد خاں

''......اس کے ساتھ ساتھ وہ دینی اور مذہبی موضوعات کو بھی ترجیح دیتے رہے۔ سلام اور مرثیے میں بھی ان کا اپنا ایک مقام اور مرتبہ ہے'' (۶۹)

۷۔ میرزا ادیب

''......سیف زلفی کی حقیقی پہچان اس کی شاعری تھی۔ یہ شاعری مختلف اصناف سے اپنا رشتہ جوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ مرثیہ گو بھی ہے، نظم گو بھی، غزل گو بھی، رباعی گو بھی۔'' (۷۰)

۸۔ ڈاکٹر آغا سہیل

''......ان کی مذہبی شاعری کا بھی ایک مقام تھا اور ایک سمت تھی۔ جدید اردو مرثیے میں دھیرے دھیرے سیف زلفی نے اپنا ایک مقام بنانا شروع کر دیا تھا۔ کراچی اور لاہور دونوں شہروں میں اس اعتبار سے وہ یکساں مقبول تھے۔ جدید مرثیہ سیف زلفی نے نظم معریٰ میں بھی لکھا اور مسدس میں بھی......'' (۷۱)

---

(۶۸) احمد ندیم قاسمی ''مکتوب بنام عفت حسن'' مرقومہ ۲۳ جولائی ۱۹۹۳ء مطبوعہ ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء ص ۳۵۶

(۶۹) سہیل احمد خان، ڈاکٹر ''مکتوب بنام عفت حسن'' مرقومہ ۱۸۔ اگست ۱۹۹۲ء مطبوعہ ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء ص ۳۶۳

(۷۰) میرزا ادیب ''واحسرتا سیف زلفی'' لاہور: ماہنامہ ''شام و سحر'' اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۵۵

(۷۱) آغا سہیل، ڈاکٹر ''آہستہ برگ گل بفشاں بر مزار ما'' لاہور: ماہنامہ ''شام و سحر'' نومبر ۱۹۹۲ء ص ۳۵

۹۔ ڈاکٹر طارق عزیز

''......سیف زلفی کی شاعری کا تیسرا اہم پہلو ان کا ایک خاص تہذیبی لاشعور ہے جسے ان کا دینی ذہنی پس منظر یا ان کی مخصوص میتھالوجی قرار دیا جاسکتا ہے۔اس پہلو کی بنیاد ان کی نعت گوئی اور مرثیہ نگاری ہے۔'' (۷۲)

۱۰۔ ناصر چودھری

''......مرثیہ بھی اس کا ایک میدان سخن ہے۔محرم کی مجالس میں جب یہ حسینی ضیغم مرثیہ خواں ہوتا ہے تو پوری مجلس کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔اس کا ایک مرثیہ ۲۵۰ بندوں پر مشتمل ہے جس میں ۷۵۰ اشعار ہیں ایسے ہی کئی اور طویل مراثی ہیں تاہم اردو ادب میں اس کی پہچان غزل سے ہے۔'' (۷۳)

۱۱۔ عبدالجبار لطفی

''......مرثیہ جیسی مشکل صنف سخن میں اس کے پانچ مرثیے جدید مرثیے میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ان میں سے ان کا تو تصنیف مرثیہ تقریباً ڈھائی سو بند کا ہے یعنی ۷۵۰ شعر اور پندرہ سو مصرعے اور مصرعے بھی ایسے کھرے کہ کھنک سنائی دے باقی مراثی ۷۰۔۸۰ بند کے ہیں۔'' (۷۴)

۱۲۔ غلام محمد قاصر

''......سیف زلفی نے ہیئت کے تجربوں سے مرثیہ کی صنف کو آج کے ذہن سے قریب کرنے کی کوشش کی ہے اور موضوعات میں بھی ایسے عناصر کا اضافہ کیا ہے جن کا تقاضا آج کے معروضی حالات کر رہے ہیں۔'' (۷۵ الف)

---

(۷۲) طارق عزیز ڈاکٹر ''تنگنائے غزل میں بحر ذخار'' لاہور: ماہنامہ ''شام و سحر'' اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۲۹

(۷۳) ناصر چودھری ''سیف زلفی۔ایک عظیم شاعر'' لاہور: ماہنامہ ''شام و سحر'' اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۴۴

(۷۴) عبدالجبار لطفی '(دیباچہ) روشنی' لاہور: حلقۂ اہل قلم ۱۹۷۹ء ص ۱۰

(۷۵) (ا) غلام محمد قاصر '(دیباچہ) تا بخاک کربلا' لاہور: غازی پبلی کیشنز ۱۹۷۶ء ص ۵

۱۳۔ نثار اکبر آبادی

''.......انہوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن صنف غزل اور صنف مرثیہ ہر دو اصناف سخن بہت عزیز تھیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سیف زلفی بیک وقت غزل اور مرثیے کے بہترین شاعر تھے۔'' (۷۵ب)

۱۴۔ اختر حسین شیخ

''......شروع میں زلفی حمد و نعت' منقبت اور مرثیوں کی طرف بہت زیادہ مائل تھا چنانچہ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۸۰ء تک اس کی جتنی کتب شائع ہوئیں ان ہی موضوعات پر مشتمل تھیں۔'' (۷۵ج)

اب ذیل میں ان ناقدین اور محققین کا ذکر کیا جائے گا جنہوں نے سیف زلفی کی مرثیہ نگاری پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ان کے کسی نہ کسی رُخ کو روشن کیا ہے۔

۱۔ سید وحید الحسن ہاشمی

لاہور میں اردو مرثیہ نگاری کو فروغ دینے والوں میں سید وحید الحسن ہاشمی کا نام حرف معتبر ہے۔ (۷۶) انہوں نے جدید مختصر مرثیے کی تحریک چلائی اور اس کے فروغ کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں۔ (۷۷) آپ کی یہ جدوجہد اس حد تک کامیاب ہوگئی کہ بقول ڈاکٹر اسد اریب انہوں نے لاہور کو مرثیے کی سرگرمیوں کے اعتبار سے لکھنؤ کا حریف بنا دیا''۔ (۷۸) سید وحید الحسن ہاشمی نے سیف زلفی کے مرثیے کے حوالے سے جو گفتگو اوائل میں

---

(۷۵) (ب) نثار اکبر آبادی ''البیلا شاعر۔ سیف زلفی'' لاہور: ماہنامہ ''جمالستان'' اگست ۱۹۹۲ء ص ۶۸
(ج) اختر حسین شیخ ''شمشیر براں'' مشمولہ ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز: ۲۰۰۰ء ص ۴۹۱

(۷۶) ضمیر اختر نقوی ''وحید الحسن ہاشمی اور مرثیہ'' مشمولہ کراچی: القلم شمارہ ۳' ۱۹۹۹ء ص ۲۴۷

(۷۷) ہلال نقوی' بیسویں صدی اور جدید اردو مرثیہ' کراچی: محمدی ٹرسٹ' ۱۹۹۴ء ص ۴۵ے

(۷۸) اسد اریب' ڈاکٹر اردو مرثیے کی سرگزشت' لاہور: کاروان ادب ۱۹۸۹ء ص ۱۴۱

ارشاد فرمائی ڈاکٹر ہلال نقوی اور ضمیر اختر نقوی نے اپنی کتابوں میں اسی کو حرف معتبر جانا۔ (۷۹) راقم الحروف نے پہلی مرتبہ وحید الحسن ہاشمی سے سیف زلفی کی مرثیہ نگاری پر مبسوط مقالہ لکھنے کی درخواست کی۔ موصوف نے ''سیف زلفی اور اردو مرثیہ'' کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم کیا جسے راقم نے ماہنامہ ''شام وسحر'' لاہور میں سیف زلفی نمبر میں شائع کیا۔ (۸۰)

یہی مقالہ بعد میں سیف زلفی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے راقم الحروف کی مرتبہ کتاب ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' میں بھی طبع ہوا۔ (۸۱) اسی طرح سید وحید الحسن ہاشمی نے اپنی مرتبہ کتاب ''ھل من ناصر'' میں بھی سیف زلفی کو پنجاب کا ایک اہم مرثیہ نگار قرار دیا اور ان کے مختصر حالات وکوائف پیش کیے۔ (۸۲)

۲۔ عفت حسن

راقم الحروف نے ۱۹۹۲ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ''سیف زلفی۔ شخصیت و فن'' کے حوالے سے ایک تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ اے اردو منظور کرایا۔ گورنمنٹ ایف۔ سی کالج کی طالبہ عفت حسن نے پروفیسر احمد عقیل روبی کی نگرانی میں یہ مقالہ انتہائی محنت اور جانکاہی سے مکمل کیا۔ انہوں نے اس مقالے میں سیف زلفی کی شخصیت وفن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ''سیف زلفی کی مذہبی شاعری'' کے باب چہارم میں سیف زلفی کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے چند صفحات قلم بند کیے ہیں۔ (۸۳) ان صفحات میں بھی وحید الحسن ہاشمی

---

(۷۹) (i) ضمیر اختر نقوی 'اردو مرثیہ پاکستان میں' کراچی: سید اینڈ سید '۱۹۸۲ء' ص ۴۹۹

(ii) ہلال نقوی 'ڈاکٹر 'بیسویں صدی اور جدید اردو مرثیہ' کراچی 'محمدی ٹرسٹ '۱۹۹۴ء' ص ۱۳۷

(۸۰) شبیہ الحسن 'ڈاکٹر (مدیر اعزازی) 'لاہور: ماہنامہ ''شام وسحر'' اکتوبر ۱۹۹۲ء' (سیف زلفی نمبر) 'ص ۵۳

(۸۱) شبیہ الحسن 'ڈاکٹر ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' لاہور: الحسن پبلی کیشنز '۲۰۰۰ء' ص ۲۰۵

(۸۲) وحید الحسن ہاشمی 'سید ''ھل من ناصر'' لاہور: مرثیہ نگاران پنجاب '۲۰۰۰ء' ص ۳۱

(۸۳) عفت حسن ''سیف زلفی۔ شخصیت وفن'' لاہور: پنجاب یونیورسٹی 'مقالہ ایم۔ اے اردو ۱۹۹۲ء' (غیر مطبوعہ) 'ص ۲۱۹

کے مضمون کی خوشہ چینی ملتی ہے۔

۳۔ محمد رفیق بلوچ

سیف زلفی کی سوانح حیات اور فن کے حوالے سے محمد رفیق بلوچ (پرنسپل گورنمنٹ کمرشل انسٹی ٹیوٹ جھنگ) نے ڈاکٹر شفیق احمد کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان ''سیف زلفی۔ احوال و آثار'' (برائے ایم۔ فل اُردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد) ۱۹۹۴ء میں مکمل کیا۔ اس مقالے میں انہوں نے ''سیف زلفی کی نظم نگاری کے مختلف پہلو'' کے عنوان سے ان کی مذہبی شاعری پر بحث کرتے ہوئے چند صفحات میں سیف زلفی کی مرثیہ نگاری پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان صفحات میں بھی وحیدالحسن ہاشمی کے مضمون کے اثرات نمایاں ہیں۔'' (۸۴)

راقم الحروف جست وخیز کے باوجود درج بالا تحریرات کے علاوہ کسی ایسی تحریر سے ہنوز آشنا نہیں ہو سکا ہے جو سیف زلفی کے مرثیوں کے فکروفن کے حوالے سے معرض وجود میں آئی ہو۔ درج بالا تحریروں میں بھی سیف زلفی کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے جو تسامحات ہیں ان کی درستی بھی ضروری ہے۔ اب ذیل میں سیف زلفی کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

سیف زلفی کی مرثیہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے ہمارے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ سیف زلفی کو صنفِ مرثیہ سے دلچسپی کس طرح پیدا ہوئی.....؟؟؟ راقم الحروف کے نزدیک اس کا پہلا سبب یہ تھا کہ سیف زلفی ایک ایسے علمی و ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جہاں مرثیے کی تفہیم کے لیے فضا بہت حد تک سازگار تھی۔ اس سلسلے میں سیف زلفی کی ذاتی رائے بھی دیکھ لیجیے:

---

(۸۴) محمد رفیق بلوچ'' سیف زلفی۔ احوال و آثار'' اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی' مقالہ ایم۔ فل اردو' ۱۹۹۴ء' (غیر مطبوعہ) ص ۱۰۶

''...... چونکہ میں سادات گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اس لیے مرثیے نے میری طبیعت میں شعری مزاج کو جلا بخشی۔'' (۸۵)

سیف زلفی کے اجداد میں شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والے احباب بکثرت موجود تھے۔ آپ کے پردادا میر نجف علی سے میر انیس کے مراسم قائم تھے۔ اس سلسلے میں سیف زلفی کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

''...... میرا گھریلو اور خاندانی ماحول بچپن ہی سے علم و ادب سے مالا مال تھا۔ میرے والد کے علاوہ سب شاعر تھے۔ میرے دادا اور پردادا میر نجف علی (مرحوم) اپنے دور کے نامور شاعر تھے اور جب وہ لکھنؤ جاتے تو میر انیس (مرحوم) ان کو مرثیہ سناتے۔ میر انیس کے استادوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔'' (۸۶)

سیف زلفی کی مرثیہ نگاری سے دلچسپی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ انہوں نے آغاز شاعری ہی میں محمدؐ و آل محمدؐ کی الفت کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی ابتدائی تصنیفات مثلاً ہمارے ہیں حسینؑ' کربلا کے دو اسیر' تا بخاک کربلا' روشنی' نور' وغیرہ میں حضور اکرمؐ اور ان کے خانوادے اور خصوصاً امام حسینؑ سے ان کی والہانہ محبت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیجئے کہ سیف زلفی کی یہ تخلیقات ان کے مرثیوں کے لیے ''ابتدائیہ'' ثابت ہوئیں۔ سیف زلفی کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے جس میں ہمارے موقف کی بھرپور تائید ملے گی۔

زلفی بہت سے غم تھے کفِ کائنات میں
اپنی پسند ہم نے غمِ کربلا لیا

اس سلسلے میں غلام محمد قاصر کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

---

(۸۵) آغا سلمان باقر ''انٹرویو سیف زلفی'' لاہور: روزنامہ ''مغربی پاکستان'' ۱۱۔ نومبر ۱۹۸۲ء

(۸۶) صفدر شاہد ''سیف زلفی سے گفتگو'' مشمولہ ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء ص ۲۵۰

''......واقعہ کربلا نے سیف زلفی کے سینے میں غم کی جو شمعیں فروزاں کی ہیں ان کی کرنیں زلفی کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں۔'' (۸۷)

سیف زلفی کی صنفِ مرثیہ سے دلچسپی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حضرت قیصر بارہوی نے لاہور کے جن شعراء کو صنفِ مرثیہ کی جانب راغب کیا ان میں سیف زلفی بھی شامل تھے۔ (۸۸) قیصر بارہوی کی سحر انگیز شخصیت نے سیف زلفی جیسے جدید غزل گو سے چار مرثیے کہلوا لیے۔ اس سلسلے میں سید وحید الحسن ہاشمی رقمطراز ہیں:

''......مرثیہ شروع کرنے سے قبل سیف زلفی کے سامنے نجم آفندی' آلِ رضا' جوش ملیح آبادی اور قیصر بارہوی کے اسلوبِ نگارش تھے۔ کلام کی پختگی' شعروں کی بناوٹ' مصرعوں کی اکائی کا مکمل تجربہ انہیں غزل سے مل چکا تھا اور سب سے بڑھ کر ان کے پاس غزل کا گداز' اس کی داخلیت اور اس کا سوز موجود تھا جو مرثیے کی عمارت کی تعمیر میں مسالے کا کام دیتے ہیں۔ مسئلہ صرف مرثیے کی اندرونی ساخت کا تھا جسے جناب قیصر بارہوی کی صحبت اور نصیحت نے حل کر دیا۔ آج جب ہم سیف زلفی کے مرثیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے کلام میں صرف اور صرف جوش کا ولولہ اور قیصر بارہوی کے اندرونی جذبات و محاکات کی تصویریں صاف نظر آتی ہیں۔'' (۸۹)

سیف زلفی کی مرثیہ نگاری کا مطالعہ کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ان کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے ان کی اپنی رائے ملاحظہ فرما لیں:

''......میں نے آج تک پانچ مرثیے لکھے ہیں۔ میرا آخری مرثیہ دو سو اکتیس (۲۳۱) بند پر مشتمل ہے۔ انیس و دبیر کے بعد بہت مرثیہ لکھا گیا مگر اس میں جان پیدا نہیں ہو سکی۔ اس دور کے مرثیہ نے ترقی کی لیکن بہت زیادہ نہیں

---

(۸۷) غلام محمد قاصر' (دیباچہ) تا بخاکِ کربلا' لاہور: غازی پبلی کیشنز' ۱۹۷۶ء' ص ۴

(۸۸) ہلال نقوی' ڈاکٹر' بیسویں صدی اور جدید مرثیہ' کراچی: محمدی ٹرسٹ' ۱۹۹۴ء' ص ۳۵۹

(۸۹) وحید الحسن ہاشمی' سید ''سیف زلفی اور اردو مرثیہ'' لاہور: ماہنامہ ''شام و سحر'' اکتوبر ۱۹۹۲ء' ص ۵۵

......میں خود کو باقاعدہ مرثیہ نگار نہیں سمجھتا۔ کم از کم ۲۵ مرثیے لکھ کر اپنے آپ کو مرثیہ نگار سمجھوں گا۔ البتہ میں اپنے ایک مرثیہ کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں اسے انگریزی میں ترجمہ کروں تو وہ بین الاقوامی ادب کی آنکھ سے آنکھ ملا سکتا ہے۔ میرے اس مرثیے کا نام ہے ''عشق حسینؑ اور آبِ حیات۔'' (۹۰)

سیف زلفی کے درج بالا بیان کے بعد ناقدین نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ سیف زلفی نے کل پانچ مرثیے تخلیق کیے ہیں (۹۱) جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ راقم الحروف نے انتہائی احتیاط سے سیف زلفی کی تمام غیر مطبوعہ تخلیقات کا مطالعہ کیا ہے اور خاص طور پر ان کے تحریر کردہ مرثیوں کو بنظرِ غائر دیکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیف زلفی نے مجموعی طور پر صرف درج ذیل چار مرثیے یادگار چھوڑے ہیں:

پہلا مرثیہ

اُجلا ہے ذہن اور قلم پر نکھار ہے

سنِ تخلیق: ۱۹۷۱ء

کل بند: ۷۲

موضوع: حسینؑ کی بے مثال قربانیاں

---

(۹۰) آغا سلمان باقر ''سیف زلفی سے ملاقات'' لاہور: ماہنامہ ''شام و سحر'' اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۱۷

(۹۱) (i) محمد رفیق بلوچ ''سیف زلفی۔ احوال و آثار'' اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، مقالہ ایم۔ فل اُردو ۱۹۹۳ء (غیر مطبوعہ) ص ۶۱

(ii) عفت حسن ''سیف زلفی۔ شخصیت و فن'' لاہور: پنجاب یونیورسٹی، مقالہ ایم۔ اے اردو، ۱۹۹۲ء (غیر مطبوعہ) ص ۲۲۸

(iii) وحید الحسن ہاشمی ''اہلِ من ناصر'' لاہور: مرثیہ نگاران پنجاب ۲۰۰۰ء ص ۳۱

دوسرا مرثیہ

اصغر کا ذکر خالق اکبر کا فیض ہے

سن تخلیق: ۱۹۷۳ء

کل بند: ۸۰

موضوع: وسیلے کی اہمیت و شہادت حضرت علی اصغرؑ

تیسرا مرثیہ

غازیؑ کا نام لے کے دبیر قلم چلا

سن تخلیق: ۱۹۷۴ء

کل بند: ۵۱

موضوع: حضرت عباسؑ علمبردار کی شجاعت

چوتھا مرثیہ

لکھتا ہے داستان قیادت مرا قلم

سن تخلیق: ۱۹۷۵ء

کل بند: ۲۴۸

موضوع: عشق حسینؑ آب حیات ہے (۹۲)

(راقم الحروف نے یہ فہرست اصل مرثیوں کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی ہے)

اب ذیل میں سیف زلفی کے مرثیوں کا مختصراً تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش خدمت ہے۔

پہلا مرثیہ

سیف زلفی کا یہ مرثیہ ''ڈائری نمبر ۲۱'' پر مرقوم ہے۔ (۹۳) اس مرثیے کے آغاز

---

(۹۲) شبیہ الحسن، ڈاکٹر، جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۶۲

(۹۳) سیف زلفی کی یہ ڈائری راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے۔

میں ۷۱/۹/۲۸ رقم ہے اور اس تاریخ کے نیچے ۳ شعبان لکھی ہے۔ ہر صفحہ پر ایک بند لکھا گیا ہے۔ بہتر بندوں پر مشتمل سیف زلفی کا یہ پہلا مرثیہ ہے اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

سیف زلفی حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے عزیز و اقارب سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی ہر نثری و شعری تخلیق میں حسین علیہ السلام کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملتا ہے۔ یہ مرثیہ بھی امام حسین علیہ السلام سے بے پناہ محبت کا مظہر ہے۔ اس مرثیے کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے۔

اُجلا ہے ذہن اور قلم پر نکھار ہے
لفظوں کے دائروں میں ارم کی بہار ہے
جبریل فکر دوشِ حیا پر سوار ہے
مصرعوں سے حُسنِ جلوۂ حق آشکار ہے
آنکھیں ہوئیں جو بند تو تنویر دیکھ لی
محفل نے سب؛ حسینؑ کی تصویر دیکھ لی

شاعر احساس دلاتا ہے کہ ذہن میں امام عالی مقام کا تصور آتے ہی نگاہیں بے چین ہو گئیں اور بام تجلیات پر نقرئی سحر طلوع ہو گئی۔ خدا کی خدائی روشن ہو گئی اور دین محمدؐ پر بہار کے آثار ہویدا ہو گئے۔ شاعر کی چشم تخیل دیکھتی ہے کہ خالق ازل نے امام حسینؑ کو اس لیے زمین پر بھیجا ہے تا کہ وہ دنیا میں جا کر وحدت حق کا محافظ بنے اور مر کے دنیا کو جینے کا سبق سکھا دے۔ اسی باعث شاعر نے امام حسینؑ کو روحِ پنجتن، خدائی کی جان، غرور انسان اور محمدؐ کی شان قرار دیا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ امام حسینؑ فخر انبیا کی نشانی، دین اسلام کی حسین جوانی، بے پایاں سمندروں کی روانی، مصطفیٰؐ خصال، مرتضیٰؑ کمال، مجتبیٰؑ جمال اور اس کائنات رنگ و بو میں لازوال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امام حسینؑ کو خانہ محمدؐ میں اس لیے جلوہ گر کیا ہے کہ یہ دونوں حق کے تحفظ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ شاعر اللہ تعالیٰ کی زبان سے عظمت حسینؑ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

گلیوں میں کوچہ کوچہ میں قصبہ میں شہر میں
ڈنکا بجے گا تیری فضیلت کا دھر میں
طغیانیاں اٹھیں گی محبت کی نہر میں
اک گونج سی اٹھے گی زمین و سپہر میں

انسان بول اٹھے گا شہِ مشرقین ہے
دنیا یہی کہے گی "ہمارا حسین" ہے"

شاعراحساس دلاتا ہے کہ حسین علیہ السلام اس کائنات میں اللہ کا ایک عظیم انعام ہے لہٰذا ہر شخص پر حسینؑ کی اطاعت فرض ہے اور جو حسین علیہ السلام سے بے لوث محبت کرے گا اللہ اور اس کا رسولؐ اس کے لیے اجرِ عظیم عطا کرے گا۔ اس کے برعکس اگر کسی کے دل میں حسینؑ نہیں ہے تو اس شخص کی زندگی زندگی نہیں ہے اور جس کے دل میں حسینؑ کی الفت نہ ہو اسے آدمی کہلانا زیب ہی نہیں دیتا۔ امام حسینؑ کی دنیا میں تشریف آوری کے کیا اثرات مرتب ہوئے صرف ایک بند ملاحظہ فرمایئے ۔

گونگوں کو نطق، نطق کو گویائی مل گئی
اندھوں کو آنکھ، آنکھ کو بینائی مل گئی
بینائی کو نگاہ کی دارائی مل گئی
عزم و عمل کو اور توانائی مل گئی

جاری ہوا زمین پہ سکہ حیات کا
سایہ ملا بشر کو خدائی صفات کا

امام عالی مقام کی اس عزت وعظمت کو دیکھ کر شیطان وابلیس صفتوں کو بڑا ملال ہوا لہٰذا انہوں نے عظمت بشر کے اس نمائندہ کو مٹانے کی سازشیں تیار کرلیں۔ یہ گروہ شیاطین عظمت انسانی کو کم کرنے کے لیے مختلف روپ میں ظاہر ہوا اور اس کا بدترین نمائندہ یزید کی شکل میں ظاہر ہوا۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ یزید کے حکمران بنتے ہی اللہ و رسول کے فرامین بے حرمت ہو گئے۔

قرآن کی تذلیل ہونے لگی۔ شریعت کی پاسداری ختم ہوگئی۔ بے دینوں نے دینداروں کی وقعت کم کرنا شروع کردی اور پورے ماحول پر لادینیت کی حکمرانی ہوگئی۔ اس صورتِ حال میں نمائندہ حق یعنی امام حسینؓ نے یزید کے غیر اسلامی اقدامات کے خلاف اعلان جہاد کردیا۔ امام عالی مقام نے حق کی طاقت ونصرت کے سہارے یزیدی قوتوں سے ٹکرانے کا فیصلہ کرلیا۔ ان کے اس عمل کے پیچھے اللہ اور اس کے رسول کا یہ حکم بھی تھا۔

کر پاش پاش ظلم و تشدد کے کوہ کو
ہاں، خاک میں ملا دے یزیدی شکوہ کو

امام عالی مقام کربلا کے میدان میں یزیدی قوتوں کے خلاف صف آرا ہوگئے اور انہوں نے اپنے جانثاروں کو تحفظ حق کی خاطر قربان کرنا شروع کردیا۔ سب سے پہلے شاعر نے شہادت علی اکبرؓ کے دلخراش مناظر پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عباسؓ وحضرت قاسمؓ کی قربانیوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد حضرات عونؓ ومحمدؓ اور حضرت علی اصغرؓ کی شہادت پیش کی گئی ہے۔ آخر میں شاعر نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ اسے محمدؐ وآل محمدؐ کی محبت سے سرشار کر دے تاکہ وہ ان کے قصائد پیش کرتا رہے۔

سیف زلفی کا یہ مرثیہ جلال و جمال کی بہترین مثال ہے۔ پورے مرثیہ میں تمہیدی طنطنہ موجود ہے اور مرثیت کا فقدان نظر آتا ہے۔ آخری بندوں میں شاعر نے بکائیہ بند شامل کر کے اسے حزنیہ رنگ دینے کی شعوری کوشش کی ہے۔ بعض مقامات انتہائی الم انگیز ہیں اور شاعر نے مہارت شعری سے ان کو مزید غم ناک بنا دیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک کامیاب مرثیہ ہے۔

۲۔ دوسرا مرثیہ

سیف زلفی کا یہ مرثیہ ایک بوسیدہ کاغذ پر کاربن کاپی کے طور پر ان کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ (۹۴) آغاز میں اس مرثیے کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کی رائے درج ہے جو

---

(۹۴) سیف زلفی کے ہاتھ کا لکھا یہ مرثیہ راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔

انہوں نے ۲۔ جنوری ۱۹۷۴ء کو یہ مرثیہ سننے کے بعد تحریر فرمائی ہے۔ ایک صفحہ پر سیف زلفی نے اپنے ہاتھ سے یہ جملے لکھے ہیں:

"......جدید مرثیہ......وسیلہ ۸۰ بند

اس مجاہد کا ذکر جس کی عمر کربلا میں صرف چھ ماہ تھی یعنی جناب علی اصغر علیہ السلام"

نیچے ان کا پتہ 62/B علامہ اقبال روڈ لاہور درج ہے۔ مرثیے سے قبل دو قطعات درج ہیں۔ سیف زلفی نے یہ مرثیہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۴ء کو حلقۂ اہل قلم کے اجلاس میں اظہار کاظمی کی صدارت میں پیش کیا تھا۔ (۹۵) اس اجلاس کی کارروائی حلقۂ اہل قلم کے رجسٹر میں محفوظ ہے اور اس میں اس مرثیے کے چند بند بھی تحریر ہیں۔ (۹۶)

کربلا کے ننھے مجاہد حضرت علی اصغر علیہ السلام کی شہادت کے حوالے سے بے شمار مرثیے لکھے گئے ہیں اور سیف زلفی کا یہ مرثیہ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مرثیہ کا آغاز درج ذیل بند سے ہوتا ہے ۔

اصغرؑ کا ذکر خالق اکبر کا فیض ہے
غنچے کے تذکرے ہیں، گل تر کا فیض ہے
حق کا بیان صدق پیمبرؐ کا فیض ہے
چھوٹا سا مرثیہ علی اصغرؑ کا فیض ہے
اصغرؑ کے فیض خاص سے چھوٹے بڑے ہوئے
ہر بیت میں ہیں فکر کے سورج جڑے ہوئے

شاعر کا موقف یہ ہے کہ جناب علی اصغرؑ کا تصور ذہن میں آتے ہی زبان لفظوں کے آفتاب

---

(۹۵) شبیہ الحسن، ڈاکٹر، جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی، لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۱

(۹۶) اس اجلاس کی کارروائی کا رجسٹر راقم کے پاس محفوظ ہے۔ حلقۂ اہل قلم کے اس اجلاس کی کارروائی کے نیچے جوائنٹ سیکرٹری اختر کاظمی اور آئندہ اجلاس کے صدر اظہر میر کے دستخط موجود ہیں۔

اُگلنے لگی اور اذہان میں رنگ و نور کا ایک سیلاب آ گیا۔ شاعر کے مُرغِ تخیل کے بال و پر کھل گئے اور اس نے حضرت جبریل علیہ السلام سے نظر مستعار لے کر شہرِ علم کے در سے سخن کی بھیک مانگی۔ بابِ علم کے دریائے سخاوت سے ایک قطرہ حاصل کرنے کے بعد شاعر کا مرتبہ کیا ہو گیا ملاحظہ فرمایئے:

تاریخ کے تمام سمندر کھنگال کے
نقشے الٹ پلٹ کے جنوب و شمال کے
منطق کی فلسفہ کی دکاں دیکھ بھال کے
لایا حکایتوں سے حقیقت نکال کے

نورِ خرد سے کاسۂ ادراک بھر دیا
ذہنوں کو آفتاب کا ہمراز کر دیا

شاعر کا موقف یہ ہے کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ سے تمسک کے بعد اس کی عقل ہمدوشِ ثریا ہو گئی اور اس نے خالقِ کائنات سے ہم کلام ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا۔ شاعر کے شعور و ادراک نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد یہ استفسار کیا کہ قادر و مالک ؎

اپنی پسند کا کوئی رستہ دکھا مجھے
اے ذوالجلال کوئی وسیلہ بتا مجھے

اللہ تعالیٰ نے شاعر کو جواب دیا کہ اگر تو دنیا و آخرت میں سرخرو ہونا چاہتا ہے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے در پر دیگر انبیا، ملائکہ اور اولیا کی طرح اپنے سرِ تسلیم کو خم کر دے۔ اس کونین میں یہی معرفتِ الٰہی کا خزینہ اور نجات کا سفینہ ہے اور یہی سب سے بڑا، اہم اور کارآمد "وسیلہ" ہے اس کے بعد شاعر نے اللہ تعالیٰ کی زبانی حضرت محمدؐ کی مدح سرائی کی ہے اور انہیںؐ اسلام کا مبلغِ اعظم، وحدانیت کے رموز کا محرم، انسانیت کے قصر کا پرچم، بحر و بر کا مختار، خلق کا سردار، نور کا مینار، دنیا کی ظلمتوں میں مددگار اور معین قرار دیا ہے۔ شاعر کے شعور نے اصل "وسیلہ" کو پہچان لینے کے بعد درِ رسولؐ پر حاضری دی اور ان سے درخواست کی کہ آپؐ اپنی معرفت کرا

دیجیے حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میرے چراغ فکر کی تنویر میری کتاب قلم کی تحریر میری حدیث علم کی تفسیر اور میرے نور کی اصل تصویر حضرت علیؑ ہیں لہٰذا تو میرے ساتھ ساتھ انہیں بھی اپنا وسیلہ سمجھ۔ اس کے بعد شاعر نے مدحت علیؑ میں اپنا زور بیان صرف کیا ہے۔ شاعر کی عقل و خرد حضرت علی علیہ السلام کے پاس پہنچی اور ان سے التجا کی کہ۔

سرکارؐ راہ حق کا پتہ دیجئے مجھے
سرکارؐ کبریا سے ملا دیجئے مجھے

حضرت علی علیہ السلام نے خرد کو کرب و بلا کا پتہ بتا دیا اور ارشاد فرمایا کہ یہیں رضائے کبریا سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد شاعر نے اپنی عقل و خرد کو کرب و بلا کے میدان میں پہنچا دیا۔ کرب و بلا میں امام عالی جرأت و استقامت کے ساتھ راہ کبریا میں اپنی بے مثال قربانیاں پیش کر رہے تھے۔ امام عالی مقام کے اصحاب عزیز و اقارب اور اہل خانہ راہ خدا میں اپنی جان کے نذرانے پیش کر رہے ہیں لیکن حسینؑ کے کوہ ثبات میں لرزش پیدا نہیں ہوتی حتیٰ کہ حضرت علی اکبرؑ حضرت قاسمؑ اور حضرت عباسؑ کی شہادت بھی اس جری کو اپنے موقف پر قائم رکھتی ہے۔ جب تمام لوگ شہید ہو جاتے ہیں تو امام عالی مقامؑ اپنی ننھی سی قربانی راہ خدا میں پیش کرنے کے لیے لاتے ہیں۔ شاعر نے اس موقع پر حضرت اصغرؑ کی استقامت کی نقشہ کشی کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

چہرے پہ کوئی خوف نہ کوئی ہراس ہے
اصغرؑ ہے شیر خوار مگر حق شناس ہے
پوتا نبی کا عزم شجاعت اساس ہے
شبیر کے عمل کی بلندی کے پاس ہے

سینہ سپر ہے کفر کی بیداد کے لیے
ورثہ ہے یہ رسولؐ کی اولاد کے لیے

اس کے بعد شاعر نے انتہائی دردناک انداز میں حضرت علی اصغرؑ کی شہادت کا منظر بیان کیا

ہے۔ شاعر کا موقف ہے کہ اس معصوم بچے کی شہادت ذہن انسان پر اپنے مثبت اثرات مرتب کرے گی۔ آخری بندوں میں شاعر نے جذبات و احساسات کے بیان میں اپنی شاعرانہ مہارت کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مرثیہ سیف زلفی کے فکر و فلسفہ اور فنی چابکدستی کا عمدہ ترین نمونہ ہے۔ اس مرثیے کی ایک نئی جہت یہ تھی کہ شاعر نے ''وسیلہ'' کا عنوان دے کر اس مرثیے کو موضوعاتی بنا دیا تھا اور اسی حوالے سے انہوں نے موضوع کے مختلف رُخوں کو اُجاگر کرنے کی کامیاب سعی بھی کی۔ مجموعی طور پر اس مرثیے کو موضوعاتی سطح پر بھی ایک کامیاب مرثیہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اب اس مرثیے کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کی رائے بھی دیکھ لیجیے:

''......میں نے متعدد مرثیے پڑھے اور سنے ہیں مگر میری ہمیشہ تمنا رہی ہے کہ جدید شعراء کو بھی اس صنف شعر میں اپنے کمال فن کا اظہار کرنا چاہیے۔ حضرت سیف زلفی کا یہ مرثیہ سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری یہ دیرینہ تمنا پوری ہوگئی ہے۔ یہ مرثیہ ہر لحاظ سے مرثیہ بھی ہے اور دورِ جدید کا آئینہ دار بھی۔ دورِ جدید میں اگر کوئی شاعر مرثیہ کہے گا تو اس سے بہتر کیا کہے گا۔ دگنی آسودگی مجھے اس وقت حاصل ہوئی جب میں نے زلفی صاحب کا مرثیہ خود سیف زلفی صاحب ہی کی زبان سے سنا اور ایک بھری مجلس میں سنا۔ مرثیہ پڑھنے کا یہ موثر انداز مجھے بڑے بڑے مرثیہ پڑھنے والوں کے ہاں بھی شاذ ہی نظر آیا ہے۔ جس لہجے میں زلفی صاحب مرثیہ پڑھتے ہیں وہ موثر ہونے کے علاوہ مفاہیم کی پرتیں بھی کھولتا چلا جاتا ہے اور یہ خصوصیت کسی کسی ہی کو نصیب ہوتی ہے۔'' (۹۷)

---

(۹۷) احمد ندیم قاسمی کی یہ رائے سیف زلفی نے مرثیے کے آغاز میں ابتدائی صفحہ پر چسپاں کردی ہے۔ یہ رائے قاسمی صاحب کے اپنے ہاتھ سے تحریر کردہ ہے۔ ایک جانب ان کے دستخط ثبت ہیں اور ۲ جنوری ۱۹۷۴ء کی تاریخ درج ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے دیگر مواقع پر بھی اس مرثیے کے حوالے سے اپنی گراں قدر رائے پیش کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

(ا) ''......سیف زلفی عقیدے سے شیعہ مسلمان تھے اس لیے انہوں نے سلام اور مرثیے بڑے جذبے سے لکھے بلکہ جب ایک بار انہوں نے ایک طویل مرثیہ مکمل کر لیا تو کرشن نگر میں اسے اول تا آخر پڑھنے کی تقریب منعقد ہوئی اور مجھے اس تقریب کی صدارت سونپی گئی جس جوش وخروش سے انہوں نے یہ مرثیہ پڑھا وہ دیدنی تھا۔ اس مرثیے میں بیشتر جوش ملیح آبادی کا رنگ تھا آدھا مرثیہ پڑھنے کے بعد وہ پسینہ پسینہ ہو گئے۔ انہیں بڑی مشکل سے مکمل مرثیہ پڑھنے سے روکا گیا۔'' (۹۸)

(ب) ''......پھر ایک روز اس نے مجھے ایک ایسے اجتماع میں مدعو کیا جس میں وہ مرثیہ سنانے والا تھا۔ یہ مرثیہ جوش ملیح آبادی اور قیصر بارہوی کے مرثیوں کی طرح ایک جدید مرثیہ تھا......سیف زلفی کا مرثیہ پڑھنے کا خاص اسلوب اس پر مستزاد تھا۔'' (۹۹)

۳۔ تیسرا مرثیہ

سیف زلفی کا یہ مرثیہ ایک بوسیدہ کاغذ کی خود ساختہ کاپی پر ان کے اپنے ہاتھ سے تحریر کردہ ہے۔ اس کاپی کے اوپر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور یا علیؑ مدد رقم ہے۔ اس کاپی کے دائیں جانب سے مرثیہ تحریر کیا گیا ہے اور بائیں جانب سے حضرت عباس علمبردارؑ کی شان وفضیلت کے حوالے سے چند دوہے تحریر ہیں۔ یہ مختصر مرثیہ اکیاون بندوں پر مشتمل ہے۔ مرثیے کے آخر میں سیف زلفی کے دستخط ثبت ہیں اور ۷۴۔۱۲۔۱۰ تاریخ مرقوم ہے۔ (۱۰۰)

---

(۹۸) احمد ندیم قاسمی ''مکتوب بنام عفت حسن'' مطبوعہ ''جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی'' لاہور: الحبیب پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۶۔۴۵

(۹۹) احمد ندیم قاسمی ''سیف زلفی کا طرز نعت گوئی'' لاہور: ماہنامہ ''شام وسحر'' اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۲۷

(۱۰۰) راقم الحروف کے پاس یہ کاپی محفوظ ہے۔

حضرت عباس علمبردارؑ کی ذات وصفات کے حوالے سے بے شمار مرثیے تخلیق کیے گئے ہیں۔ قدیم وجدید مرثیہ نگاروں نے اپنی اپنی جدت طبع کے حوالے سے نئے نئے افکار و نظریات کے ذریعہ اسوۂ عباسؑ اُجاگر کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ سیف زلفی نے بھی جدید لب ولہجے میں حضرت عباسؑ کی سیرت وکردار کے اعلیٰ ترین نقوش اس مرثیے میں پیش کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ اس مرثیے کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے۔

غازی کا نام لکھ کے دبیر قلم چلا
مچلا فراتِ دل میں شجاعت کا ولولہ
چمکا نگاہِ عشق میں میدان کربلا
الفاظ کی جبیں پہ خیالوں نے خوں ملا
مہتاب فکر غم کی گھٹاؤں میں گھر گیا
عباسؑ کا شباب نگاہوں میں پھر گیا

مرثیہ کے آغاز میں شاعر نے حضرت عباسؑ کے چہرے اور رنگ وروپ کو بیان کیا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ حضرت عباسؑ میں حضور اکرمؐ کی کجکلاہی، حضرت جعفرؑ طیار کی آن بان اور حضرت حیدر کرارؑ کی شجاعت موجزن تھی۔ یہی حضرت عباسؑ جب اوصاف مصطفیٰ کا خزینہ لے کر کرب وبلا کے میدان میں تشریف لائے تو ان کی ذات مجسم مدینہ بن گئی۔ شاعر نے حضرت عباسؑ کو خدا پرست، اسرار معرفت میں طریقت نواز، شہنشاہِ بخت، ریاض علیؑ کا درخت، روح بہار، جان گلستان، آئینہ وفا پہ نکھار، باغ حسینؑ کی بہار، زینب کے دل کا قرار، میدان کربلا کا وقار اور لشکرِ حسینؑ کی آس قرار دیا ہے۔ شاعر احساس دلاتا ہے کہ صبح عاشورا امام عالی مقام نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت عباسؑ کو طلب کیا اور لشکر حسینیؑ کا نورانی علم ان کے سپرد کردیا۔ اس منظر کو شاعر نے بڑے دلچسپ انداز میں اُجاگر کیا ہے آپ بھی ملاحظہ فرمایئے:

عباس نے علم کو سنبھالا بصد وقار
پھرنے لگا نگاہ میں خیبر کا کاروبار

انگڑائی لی جو شیر نے لہرا کے ایک بار
ہونے لگا ہوا میں پھریرے کو اضطرار
نغموں سے بلبلوں کے چمن گونجنے لگا
نعرہ لگا علیؑ کا تو بن گونجنے لگا

کرب وبلا کے میدان میں جنگ وجدل کا بازار گرم ہوا تو احباب وانصار حسین راہ خدا میں قربان ہوتے گئے تاہم جب حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کی خبر آئی تو اہل خانہ اُداس ہو گئے۔ حضرت قاسمؑ کی المناک شہادت کے موقع پر شاعر نے حضرت عباسؑ کے جلال کو شاعرانہ اسلوب میں اُجاگر کیا ہے۔ آپ اس بند میں موجود نفسیاتی کیفیت ملاحظہ فرمایئے:

قاسم کی لاش آئی تو محشر ہوا بپا
تڑپے تڑپ کے رہ گئے عباس باوفا
آقا سے لیکن اذنِ وغا پھر نہ مل سکا
جذبے میں جتنا جوش تھا سینے میں رہ گیا
غازی کی سانس تیز چلی ہانپنے لگا
وہ فرطِ غیظ تھا کہ بدن کانپنے لگا

شاعر نے اذن وغا کے لیے حضرت امام حسینؑ، حضرت زینبؑ اور حضرت عباسؑ کے درمیان ہونے والی گفتگو کو بڑے سلیقے، مہارت اور نفاست سے بیان کیا ہے۔ حضرت عباسؑ کے الوداع ہونے کا دلخراش منظر بھی شاعر نے سوز ودردمندی سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد شاعر نے حضرت عباس علمبردار کی میدان کرب وبلا میں آمد اور ان کی بے مثال شجاعت کے مختلف روپ اُجاگر کیے ہیں۔ آخر میں شاعر نے حضرت عباسؑ کی شہادت اور اس کے دردناک اثرات قلمبند کیے ہیں۔ آخری بند ملاحظہ فرمایئے۔

غازی کو اس جگہ ہی لٹایا حسینؑ نے
روتے ہوئے علم کو اٹھایا حسینؑ نے

خیمے میں جا کے خون دکھایا حسینؑ نے
اور خود ہی مرثیہ بھی سنایا حسینؑ نے
کہتے تھے ہائے اے مرے غم خوار ہائے ہائے
خیمہ میں شور تھا کہ علمدار ہائے ہائے

سیف زلفی کا یہ مرثیہ فکری اعتبار سے موضوعی تناظر میں اس لیے اہم قرار پاتا ہے کہ شاعر نے پورے مرثیے میں حضرت عباسؑ ہی کو موضوع بحث رکھا ہے۔ شاعر نے اگرچہ کسی بڑے فکری نکتہ کی جانب اشارہ نہیں کیا تاہم اپنے لب و لہجے کی گھن گرج سے مرثیے کے سامعین کو اپنی جانب متوجہ رکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ لفظوں کے اتار چڑھاؤ اور زیر و بم نے مرثیے کو صوتی اعتبار سے خوش گوار بنا دیا ہے۔ خاص طور پر جب سیف زلفی نے یہ مرثیہ اپنے مخصوص طرز میں پڑھا ہوگا تو اس کا اثر دو چند ہو گیا ہوگا۔ شاید اسی مرثیے کے بارے میں ناصر چودھری نے لکھا ہے:

''......محرم کی مجالس میں جب یہ حسینیؑ ضیغم مرثیہ خواں ہوتا ہے تو پوری مجلس کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔''(۱۰۱)

اب آخر میں سیف زلفی کے اس مرثیے کا ایک بند دیکھئے اور سوچیے کہ اگر سیف زلفی اس بند کو اپنے جوشیلے اور کٹیلے انداز میں پڑھتے تو اس بند کا لطف دوبالا ہو جاتا......

کچھ نے کہا، کہ لو وہ علمدارؑ آ گئے
گھبرائے کچھ کہ جعفر طیارؑ آ گئے
کچھ بولے خود ہی احمد مختارؐ آ گئے
بھگدڑ مچی کہ حیدر کرارؑ آ گئے
غازی کے رُعب داب سے گھبرا کے مر گئے
اور کچھ علم کی لہر سے تھرا کے مر گئے

---

(۱۰۱) ناصر چودھری ''سیف زلفی۔ ایک عظیم شاعر'' لاہور: ماہنامہ شام و سحر، اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۴۴

۴۔ چوتھا مرثیہ

سیف زلفی کا یہ مرثیہ ایک کاغذی دستہ پر رقم ہے۔(۱۰۲) مرثیہ کے آغاز میں سیف زلفی نے اس کا عنوان "تسخیر قلوب" تحریر کیا ہے۔ مرثیے کے آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن اور یا علی مدد تحریر ہے۔ ہر صفحہ پر ایک بند لکھا گیا ہے۔ یہ مرثیہ بنیادی طور پر امام حسین علیہ السلام کی مدح میں لکھا گیا ہے اور دو سو اڑتالیس بندوں پر مشتمل ہے۔ اس قلمی نسخہ پر کوئی تاریخ تو نہیں لکھی گئی ہے تاہم یہ امر طے ہے کہ یہ مرثیہ ۱۹۷۵ء میں معرض تخلیق میں آیا ہے۔ سیف زلفی اپنے اس مرثیے پر بڑا فخر کرتے تھے لہٰذا ان کا یہ بیان بھی دیکھتے چلیئے:

> "......البتہ میں اپنے ایک مرثیہ کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں اسے انگریزی میں ترجمہ کروں تو وہ بین الاقوامی ادب کی آنکھ سے آنکھ ملا سکتا ہے۔"(۱۰۳)

اس کائنات رنگ و بو میں کچھ ایسی شخصیات بھی ظہور میں آئی ہیں جن کی تخلیق پر خود خالق کائنات نے فخر کیا ہے اور ان کے طرز عمل کو اپنانے کی تلقین فرمائی ہے۔ ان عظیم المرتبت شخصیات میں سے ایک شخصیت حضرت امام حسین علیہ السلام کی بھی ہے۔ سیف زلفی حضرت امام حسین علیہ السلام کی سیرت و کردار سے بے حد متاثر ہیں اور خاص طور پر انہوں نے حسین علیہ السلام کے کردار سے "انسان دوستی" کے وصف کو اپنا مسلک قرار دیا ہے(۱۰۴) زیر مطالعہ مرثیہ میں بھی سیف زلفی نے سیرت و کردار حسینؑ کو آب حیات قرار دیا ہے۔ اس مرثیے کا آغاز درج ذیل بند سے ہوتا ہے۔

---

(۱۰۲) راقم الحروف کے پاس یہ کاغذی دستہ موجود ہے۔

(۱۰۳) آغا سلمان باقر "سیف زلفی سے ملاقات" مشمولہ جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی' لاہور: الحسن پبلی کیشنز' ۲۰۰۰ء' ص ۲۲۳

(۱۰۴) سیف زلفی "رائے" لاہور: ماہنامہ "فنون" جدید غزل نمبر' جلد دوم جنوری ۱۹۶۹ء' ص ۱۶۵۹

لکھتا ہے داستانِ قیادت مرا قلم
کرتا ہے جنگ امن کی صورت مرا قلم
پی کر شعور فہم و فراست مرا قلم
دیتا ہے زندگی کو حرارت مرا قلم

میرے قلم کی چھاؤں میں چلتا ہے آفتاب
لفظوں کے دائروں میں مچلتا ہے آفتاب

شاعر کا موقف یہ ہے کہ اس کا قلم انسانیت کے احترام میں اپنا فریضہ صبح و شام ادا کر رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کے قلم سے گلستان انیس و دبیر و جوش کی خوشبو آتی ہے۔ شاعر نے ابتدائی بندوں (چہرے) میں اپنے قلم کی مدحت و توصیف کی ہے اور اسے نغمہ گر عندلیب' طائر سدرہ نصیب' معراجِ فکروفن کے قریب اور شب کی وادیوں میں سحر کا نقیب قرار دیا ہے۔ شاعر یقین دلاتا ہے کہ جب یہی قلم راہ مستقیم پر چلتا ہے تو انسان کے اندر شعور پیدا ہوتا ہے اور یہی شعور انسان کو ولایت کی منزل تک پہنچانے کا وسیلہ بنتا ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے کہ عصر حاضر میں کذب و ریا کا دور دورہ ہے۔ انسان نے انسانیت کے لوٹ کے سامان پیدا کر دیے ہیں اور اب ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس صورت حال میں شعور فکر کو چاہیے کہ

سچائیوں کو بادِ صبا کا مزاج دے
قربانیوں کے سر کو فضیلت کا تاج دے
عشق و جنوں کو رسم وفا کا مزاج دے
سارے معاشرے کو چمکتا سماج دے

کانٹوں میں روح پھونک کے صبح بہار کی
ٹھہرا دے نبض گردشِ لیل و نہار کی

شاعر احساس دلاتا ہے کہ عصرِ حاضر میں انسان کائنات کی تسخیر کے لیے جست و خیر کر رہا ہے۔ زمین و آسمان کے فاصلے سمٹ رہے ہیں اور ذہن کی پرواز بلند سے بلند ہوتی جا

رہی ہے۔ اس صورتِ حال میں انسان کا اولین فرض شاعر کے نزدیک یہ ہے کہ وہ فاتحِ کائنات بننے کے بجائے تسخیر قلوب کی جانب متوجہ ہو۔ اگر انسان نے انسان کے دل کو فتح کر لیا تو اس سے بڑی کامیابی کوئی نہیں ہے۔ شاعر کے نزدیک تسخیر قلب سلسلۂ معجزات، حسن حیات وصفات، پاک ارادوں کی بات، کارِ رسالت مآب، شہر علم کا باب اور خدا کی کتاب ہے۔ شاعر کا موقف یہ ہے اس کائنات میں اس عظیم کام یعنی تسخیر قلوب کی ذمہ داری امام حسین علیہ السلام نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔ بقول شاعر :

یہ کام انتخاب کیا ہے حسینؑ نے
اس شام کو چراغ دیا ہے حسینؑ نے

حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنی فہم وفراست کو بروئے کار لاتے ہوئے اس مشکل کام کو مکمل کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے دیکھا کہ وحدت ورسالت کا فروغ اور قرآن مبین کی صحیح تفہیم انسانی قلوب کو تسخیر کرنے کے لیے نہایت ضروری امور ہیں۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی خدا اور رسولؐ اور قرآن کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد شاعر نے خاندان حسین علیہ السلام کے فضائل بیان کیے ہیں اور خاص طور پر حضور اکرمؐ حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ اور امام حسن علیہ السلام کی سیرت وکردار کے تمام نمایاں رُخوں کو خوبصورت شعری انداز میں اُجاگر کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ ایک بند ملاحظہ فرمایئے:

اوصاف باب علم کروں گا اگر رقم
چومیں گے روشنی کے فرشتے مرا قلم
اترے گی داد محفل انجم سے دم بدم
چہکیں گے شعریت کے پرندے ارم ارم

مجھ کو بھی فن ملا ہے انیسؔ و دبیرؔ کا
شاعر ہوں خاندانِ جناب امیرؑ کا

شاعر احساس دلاتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام میں درج بالا چاروں شخصیات کی

صفات یکجا ہوگئی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ امام عالی مقام کے کاندھوں پر پوری کائنات کا بوجھ بھی آ گیا ہے۔ شاعر استفسار کرتا ہے کہ اگر اس کائنات میں حسینؓ نہ ہوتے تو کیا ہوتا......؟؟؟؟ پھر خود اس کا دلنشیں جواب دیتے ہیں:

ہوتا نہ گر حسینؓ اُجالوں کا پاسباں
کھاتی یہ کائنات اندھیروں میں ڈبکیاں
ملتا کہیں نہ منزلِ خورشید کا نشاں
اڑتا رسولِ پاکؐ کی تبلیغ کا دھواں

دینِ محمدیؐ کو سنوارا حسینؓ نے
اللہ کو دلوں میں اتارا حسینؓ نے

حضرت امام عالی مقامؓ نے اللہ تعالیٰ کی رضا و رغبت اور اسلام کی سربلندی کے لیے کرب و بلا کے میدان میں اپنے لہو سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ انہوں نے اپنے عزیز و اقارب کو راہِ خدا میں قربان کیا اور ہر قربانی کے بعد بارگاہِ رب العزت میں شکرانہ ادا کیا اور اپنی قربانیوں کی قبولیت کے لیے دعا فرمائی۔ آخر میں امام عالی مقام خود میدان کارزار میں باطل کے مقابلے میں آئے۔ اس ملال انگیز صورت حال میں بھی حق کے اس نمائندے کی حالت قابل دید تھی۔ شاعر کے نزدیک امام عالی مقام کی فضیلت یہ ہے کہ انہوں نے غم و اندوہ کی اس فضا میں بھی دشمن پر اپنی ہیبت کو کم نہ ہونے دیا۔

ہم کیا ہیں اور کون ہیں پہچانتے نہیں
سر پر حقیقتوں کی ردا تانتے نہیں
تم خوب جانتے ہو مگر جانتے نہیں
آؤ مقابلے میں اگر مانتے نہیں

نیکی سدا لڑی ہے برائی کے ناگ سے
آؤ تمہیں ملاؤں جہنم کی آگ سے

شاعر نے اس موقع پر امام حسین علیہ السلام اور سپاہ شام کے درمیان ہونے والی گفتگو کو جس سلیقے سے بیان کیا ہے وہ بھی قابل قدر اور لائق صد تحسین ہے۔ امام عالی مقامؑ نے یزیدی فوج کو جو نصیحت کی ہے وہ بھی عصر حاضر کے یزیدی فکر لوگوں کے لیے چراغ ہدایت ہے۔ اس کا ایک بند آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

باہر نکل کے آؤ ہلاکت کی ذات سے
لے لو ذرا سی بھیک سحر کی زکات سے
پی لو شعور، نور چراغ صفات سے
آؤ تمہیں ملاؤں حقیقی حیات سے
قطرے کا بھی نصیب بنے دُر کا مرتبہ
مر کر بھی راہِ حق میں ملے حُرؑ کا مرتبہ

حق و باطل کی اس لڑائی میں امام حسین علیہ السلام نے انتہائی جرأت اور ثابت قدمی کے ساتھ دشمنوں کے ساتھ جنگ کی۔ شاعر نے اس جنگ کے مناظر کی بڑی دلکش تصویر کشی کی ہے آخر کار سید الشہداؑ نے رضائے رب کے حصول کے لیے شہادت کا راستہ اختیار کیا اور جنت مقام ہوگئے۔

اس طویل مرثیے میں شاعر نے اپنی خداداد شعری صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ خوبصورت اور نادر تراکیب و مرکبات نے اس مرثیے کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مرثیہ اپنی فکر اور ندرت کے اعتبار سے انتہائی قابل قدر اور لائق توجہ ہے۔ خاص طور پر سیف زلفی نے اس مرثیہ میں عصر حاضر کے سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی حالات و واقعات کو جس استعاراتی رنگ میں پیش کیا ہے وہ ان کی شاعرانہ مہارت کی دلیل ہے۔ اس مرثیے کی مثالیں پیش کرتے ہوئے سید وحید الحسن ہاشمی رقمطراز ہیں:

"......سیف زلفی نے بڑے غور و فکر کے بعد اپنا نظریۂ حیات متعین کیا۔ غور و فکر اس لیے کہ جن کے سامنے مرثیہ پڑھنا تھا وہ اس تازہ شعور سے

> مفاہمت کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے فکری اجتہاد کے نفس کو مجروح نہ ہونے دیا اور مرثیوں کو جدید تقاضوں کے مطابق کرنے کی بھرپور کوشش کی جس میں وہ ایک حد تک کامیاب رہے۔" (۱۰۵)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو مرثیہ کی تاریخ میں سیف زلفی کا مقام و مرتبہ کیا ہے......؟؟؟ آیئے سب سے پہلے یہی سوال سیف زلفی سے پوچھتے ہیں۔ اب ذرا ان کا جواب بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

> "...... میں خود کو باقاعدہ مرثیہ نگار نہیں سمجھتا۔ کم از کم پچیس مرثیے لکھ کر میں اپنے آپ کو مرثیہ نگار سمجھوں گا۔" (۱۰۶)

سیف زلفی کی مرثیہ نگاری دو المیوں کا شکار ہو گئی۔ پہلا المیہ یہ کہ سیف زلفی چار سے زیادہ مرثیے نہ لکھ پائے تھے کہ قضائے الٰہی سے وفات پاگئے اور دوسری مزید الم انگیز بات یہ ہوئی کہ وہ چاروں مرثیے بھی یکجا ہو کر شائع نہ ہو سکے۔ ان دونوں المیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرثیے کے ناقدین سیف زلفی کو غزل کا شاعر سمجھتے رہے اور ان کے تذکروں اور تصانیف میں سیف زلفی کا نام برائے نام باقی رہ گیا۔ جدید دور کے تساہل پسند ناقدین نے "کاتا اور لے دوڑے" کے اصول کو اپناتے ہوئے سنی سنائی باتوں پر اعتبار کیا اور تنقید میں تحقیق کا حق ادا نہ کر پائے۔ ناقدین کے اس تغافل کی سزا سیف زلفی کو یہ ملی کہ ان کی مرثیہ نگاری کے بارے میں طرح طرح کی باتیں رواج پاگئیں جو حقیقت کم اور افسانہ زیادہ تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ چند معتبر ناقدین نے جزوی اشاروں کے ذریعہ سیف زلفی کے مرثیہ نگار ہونے کا اعتراف کیا اور یہی بات ہماری ان گزارشات کے لیے تحقیق کا سامان بنی ہے۔

سیف زلفی جدید لب و لہجے کے شاعر تھے۔ وہ بنیادی طور پر ایک غزل گو تھے اور

---

(۱۰۵) وحید الحسن ہاشمی، سید "سیف زلفی اور اردو مرثیہ" لاہور: ماہنامہ شام وسحر، اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۵۶

(۱۰۶) آغا سلمان باقر "سیف زلفی سے ملاقات" مشمولہ جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی' لاہور: الحسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۳۳۳

انہوں نے غزل کی توانائی کو اپنے جدید مرثیوں کی تشکیل کے لیے صرف کیا ہے۔ اس کا اظہار احمد ندیم قاسمی نے بھی کیا ہے۔

"......میں سیف زلفی کو برسوں سے ایک نوکیلے اور چونیلے غزل گو کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ پھر ایک روز اس نے مجھے ایک ایسے اجتماع میں مدعو کیا جس میں وہ مرثیہ سنانے والا تھا۔ یہ مرثیہ جوش ملیح آبادی اور قیصر بارہوی کے مرثیوں کی طرح جدید تھا۔ جدید ان معنوں میں کہ اس میں کربلا کے المیے کو عصر نو کے ذہنی رویوں اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے منفرد طرز احساس کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ سیف زلفی کا مرثیہ پڑھنے کا خاص اسلوب اس پر مستزاد تھا یہ محسوس کر کے مجھے تسکین ہوئی کہ زلفی اپنے مذہبی عقائد کو فنکارانہ انداز میں پیش کرنے پر قدرت رکھتا ہے اور اسے یہ قدرت اگر جبلی طور پر ودیعت ہوئی ہے تو ساتھ ہی اس میں اہم دخل اس کی غزل گوئی بھی ہے کہ غزل شاعر کے محسوسات' جذبات اور فکر کی تہذیب کرتی ہے اور شاعر کو زبان کا سلیقہ اور قرینہ سکھاتی ہے اور کامیاب مرثیہ نگاری کے لیے یہ فکری و محسوساتی تہذیب اور لفظوں کے مضمرات سے آگاہی ناگزیر ہوتی ہے۔" (۱۰۷)

سیف زلفی کا کارنامۂ خاص یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کے آغاز ہی میں حضورؐ اور ان کے خانوادے اور خصوصاً امام حسینؑ سے محبت کا والہانہ اظہار کیا ہے۔ آپ ان کی غزلوں' نظموں' دوہوں اور قطعات و رباعیات کا مطالعہ فرمالیجیے آپ کو ان میں محبت اہلبیتؑ کے مظاہر جگہ جگہ مل جائیں گے۔ (۱۰۸) سیف زلفی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان اصناف کے اوصاف کو مرثیہ میں سلیقے سے برتا ہے۔

---

(۱۰۷) احمد ندیم قاسمی' "سیف زلفی کا طرز نعت گوئی" لاہور: ماہنامہ "شام و سحر" اکتوبر ۱۹۹۲ء' ص ۲۷

(۱۰۸) اختر حسین' شیخ "شمشیر براں" مشمولہ "جدید لہجے کا شاعر۔ سیف زلفی" لاہور: الحسن پبلی کیشنز' ۲۰۰۰ء؛ ص ۲۹۱

سیف زلفی جدید ذہن کے مالک تھے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے اپنے مرثیوں میں عصر حاضر کے مسائل و معاملات کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ جدید متداولہ علوم اور رجحانات کو مرثیے میں جگہ دینا آسان نہ تھا لیکن سیف زلفی نے فنی چابکدستی سے اس مسئلے کو حل کر دیا ہے۔ آپ درج ذیل دو بندوں کا مطالعہ فرمایئے اور صرف اس بات پر غور کیجیے کہ کیا اردو کے کسی مرثیہ نگار نے یہ افکار مرثیے میں پیش کیے ہیں؟؟

لینن کے اشتراک پہ کچھ لوگ ہیں نثار
اور فلسفے پہ مارکس کے مرتے ہیں بے شمار
سقراط کے پیالے پہ غلطاں ہیں دس ہزار
زرتشت کے الاؤ میں جلتے ہیں چند یار
کچھ طالبان امن کو گوتم سے چین ہے
لیکن مری نظر کا اُجالا حسینؑ ہے

اے ساکنانِ دہر یہ نازک مقام ہے
سایا تباہیوں کا بھی نزدیک شام ہے
ایٹم کے اژدھوں کا بڑا اژدھام ہے
سمجھو کہ اب زمین کا قصہ تمام ہے
دنیا سلگ رہی ہے دھانے پہ جنگ کے
اک دن بھڑک اٹھے گی نشانے پہ جنگ کے

....

سیف زلفی نے محض حالات کی خرابی پر طنز کے تیر ہی نہیں برسائے بلکہ ان مسائل کے حل کے لیے اپنی سوچ و فکر کے مطابق تجاویز بھی دی ہیں۔ سیف زلفی کا یہ طرزِ احساس انہیں مصلح بھی بنا سکتا تھا لیکن ان کا شاعرانہ تخیل انہیں اس رویے سے بچا لیتا ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل دو بند ملاحظہ فرمایئے۔

تم چاند کے نگر میں بساتے ہو بستیاں
یارو ابھی زمیں پہ اندھیرا ہے بیکراں
دولت کے بل پہ نخوت و طاقت میں ہے زیاں
انسانیت کے نام پہ گونگوں کو دو زباں

ہر سُو زمیں پہ ابر گہر بار کی طرح
صحرا کو بھی وقار دو گلزار کی طرح

پھیلا نظر نظر کا اُجالا کرن کرن
نکھرا جبیں جبیں پہ محبت کا بانکپن
مہکا خرد خرد کا تبسم چمن چمن
پہنا بشر بشر نے حقیقت کا پیرہن

سچائی شاخ زیست میں کلیاں پرو گئی
انسانیت کی فکر کو معراج ہو گئی

سیف زلفی کے مرثیوں میں جدت کے ساتھ ساتھ کلاسیکی طرزِ احساس بھی ملتا ہے۔ ایک جانب تو وہ انیسؔ و دبیرؔ کی شاعری سے متاثر ہیں اور دوسری جانب وہ نجم آفندی، جوش اور قیصر بارہوی کے انقلابی تصورات کے شیدا ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تمام مرثیے جدت اور قدامت کا حسین امتزاج پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے سیف زلفی کی اپنی رائے ملاحظہ فرمالیجیے:

"..... انیسؔ و دبیرؔ کے بعد بہت مرثیہ لکھا گیا مگر اس میں جان پیدا نہیں ہوسکی اس دور کے مرثیے نے ترقی کی ہے لیکن بہت زیادہ نہیں۔ آج کے دور کے مرثیہ نگاروں میں قیصر بارہوی صف اول میں ہیں ان کے مرثیہ میں توانائی اور نیا پن ہے۔" (۱۰۹)

---

(۱۰۹) آغا سلمان باقر "سیف زلفی سے ملاقات"، لاہور: ماہنامہ "شام و سحر" اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۷

سیف زلفی کے مرثیے کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے جس میں انہوں نے جدید مرثیہ نگاری کو کلاسیکی رویے کے ساتھ پیوست کر دیا ہے۔

اوصاف باب علم کروں گا اگر رقم
چومیں گے روشنی کے فرشتے مرا قلم
اترے گی داد محفل انجم سے دم بدم
چہکیں گے شعریت کے پرندے ارم ارم
مجھ کو بھی فن ملا ہے انیس و دبیر کا
شاعر ہوں خاندان جناب امیر کا

سیف زلفی جدید مرثیے کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ تھے اور انہیں علم تھا کہ مرثیے کو جدید رویوں کا علمبردار کس طرح بنانا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں:

''......اب نہ تو مرثیے میں کسی چہرے کی ضرورت ہے اور نہ رزمیہ کی۔ جدید مرثیہ میں آپ کو پیغام پہنچانا ہے اور دوسرے ممدوح کے کردار کی نقشہ کشی کرنا ہے اور تیسرے یہ کہ فن کی پوری توانائی پیش کرنی ہے۔ آج کے دور کے تمام مسائل اور حالات کو زیر بحث لانا ہے اور آج کے مرثیے میں یہ سب کچھ بیان ہو سکتا ہے مثلاً میں نے اپنے ایک مرثیے میں اسلحہ کی دوڑ کو موضوع بنایا ہے اور کہا ہے کہ دنیا اللہ کا ایک خوبصورت فن پارہ ہے اسے بارود سے تباہ مت کرو اور آج کل اس مسئلے پر بڑی طاقتیں اجلاس کر رہی ہیں۔'' (۱۱۰)

سیف زلفی کے مرثیوں میں ایک جوش و طنطنہ ہے جو ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مرثیوں پر قصیدے کی چھوٹ پڑتی نظر آتی ہے۔ مرثیوں میں یہ پر تحمل اظہار انہیں دوسرے شعرا سے منفرد و ممتاز بنا دیتا ہے۔ ان کے اسلوب میں ایک جانب تو جوش و ولولہ ہوتا ہے اور دوسری جانب ان کا لہجہ انتہائی کٹیلا ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ سیف زلفی کے

---

(۱۱۰) آغا سلمان باقر ''سیف زلفی سے ملاقات'' لاہور: ماہنامہ ''شام و سحر'' اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۱۱۰

مرثیوں کے چہروں کی اٹھان تو عرفی و قاآنی کی یاد دلاتی ہے لیکن ان کے مرثیوں میں رثائیت کا جذبہ کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ سیف زلفی کے مرثیوں میں حزنیہ کیفیات کی کمی کے باعث انقلابی رویے اُبھرتے ہیں جو سامعین و قارئین کے اندر جوش و جذبہ بیدار کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ سیف زلفی کا یہ طرزِ احساس انہیں جوش ملیح آبادی کے قریب کر دیتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیف زلفی اردو مرثیہ میں جدید رجحانات اُجاگر کرنے والے ایک منفرد شاعر کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے۔

اس معروضے کے آغاز میں ہم نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ادب' ادیب اور قاری کے مثلث کو قائم رکھنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ ایسے شعرا کی تخلیقات منظرِ عام پر لائی جائیں جو اپنے افکار عالیات کے ذریعہ معاشرے کو توانا اور تابندہ دیکھنے کے متمنی تھے۔ ہمارے لیے یہ امر انتہائی امتنان کا باعث ہے کہ سیف زلفی کی مجموعی شاعری اور خصوصاً ان کے مرثیوں میں معاشرتی اصلاح اور عظمتِ انسانی کے مثبت رویے موجزن ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سیف زلفی کی تمام غیر مطبوعہ تخلیقات منظرِ عام پر لائی جائیں اور خصوصیت کے ساتھ ان کے مرثیوں کی اشاعت کا جلد از جلد اہتمام کیا جائے تا کہ ہم سیف زلفی کی قدر و منزلت کا بار دگر تعین کر سکیں۔ اگر سیف زلفی کے اہل خانہ اور خصوصاً رضا انتخاب نے اس سلسلے میں سنجیدگی سے کام نہ کیا تو اردو مرثیہ ایک بڑی اور توانا آواز سے محروم رہ جائے گا......!!!

⌘⌘⌘

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

یوں تو ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے ادب کی کئی جہات میں کام کیا ہے مگر ان کا محبوب موضوع مرثیہ ہے اور پھر اسی حوالے سے مرثیہ نگار بھی۔ مرثیے سے ان کا یہ لگاؤ صرف ادب کی حد تک نہیں ہے بلکہ اس میں دنیا بھر کے موضوع شامل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ ضروری تو نہیں ہے کہ مرثیے میں صرف مصائب ہی بیان کیے جائیں، مرثیے کی یہ توجیہ انسان کی پوری زندگی کا احاطہ بھی کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے مرثیے کے سلسلے کے بہت سے موضوعات پر بحث کی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی یہ کتاب جدید اور کلاسیکی مرثیے پر ایک جامع کتاب ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد آپ اگر چاہیں تو کسی بھی موضوع کا مطالعہ اپنے ذوق کے مطابق تفصیلی طور پر کر سکتے ہیں چنانچہ یہ کتاب مرثیے کا ایک تعارف بھی ہے، مرثیے پر تنقید بھی ہے اور ان امکانات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جو مستقبل قریب میں رونما ہونے والے ہیں۔

شہزاد احمد

۳۱/۱۲/۰۲